اے حمید

کمانڈو ایکشن

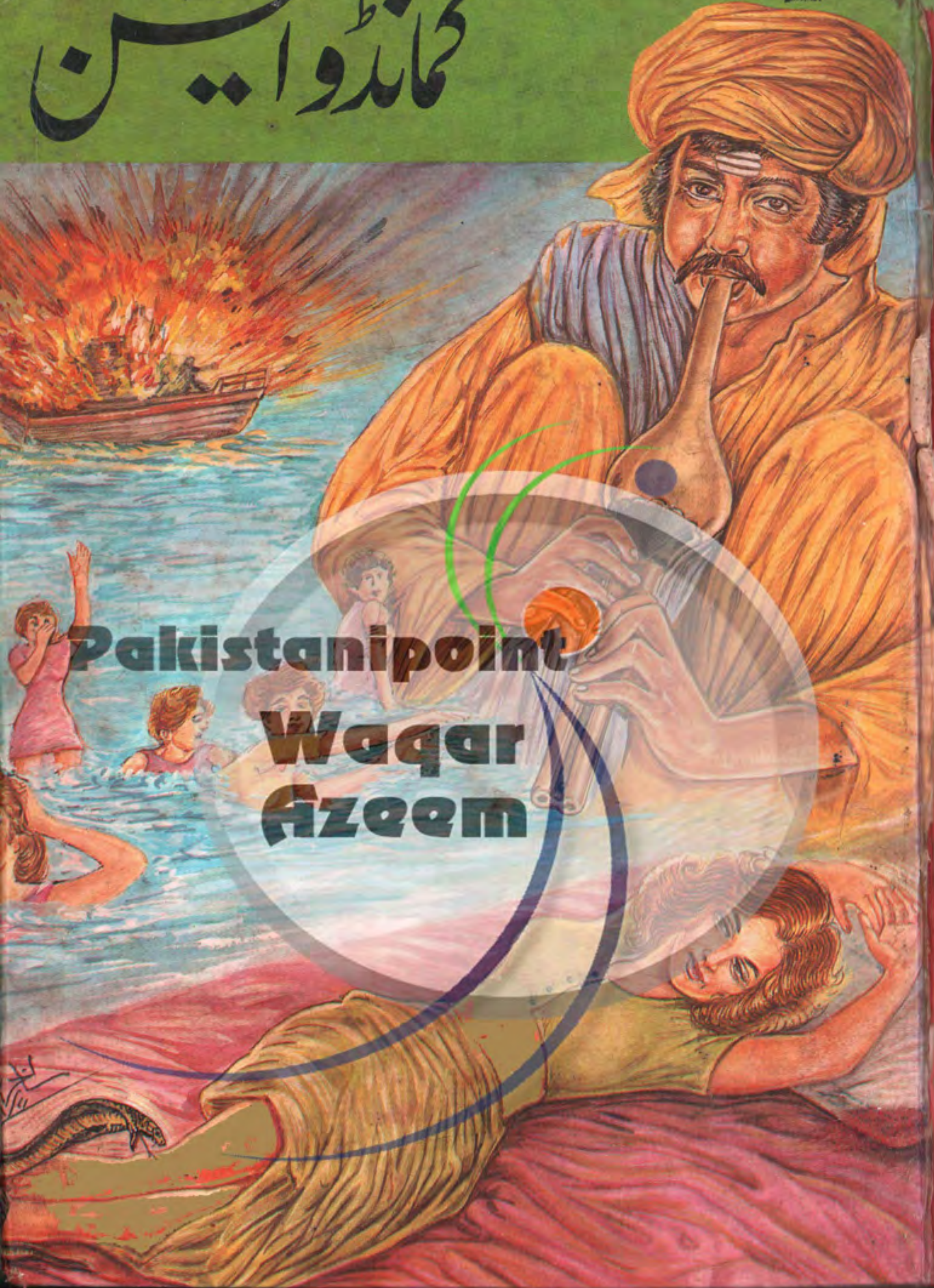

بھارت میں ایک محب وطن پاکستانی کی لرزہ خیز اور سنسنی خیز داستان

کمانڈو ایکشن

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اے حمید

مکتبہ القریش ○ سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر	عبدالحفیظ قریشی
باہتمام	محمد علی قریشی
مطبع	نیراسد پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ	خرم آرٹس لاہور
سن اشاعت	1997
تعداد	1100
قیمت	[redacted] روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
ستاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

پولیس کی گاڑی میں پہلے سے تین کانسٹیبل بیٹھے تھے۔
ہمیں آتا دیکھ کر وہ گاڑی سے باہر نکل آئے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ مجھے اور کشمیری مجاہد کو گاڑی میں دھکے دے کر بٹھا دیا گیا۔ ساتھ کانسٹیبل اور دوسرے پولیس آفیسر بیٹھ گئے اور پولیس کی وین امرتسر کے کسی تھانے کی طرف چل پڑی۔ میں نے ایک بار پھر ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے میں شیو سینا کا کارکن اور بال ٹھاکرے جی کا خاص آدمی ہوں۔ مجھے گرفتار کر کے آپ کو پچھتانا پڑے گا۔"
سکھ تھانیدار نے مجھ سے سخت لہجے میں پوچھا۔
"تم رات کے وقت اس کشمیری اگروادی کے پاس کیا کرنے آئے تھے؟ یہ تو پاکستان کا جاسوس ہے۔ اس کے مکان سے ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی برآمد ہو گیا ہے اور ہمارے پاس اس کے پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کے دوسرے ثبوت بھی موجود ہیں۔"
میں نے کہا۔ "بال ٹھاکرے جی کی طرف سے دیئے گئے ایک خفیہ مشن پر یہاں آیا تھا جو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ ٹیلی فون پر ٹھاکرے جی سے آپ خود بات کر کے معلوم کر سکتے ہیں۔"
سکھ تھانیدار نے طنز کے ساتھ کہا۔
"ٹھاکرے جی کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے کس آدمی کو کس مشن

پر یہاں بھیجا تھا۔"

ہمیں امرتسر کی کوتوالی کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اپنا کشمیری مجاہد چپ تھا۔ جب پولیس کانسٹیبل ہمیں حوالات میں ڈال کر چلے گئے تو اس نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے بڑی حماقت کی۔ خفیہ پولیس تمہارے پیچھے لگی ہوئی تھی اور تمہیں پتہ ہی نہ چلا۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں صبح بمبئی بال ٹھاکرے سے فون پر بات کروں گا۔ وہ ان پولیس والوں کی کھنچائی بھی کریں گے اور مجھے یہاں سے نکلوا بھی دیں گے۔"
کشمیری مجاہد نے کہا۔

"تمہیں تو شاید یہ چھوڑ دیں گے لیکن مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میں آزادی کشمیر کا مجاہد ہوں۔ کشمیر کی آزادی اور اسلام کی حرمت کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاؤں گا لیکن پولیس کے آگے زبان نہیں کھولوں گا۔ میں تم سے بھی یہی چاہوں گا کہ اپنی زبان مت کھولنا۔"

میں نے کہا۔ "تم گھبراؤ نہیں دوست! میں تمہیں بھی اپنے ساتھ ہی یہاں سے نکلواؤں گا۔"

اتنے میں ان چار پولیس آفیسرز میں سے جنہوں نے ہمیں پکڑا تھا دو پولیس آفیسر آئے اور مجھے حوالات سے نکال کر ایک کمرے میں لے گئے جو بڑا دفتر تھا۔
میں نے کہا۔

"سر! مجھے اجازت دیں کہ میں بال ٹھاکرے جی سے فون پر بات کر سکوں۔"

انہوں نے مجھے سٹول پر بٹھا دیا اور خود کرسیاں کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔

"میرا تعلق بھارت کی سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس سے ہے۔ T / L _ 211 میرا کوڈ نمبر ہے۔ آپ بے شک سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف مسٹر سریندر لوہالی کو فون کر کے خود معلوم کر لیں۔ میرے پاس ان کا خفیہ ٹیلی فون نمبر ہے۔"

لگتا تھا کہ ان لوگوں کو میرے خلاف اور میرے پاکستانی جاسوس ہونے کا کوئی پکا ثبوت مل گیا ہے جس کی وجہ سے ان پر میری کسی بات کا اور سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس کے طلسماتی نمبر کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ اگر انہوں نے میرے کپڑے اتروا کر میرے جسم کا معائنہ کیا تو انہیں فوراً پتہ چل جائے گا کہ میں مسلمان ہوں جبکہ ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف سے لے کر بال ٹھاکرے تک سب کو یہی معلوم تھا کہ میں ہندو ہوں اور دھرم چند میرا نام ہے۔ اس انکشاف کے بعد میری ساری بساط ہی الٹ جاتی تھی۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ میرے مسلمان ثابت ہو جانے کے بعد میری رپورٹ ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف اور بال ٹھاکرے تک نہ پہنچتی۔ امرتسر پولیس نے تو فوراً ان لوگوں کو میری اصل حقیقت سے آگاہ کر دینا تھا اور میرے مسلمان ہونے کی خبر ان لوگوں پر بم بن کر گرتی۔ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے بعد میرا کیا حشر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں اپنے آپ کو جسمانی معائنے سے ہر حالت میں بچانا چاہتا تھا۔ جب میں نے سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف مسٹر سریندر کا نام لیا تو میں نے محسوس کیا کہ دونوں پولیس افسروں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ میرے پاس خفیہ طلسماتی نمبر بھی دیکھ چکے تھے۔ جن کو دیکھ کر بھارت کے سیکرٹ سے سیکرٹ اداروں کے دروازے بھی مجھ پر کھل جاتے تھے۔ میں نے ان پر اپنی باتوں کا اثر پڑتے دیکھ کر زیادہ اعتماد سے بولنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا۔

"اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں بال ٹھاکرے جی اور بھارت کی سنٹرل

ڈیفنس انٹیلی جینس ایجنسی کی طرف سے کس مشن پر آیا ہوا تھا۔ میں ان پاکستانی جاسوسوں کی سراغ رسانی کے مشن پر تھا جو اکھنور کی چھاؤنی کی تباہی کے ذمے دار ہیں اور ایک اطلاع کے مطابق وہ امرتسر میں روپوش تھے۔ مجھے اس کشمیری مسلمان پر بھی شبہ تھا جس کے گھر سے آپ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا ہے۔ لیکن اس کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس شخص کو پاکستانی جاسوسوں کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے۔"

سکھ تھانیدار نے پوچھا۔

"تو پھر اس کے گھر میں وائرلیس سیٹ کس لیے رکھا ہوا تھا؟"

"جہاں تک میں نے اس کشمیر مسلمان کو کریدا ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ وائرلیس سیٹ کچھ مدت پہلے کشمیری مجاہد اس کے گھر رکھ گئے تھے جو یہاں آ کر ایک دوسرے سے بات کر لیتے تھے لیکن اس کشمیری مسلمان نے کشمیری حریت پسندوں سے اپنا ناطہ توڑ لیا تھا اور وہ امرتسر میں بھارتی شہری کی طرح امن چین کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔"

اصل میں ' میں اپنے کشمیری مجاہد کو بھی بچانا چاہتا تھا۔ ہندو پولیس افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے پاس پوری رپورٹیں اور ثبوت موجود ہیں کہ اس کا تعلق کشمیری حریت پسندوں اور پاکستان کی انٹیلی جینس سے ہے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے اس کے متعلق آپ اپنی قانونی کارروائی پوری کرتے رہیں لیکن مجھے اجازت دیں کہ میں بمبئی بال ٹھاکرے جی سے یا دلی ڈیفنس انٹیلی جینس چیف سے بات کر سکوں۔"

دونوں پولیس افسروں نے دوبارہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سکھ تھانیدار بولا۔

"ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہم ضابطے کی کارروائی پوری کریں گے۔ تم پاکستانی جاسوس کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔"

میں نے سوچا کہ انہیں ذرا دبکا مارنا چاہیے۔ انہیں دھمکانا چاہیے ورنہ ایسا نہ ہو کہ الٹا مجھ پر کوئی بھیانک مصیبت نازل ہو جائے۔ دبکا مارنے سے میرا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"آپ سوچ لیں بے شک مجھے فون نہ کرنے دیں لیکن بال ٹھاکرے اور مسٹر سریندر کوہلی کو یہ پتہ چلا کہ میں نے آپ کے آگے ان کے نام بھی لیے تھے اور سنٹرل گورنمنٹ کا انتہائی اہم خفیہ نمبر بھی بتایا تھا اور آپ لوگوں نے پھر بھی مجھے حوالات میں بند کر دیا تو یقین کریں ایک سیکنڈ میں آپ کی وردی اتار دی جائے گی۔"

یہ دھمکی کام کر گئی۔ وردی اترنے کا نام سن کر ان کے چہرے نرم پڑ گئے۔ سکھ تھانیدار نے کہا۔

"مجھے نمبر بتاؤ میں خود فون کرتا ہوں۔"

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ میں ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنستا پھنستا بچ گیا تھا۔ میں نے اسے ڈیفنس انٹیلی جینس چیف سریندر کوہلی کا خاص نمبر لکھ کر دیا اور کہا۔

"اس نمبر پر چوبیس گھنٹے ان سے بات ہو سکتی ہے۔ خواہ وہ بھارت میں ہوں خواہ بھارت سے باہر کسی دوسرے ملک میں ہوں۔"

سکھ تھانیدار کو بھی صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ ڈیفنس انٹیلی جینس چیف کا نام بڑا اہم تھا۔ یہ سکھ پولیس افسر اپنی پوزیشن بھی صاف کرنا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے اس نے نمبر ملا دیا۔ دوسری طرف سے ایک سیکنڈ بعد ہی کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ میں سکھ تھانیدار کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ مجھے اس کے چہرے کو پڑھ کر معلوم کرنا تھا کہ دوسری طرف سے اسے کیا کہا جا رہا ہے۔

تھانیدار نے ہیلو کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔

"یس سر! یس سر! میں گوربچن سنگھ ایس ایچ او امرتسر سٹی کوتوالی بول رہا ہوں۔ سر ہمارے پاس دھرم چند نام کا ایک شخص یس سر' یس سر اس کے پاس سیکرٹ ایجنسی کا نمبر ہے سر۔ جی ہاں سر یہ نمبر میں نے دیکھا ہے سر۔ جی' جی سر۔"

سکھ تھانیدار کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ چہرے پر مردنی چھانے لگی تھی۔ صرف لگ رہا تھا کہ دوسری طرف سے اسے سخت ڈانٹ پلائی جا رہی تھی۔

"یس سر! یس سر! سوری سر!۔"

سکھ تھانیدار نے ریسیور رکھ دیا اور دو تین سیکنڈ تک سر نیچا کیے خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے ساتھ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

"کیا بات ہوئی؟"

سکھ تھانیدار نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے میری طرف دیکھا اور بڑے نرم لہجے اور کسی حد تک خوشامدی لہجے میں بولا۔

"سر! ہم پولیس والوں کی بھی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ہمیں اپنی ڈیوٹی بھی نبھانی پڑتی ہے۔ غلطی ہم سے بھی ہو سکتی ہے۔ آئی ایم سوری سر! آپ کو جہاں جانا ہے ہماری گاڑی آپ کو وہاں چھوڑ آئے گی۔ میں خود آپ کو وہاں چھوڑ آتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اس کشمیری مسلمان کو بھی چھوڑ دو۔ وہ بھارت کا پر امن شہری ہے اور اس کا کشمیری حریت پسندوں سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔"

سکھ تھانیدار نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! اس کے معاملے میں ہمیں ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کی اجازت دے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس پر کسی قسم کا ٹارچر نہیں ہوگا۔ ہم

ل تک چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس کے بارے میں پوری تحقیق کر چکا ہوں وہ کشمیری حریت پسندوں کو اب بالکل پسند نہیں کرتا بلکہ آپ کو چاہیے کہ اس کو اپنے ساتھ ملا لیں وہ آپ کے لیے ایک بہترین مخبر ثابت ہو سکتا ہے۔"

یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ اس طرح ہمارے کشمیری مجاہد کو پولیس کا اعتماد بھی حاصل ہو جائے گا اور وہ پولیس کے اندر گھس کر بعض قیمتی خفیہ راز معلوم کر کے کشمیر کے حریت پرستوں کو وقت پر خبردار کر سکے گا سکھ تھانیدار نے کہا۔

"آپ نے بڑا اچھا مشورہ دیا ہے سر۔ ہم اس پر ضرور عمل کریں گے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ ہی دونوں پولیس افسر بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب وہ میرے ایک طرح سے مطیع ہو گئے تھے۔ میں نے کہا۔ "مجھے امپیریل ہوٹل تک چھوڑ آئیں۔ میں وہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔ صبح فرنٹیر میل سے بمبئی جا رہا ہوں۔ جہاز میں مجھے سیٹ نہیں مل سکی۔"

دوسرے ہندو تھانیدار نے کہا۔

"مہاراج! آپ حکم کریں ہم ابھی جہاز میں آپ کے لیے سیٹ خالی کروا دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹرین میں ہی جاؤں گا۔ میں نے بال ٹھاکرے جی کو بھی ٹیلی گرام دے دیا ہے کہ میں فرنٹیر میل سے آ رہا ہوں۔"

"جیسے آپ کی مرضی سر!"

وہ میرے آگے پیچھے پھرنے لگے تھے۔ انہوں نے اسی وقت اپنی گاڑی منگوائی اور دونوں تھانیدار مجھے فوراً" امپیریل ہوٹل چھوڑنے گئے۔ واپس جانے لگے تو ہندو تھانیدار نے بڑے انکسار کے ساتھ کہا۔

"سر! اوپر ہماری شکایت نہ کیجئے گا۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا سر
اگر ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو ہمیں شما کر دیجئے گا۔"

سکھ تھانیدار نے بھی کچھ اس طرح کی بات کی۔ میں نے کہا۔ "کوئی بات
نہیں میں آپ لوگوں کی شکایت نہیں کروں گا۔"

انہوں نے ہاتھ باندھ کر مجھے نمستے کہا اور میں ہوٹل کی لابی کی طرف چل
دیا۔ لفٹ میں کھڑے ہو کر اوپر چوتھی منزل کی طرف جا رہا تھا اور دل میں خدا کا
لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے ایک بہت بڑی تباہی سے بچا لیا تھا۔
لیکن میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ کوئی بڑی مصیبت مجھ پر ٹوٹنے
والی ہے۔ یہ ایک طرح کے خفیہ سگنل تھے جو میرے اندر کسی کسی وقت مجھے
موصول ہوتے تھے۔ اس کے نتیجے میں میں نے آنے والی کسی بڑی مصیبت کے
مقابلے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہوا تھا۔ ویسے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ
ایک محب وطن کمانڈو اپنے ملک کی سلامتی کے مشن پر دشمن ملک میں سرگرمیوں
میں مصروف ہوتا ہے تو وہ محفوظ نہیں ہوتا۔ کسی بھی وقت وہ کسی ناگہانی مصیبت
میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں پوری طرح سے ہوشیار تھا۔ دوسرے روز
صبح میں فرنٹیئر میل میں بیٹھ کر بمبئی کی طرف روانہ ہوگیا۔

ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف نے میری امرتسر والی واردات کی خبر بال
ٹھاکرے کو پہنچا دی تھی۔ ٹھاکرے نے میرے دشمن بالا جی راؤ کو یہ بات بتائی تو
اس کو میرے خلاف بال ٹھاکرے کے کان بھرنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ اس
نے پہلے ہی سے بال ٹھاکرے کو میرے خلاف کر رکھا تھا۔ میں اس سے ملاقات

اسے بمبئی پہنچتے ہی اس کی کوٹھی پر گیا تو وہ مجھ پر برس پڑا۔
"دھرم چند! تم کشمیری مسلمان کے گھر کیا کرنے گئے تھے؟ امرتسر پولیس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ پاکستان کا جاسوس ہے۔"
میں نے بڑے تحمل اور اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔
"پیشوا جی! میں اپنی ڈیوٹی پوری کرنے اور اپنا فرض نبھانے کے لیے اس مسلمان کے گھر گیا تھا۔ مجھے میرے مخبر نے بتایا تھا کہ اگرچہ یہ کشمیری مسلمان اب بھارت کے خلاف کشمیریوں کے لیے جاسوسی نہیں کرتا لیکن اس کے پاس کشمیری حریت پسند آتے جاتے رہتے ہیں۔ مہاراج! اگر ایسی بات نہ ہوتی تو مجھے وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔"
بالا جی راؤ نے جلتی پر تیل ڈالتے ہوئے کہا۔
"اگر امرتسر کا یہ کشمیر مسلمان جاسوس نہیں تھا تو اس کے گھر سے خفیہ ریڈیو ٹرانسمیٹر کیسے برآمد ہوا؟"
بال ٹھاکرے میری طرف گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔
"بالا جی! یہ ٹرانسمیٹر اس کے پاس بہت دیر پہلے کا پڑا ہوا تھا جب وہ بھارت کے خلاف جاسوسی کی کارروائیوں میں مصروف ہوا کرتا تھا۔"
بال ٹھاکرے نے اس کشمیری مسلمان مجاہد کو مراٹھی زبان میں بڑی واہیات گالی دیتے ہوئے کہا۔
"وہ اب بھی پاکستان کا جاسوس ہے۔ تم کو اس نے بے وقوف بنایا اور تم بن گئے۔ میں نے امرتسر سٹی پولیس کمشنر کو کہہ دیا ہے کہ وہ کشمیری مسلمان کو ہرگز نہ چھوڑیں اور اس سے دوسرے جاسوسوں کے بارے میں پوری پوچھ گچھ کریں۔"
میں نے دل میں اپنے کشمیری مجاہد کے لیے دعا کی۔ کیونکہ اب اسے خدا ہی ان بھارتی درندوں سے بچا سکتا تھا۔ بال ٹھاکرے نے میری تھوڑی بہت مزید

سرزنش کی اور کہا۔

"تمہیں کل ہی بمبئی سے تامل ناڈو کے لیے روانہ ہونا ہوگا۔ جہاں ساؤتھ میں منڈاپم کیمپ کے مقام پر تامل ٹائیگرز کے گوریلوں کو چھاپہ مار جنگ کی عملی تربیت دی جا رہی ہے۔ ان تامل گوریلوں کو ہم پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کے لیے بھیج رہے ہیں۔ تامل ٹائیگرز کا شمار اس وقت دنیا کے خطرناک گوریلوں میں ہوتا ہے۔ تم اس تربیتی بیس کیمپ میں ان تامل ٹائیگرز کو پاکستان کی مختلف زبانوں اور کلچر کے بارے میں معلومات فراہم کرو گے۔ تم انہیں اردو اور سندھی زبانیں تھوڑی تھوڑی سکھاؤ گے۔ تم سمجھ گئے ہو نا۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ بال ٹھاکرے پاکستان کے خلاف ایک نیا حملہ شروع کرنے والا ہے۔ تامل ٹائیگرز بھارت کے صوبہ تامل ناڈو کے لوگ تھے۔ بھارتی سرکار انہیں چھاپہ مار جنگ کی ٹریننگ دے کر سری لنکا میں شورش اور بدامنی پھیلانے کے لیے بھیجتی تھی۔ بال ٹھاکرے کی تجویز پر بھارتی سرکار نے ان تامل ٹائیگرز گوریلوں کو پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تامل ٹائیگرز کی تحریک بھارت نے سری لنکا کی حکومت کے خلاف شروع کروائی تھی اور بھارت ان تامل ٹائیگرز کو سری لنکا سمگل کرتا تھا اور ان کی پوری فوجی امداد بھی کرتا تھا۔ بال ٹھاکرے نے پاکستان کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کے لیے ایک اور خطرناک چال چلی تھی۔ میرا کام اس دشمن پاکستان کی اس چال کو بھی ناکام بنانا تھا۔ چنانچہ میں تامل ناڈو جانے کے لیے خوشی سے تیار ہوگیا میں نے کہا۔

"جو حکم مہاراج! آپ ہمارے پیشوا جی ہیں۔ ہماری شیوسینا کے سیناپتی ہیں۔ ہم آپ کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو بھی تیار ہیں۔"

اپنی تعریف سن کر بال ٹھاکرے نے مسرت کا اظہار کیا اور بالا جی سے کہا۔

"بالا جی! تم منڈاپم کیمپ کے ٹریننگ سنٹر تک دھرم چند کے ساتھ جاؤ گے اور وہاں گوریلا انسٹرکٹر بھلگو سے اس کا تعارف کراؤ گے۔ باقی ساری باتیں

"ہم نے حال انسپکٹر مہلنگو کو فون پر بتا دی ہیں۔"

"جو حکم مہاراج"۔ بالا جی نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

بال کمار نے ہمیں اپنا آشیرباد دیا اور کہا۔

"ٹھیک ہے تم کل بمبئی سے منڈاپم کیمپ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔"

ہم نے دوسرے دن مدراس میل پکڑی اور چل پڑے۔

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

بالاجی راؤ اندر سے میرے خلاف تھا مگر اوپر سے میرے ساتھ اس کا سلوک بڑا دوستانہ تھا۔ میں نے بھی اس پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں اس کی نیت سے واقف ہوں۔ جن لوگوں نے بھارت کے صوبہ تامل ناڈو کی جانب سفر کیا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ یہ صوبہ بھارت کے جنوب میں واقع ہے جہاں بھارت کے دونوں طرف کے ساحل تکون کی شکل میں آپس میں مل جاتے ہیں۔ اس کے دونوں جانب سمندر ہے۔ نیچے بھی سمندر ہے جس کے آگے پچیس تیس میل کے فاصلے پر سری لنکا کا ملک ہے۔ منڈاپم کیمپ بالکل جنوب میں واقع ہے۔ یہ اس زمانے میں ایک چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ یہاں سے سمندر کا ریتلا ساحل شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن ناریل اور تاڑ کے درخت اور کہیں کہیں پٹ سن اور دھان کے کھیت بھی نظر آ جاتے ہیں۔ بمبئی سے اس کا فاصلہ بڑا لمبا ہے۔ ہم ٹرین میں ایک دن' ایک رات اور پھر دوسرا سارا دن سفر کرنے کے بعد کندرا پلی پہنچے جو ایک جنکشن تھا۔ یہاں سے ہم نے دوسری ٹرین پکڑی اور شام کے وقت منڈاپم کیمپ پہنچ گئے۔ تامل گوریلا انسٹرکٹر بھلگو جس کا پورا نام بھلگو داسم تھا اپنے تین تامل گوریلوں کے ساتھ سٹیشن پر ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ تینوں تامل بے حد کالے رنگ کے ناٹے قد کے تھے مگر جسم بڑے مضبوط تھے۔ آنکھوں کا رنگ گلابی تھی وہ عام سی پتلون بش شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ مرہٹہ بالاجی راؤ کا رنگ بھی گہرا سانولا تھا۔ میں اپنے گورے رنگ کی وجہ سے ان میں انگریز لگتا تھا۔

بھلگو داس ہمیں اپنی کھٹارا جیپ میں بٹھا کر سٹیشن سے پندرہ کلومیٹر دور

ناریل اور تاڑ کے درختوں کے ایک ذخیرے میں لے گیا جہاں کھپریل کی ڈھلوان چھت والی ایک لمبی بارک بنی ہوئی تھی۔ پیچھے تربیتی میدان تھا جہاں ریت کے مصنوعی تودے، گڑھے اور اونچے اونچے بانس کے دروازے بنے ہوئے تھے۔ ان دروازوں کے ساتھ رسے لٹک رہے تھے۔ یہاں گوریلوں کو رسے کے ذریعے عمارتوں پر چڑھنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ ایک طرف پتھروں کی دیوار پر چاند ماری کے نشان بنے ہوئے تھے۔ یہاں گوریلوں کو نشانہ بازی کی مشق کرائی جاتی تھی۔ بھلکو تامل گوریلے نے ہمیں یہ سب کچھ دکھایا اور انگریزی میں کہا۔

"اس وقت ہمارے پاس دس گوریلے ٹریننگ لے رہے ہیں۔"

وہ ہمارے ساتھ باتیں کرتا ہوا ہمیں بارک میں لے گیا جہاں ایک جانب زیر تربیت تامل گوریلے بانس کی چارپائیوں پر بیٹھے دال چاول کھا رہے تھے۔ بھلکو نے ان سے ہمارا تعارف کرایا۔ پھر ہم بارک کے آخری کونے میں آ گئے جہاں میز کی دونوں جانب لکڑی کے بنچ پڑے تھے۔ ہم نے دال چاول کھائے۔ اس دوران تامل انسٹرکٹر بھلکو مجھ سے پاکستان کے شہروں خاص طور پر لاہور کراچی اور راولپنڈی کے بارے میں پوچھتا رہا۔ ان کی مادری زبان تامل تھی۔ تامل زبان بالا جی راؤ بھی نہیں سمجھتا تھا اور میں بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ہم ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بات کرنے کی بجائے انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ بھلکو واسم بڑی روانی سے انگریزی بول لیتا تھا۔ بھارت کے جنوب میں انگریزی زبان عام لوگ بھی بڑی آسانی سے بول لیتے ہیں۔ وہاں انگریزی تعلیم کا معیار بہت اونچا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی بھارت کے جنوبی صوبوں میں آ چکا تھا۔ کرناٹک، کیرالہ، تامل ناڈو اور آندھرا پردیش کے عام محنت کش مزدور بھی انگریزی بولتے اور سمجھ لیتے تھے۔

ہمارے لیے بارک کے سامنے والے جھونپڑے میں چارپائیوں پر بستر لگا دیے گئے تھے۔ وہاں رات کو بڑا حبس تھا۔ اس سارے علاقے میں حبس بہت

ہوتا ہے۔ خاص طور پر برسات کے دنوں میں تو ہر وقت جسم سے پسینہ بہتا رہتا ہے۔ بارش کے بعد جب یہاں دھوپ نکلتی ہے تو پھر شمال کے رہنے والوں کا حبس کے مارے دم گھٹنے لگتا ہے۔ سمندر کی طرف سے جو ہوا چلتی رہتی ہے اس میں بھی نمی ہوتی ہے جس سے حبس میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن میں تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ اگرچہ مجھے پوری تربیت نہیں مل سکی تھی پھر بھی جتنی ٹریننگ ملی تھی اس نے مجھے کافی سخت جان بنا دیا تھا اور میں سردی گرمی حبس سب کچھ آسانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ جھونپڑی میں ایک پیڈسٹل پنکھا ہمارے لیے رکھ دیا گیا تھا جس کی ہوا غنیمت تھی۔

اگلے روز بالاجی راؤ واپس بمبئی چلا گیا۔

وہ کل دس تامل ٹائیگرز گوریلے تھے۔ دن کے وقت چار گھنٹے اور رات کے وقت دو گھنٹے اندھیرے میں انہیں مختلف قسم کی گوریلا ٹریننگ دی جاتی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ واقعی بڑے چاق و چوبند اور سخت جان گوریلے ہیں۔ ان کے نشانے بے حد صحیح تھے۔ اندھیرے میں بھی ان کی گولی ٹھیک ٹارگٹ پر جا کر لگتی تھی۔ دوپہر کے بعد دو گھنٹے میں انہیں اردو اور سندھی زبانوں کی ابتدائی قسم کی تعلیم دیتا۔ پاکستان کے شہروں کے بارے میں میں کوئی جگہ بھی صحیح نہیں بتاتا تھا۔ بلکہ میری کوشش یہی ہوتی کہ میں انہیں گمراہ کروں۔ میں نے گوریلا انسٹرکٹر کو بھی یہی مشورہ دیا کہ ان لوگوں کے لیے پنجابی' اردو اور سندھی زبان میں تھوڑی بہت شدھ بدھ حاصل کرنا بڑا ضروری ہے۔ جب ان زبانوں کو تھوڑا بہت سمجھنے لگ جائیں گے تو آخر میں میں انہیں پاکستان کے شہروں کے وہ اہم مقامات بتاؤں گا جہاں انہیں اپنی اپنی کارروائیاں کرنی ہوں گی۔ میرا اصل مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ پاکستان کے شہروں کے بارے میں جس قدر بے خبر رہ سکتے ہیں بے خبر رہیں۔ اس دوران میں نے ان دس کے دس تامل گوریلوں کو ٹھکانے لگانے کی کوئی ایسی ترکیب سوچنی شروع کر دی جس سے مجھ پر ذرا سا بھی

شک نہ پڑے۔ یہ بڑے تربیت یافتہ گوریلے تھے۔ ان کو اجتماعی طور پر ہلاک کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا اگر میں ان کی کشتی یا چھوٹے سٹیمر کو ڈبونے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو یہ لوگ بڑی آسانی سے سمندر میں تیر کر کنارے پر آ جائیں گے۔ آگ لگنے کی صورت میں بھی ان سب کا ایک ساتھ جل کر مر جانا بھی مشکوک تھا۔ صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی سٹیمر میں سوار ہوں۔ ایک جگہ جمع ہوں اور وہاں طاقتور دھماکہ کیا جائے جس سے ان سب کے پرخچے اڑ جائیں۔ اس کے لیے مجھے باقاعدہ بڑا سوچ سمجھ کر منصوبہ بنانے کی ضرورت تھی۔ میرے پاس وقت موجود تھا۔ کیونکہ ہلگو گوریلا انسٹرکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ ان لوگوں کی ٹریننگ تقریباً" ایک ماہ میں ختم ہوگی۔ اس کے بعد میں اردو' پنجابی زبانیں سکھانے میں بھی کچھ دیر لگا سکتا تھا۔

وہاں چھوٹے بڑے ہتھیاروں کا اسلحہ موجود تھا۔ اگرچہ گولہ بارود نہیں تھا۔ مشین گن' سٹین گن اور برین گنوں کی گولیوں کا کافی سٹاک تھا۔ مجھے ان گولیوں میں سے بارود نکال کر کوئی طاقتور بم تیار کرنا تھا جس کا دھماکہ کسی سٹیمر میں کیا جانا تھا۔ سمندر قریب ہی تھا اور ان لوگوں کو سمندر میں بھی ٹریننگ دی جاتی تھی۔

میری حیثیت بھی وہاں ایک انسٹرکٹر کی تھی۔ ویسے بھی ان لوگوں کو معلوم تھا کہ میں شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کا خاص آدمی ہوں اور یہ مشن بال ٹھاکرے کے مشورے پر ہی تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ کیمپ میں میرے آنے جانے پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ حالانکہ وہاں باہر کا کوئی آدمی کیمپ کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ دن اور رات کے وقت بھی کیمپ کی خاردار دیوار کے چاروں جانب گارڈ کمانڈو پہرہ دیتے تھے اور پٹرولنگ پارٹی بھی گشت پر ہوتی تھی۔ میرا جھونپڑا الگ تھا۔ وہاں میں رات کو سوتا تھا اور دن کے وقت بھی جب گوریلا تامل اپنی ٹریننگ میں مصروف ہوتے تھے میں جھونپڑے میں

چارپائی پر لیٹا کوئی رسالہ یا کتاب پڑھتا رہتا تھا۔ میگزین کا سٹاک بارک کی ایک کوٹھڑی میں تھا۔ مجھے وہاں سے گولیوں کے تین چار پٹے نکال کر لانے تھے۔ ایک روز میں نے بھلگو تامل گوریلے سے کہا کہ ہمارے پاس میگزین کا سٹاک کم پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ آپ لوگ ٹریننگ کے دوران بے تحاشا اسلحہ استعمال کرتے ہیں۔ بھلگو انسٹرکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہمیں فوج کی طرف سے ایمونیشن سپلائی ہوتا ہے۔ ہمیں اجازت ہے کہ جتنا چاہیں اسلحہ استعمال کریں۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی میرے دوست! ہماری ملٹری ہائی کمانڈ اس بارے میں بڑی محتاط ہے اور مجھے یہ بھی ہدایت دے کر بھیجا گیا ہے کہ میں ایمونیشن کا حساب رکھوں کہ روزانہ ہم کتنا میگزین خرچ کرتے ہیں۔

بھلگو انسٹرکٹر سنجیدہ ہو گیا کہنے لگا۔

"اگر یہ بات ہے تو تم بے شک اس کا حساب رکھ سکتے ہو۔"

میں نے اصل بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس وقت میگزین کا جو اسٹاک ہمارے پاس موجود ہے اسے ایک نظر چیک کر لوں۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں' بالکل نہیں نو پرابلم۔"

بھلگو نے مجھے جیب سے چابی نکال کر دی اور کہا۔

"تم ابھی جا کر چیک کر سکتے ہو۔ نو پرابلم۔"

"میں یہی چاہتا تھا میں اٹھ کر بارک کے کونے والی اس کوٹھڑی کی جانب چل دیا جس میں مشین گنوں وغیرہ کے میگزین کا سٹاک رکھا ہوا تھا۔ چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کے کریٹ لگے ہوئے تھے جن میں مشین گنوں اور دوسری گنوں کا اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ بھی میگزین کے پٹے لٹک رہے تھے۔ کوٹھڑی میں ایک روشندان تھا جس میں سے دن کی روشنی اندر

آ رہی تھی۔ عقبی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو بند تھی۔ یہی کھڑکی میرے کام آ سکتی تھی۔ اگر کھڑکی نہ ہوتی تو مجھے بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی۔ کھڑکی نے میرے راستے کو آسان بنا دیا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس گیا یہ لوہے کے پٹ والی کھڑکی تھی جو بند تھی۔ اس کے اوپر چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جاتے ہی آہستہ سے چٹخنی کو نیچے کر دیا۔ کھڑکی کو ذرا سا اندر کی طرف کھینچا کھڑکی کھل چکی تھی۔ میں نے اسے پہلے کی طرح بند کر دیا۔

دو تین منٹ کوٹھڑی میں رکنے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ کوٹھڑی کو تالا لگایا اور واپس آ کر ہنگو انسٹرکٹر کو چابی دی اور کہا۔

"مائی فرینڈ! اندر تو کافی سٹاک موجود ہے۔ تم بے شک ٹریننگ کے دوران جتنا چاہے میگزین استعمال کرو۔ ہم چاہتے ہیں کہ تامل گوریلوں کو پوری پوری ٹریننگ دی جائے تاکہ دشمن ملک میں جا کر جب یہ رات کے وقت بھی واردات کریں تو ان کی گولیاں ٹھیک نشانے پر جا کر لگیں۔"

گوریلا انسٹرکٹر ہنگو سگریٹ سلگاتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ "یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہو۔ پاکستان کوئی بزدل لوگوں کا ملک نہیں ہے۔ ہمارے ملک کی طرح وہاں دال بھات کھانے والے بزدل ہندو نہیں رہتے۔ وہاں کا تو بچہ بچہ فوجی ہے اور ہر دوسرے آدمی کے پاس پستول اور کلاشنکوف ہوتی ہے۔ ہم اخباروں میں وہاں کی خبریں پڑھتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے گوریلوں کو پوری طرح سے تیار کر کے وہاں بھیجنا ہو گا۔"

میں نے فوراً" انگریزی میں کہا۔

"بہت خوب' ہنگو برادر! ہمیں اس وقت تم ایسے گوریلا انسٹرکٹرز کی ضرورت ہے۔ شاباش!"

ہنگو انسٹرکٹر پھول کر کپا ہو گیا۔

دوپہر کے بعد جب میں تامل گوریلوں کو اردو زبان میں بول چال کی ابتدائی

مشق کرا کر فارغ ہوا تو یونہی سگریٹ سلگا کر ٹہلنے کے لیے بارکوں کی طرف چلا گیا۔ تامل گوریلے بارکوں کے پیچھے جو میدان تھا وہاں شام کی ٹریننگ لینے کے لیے چل دیے تھے۔ میں ٹہلتے ٹہلتے میگزین والی کوٹھڑی سے کچھ فاصلے پر ناریل کے ایک درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ ناریل کا یہ تنا زمین سے نکل کر گھوڑے کی پیٹھ کی طرح ایک طرف کو جھک کر اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ ابھی سورج پوری طرح سے غروب نہیں ہوا تھا۔ سمندر کی طرف سے ہوا چل رہی تھی۔ اس ہوا میں میرے سر کے بال ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ میگزین کے ذخیرے والی کوٹھڑی کی پچھلی کھڑکی کو میں دیکھ رہا تھا۔ اس طرف کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ ایک درخت اگا ہوا تھا جو پپیتے کا درخت تھا۔ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں اٹھا اور اپنے جھونپڑے میں واپس چلا گیا۔ باہر سے یہ جھونپڑا تھا مگر اندر سے چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیواریں بانس کی تھیں اور ڈھلوان چھت ناریل کی شاخوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ کیونکہ اس طرف برسات میں بارشیں بہت ہوتی تھیں۔ میونسپل کمیٹی کے کئی ایک دفتر بھی ایسے ہی جھونپڑوں کی طرح کے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر باہر بیٹھا رات کی ٹریننگ کے دوران گوریلوں کو اندھیرے میں گھات لگا کر ٹارگٹ پر فائر کرتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد میں جھونپڑے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ پیڈسٹل فین چل رہا تھا۔ اس علاقے میں یعنی بھارت کے جنوبی علاقوں میں گرمیوں کا موسم ہی ہوتا ہے۔ یہاں سردیوں کے موسم میں بھی موسم گرم مرطوب ہی رہتا ہے۔ میں نے بتی بجھا دی تھی۔ گیارہ بجے رات گوریلوں کی چاند ماری ختم ہوئی اور کچھ دیر کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں نے مزید انتظار کیا۔ جب میری گھڑی پر رات کا پورا ایک بجا تو میں بستر سے اٹھا اور جھونپڑے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ آسمان پر پھیکے پھیکے سے تارے نظر آ رہے تھے بارک پر جہاں تامل گوریلے سو رہے

تھے سناٹا طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ رات کے بارہ بجے والی گاڑی بھی گزر چکی تھی۔ اب صبح تین بجے دمنش کوڑی کی طرف سے ایک گاڑی کو آکر گزرنا تھا۔

رات اندھیری تھی۔ چاند رات کے پچھلے پہر نکلتا تھا۔ میں جھونپڑے کے پیچھے سے ہو کر چلتا ہوا میگزین والی کوٹھری کے عقب میں آکر کھڑکی کے پاس رک گیا۔ کھڑکی کے پٹ کو اندر کو دبایا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ میں کھڑکی میں سے کوٹھری کے اندر چلا گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ مگر مجھے اندازہ تھا کہ میگزین کی بیلٹیں سامنے والی دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی ہیں۔ میں لکڑی کے کریٹوں کو ٹٹول کر چلتا دیوار کے پاس آیا اور مشین گن کے میگزین کی دو بیلٹیں اتار لیں۔ انہیں قدموں پر چلتا واپس کھڑکی میں آیا اور باہر نکل کر کھڑکی کو بند کر دیا۔ اندھیرے میں گھور کر چاروں طرف دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں دم قدم چلتا اپنے جھونپڑے میں آگیا۔ میگزین کی دونوں بیلٹوں کو میں نے چارپائی کے نیچے چھپا دیا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

صبح ناشتے کے وقت میں بارک کے کچن میں گیا۔ گوریلا انسٹرکٹر ھلگو بھی اپنے گوریلا ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ ہم نے مل کر ناشتہ کیا۔ یہ لوگ چائے کی بجائے کافی زیادہ شوق سے پیتے تھے۔ لانگری صرف میرے لیے چائے بناتا تھا۔ کیونکہ کافی مجھے زیادہ پسند نہیں تھی۔ ٹھیک دن کے آٹھ بجے گوریلوں کی ٹریننگ شروع ہوگئی۔ کچھ دیر تک میں سائیٹ پر موجود گوریلوں کو ٹریننگ لیتے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر اپنے جھونپڑے میں آگیا۔

میں نے چارپائی کے نیچے سے میگزین کی ایک بیلٹ نکال کر چارپائی پر رکھ لی اور پلاس کی مدد سے گولیاں بیلٹ میں سے نکالنے لگا۔ یہ کافی گولیاں تھیں۔ گولیاں نکل آئیں تو اب سب سے نازک مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ یعنی ہر گولی کے منہ کے آگے جڑا ہوا نوکیلا سکہ الگ کر کے اندر سیاہ رنگ کے دھماکہ

خیز مواد کو ایک جگہ جمع کرنا تھا۔ یہ کافی دشوار کام تھا اور خطرناک بھی گولی کے سیدھے رخ پیچھے ضرب لگنے سے گولی فائر ہو سکتی تھی۔ مگر میں دھماکہ خیز مواد کے بارے میں کافی تجربہ کار تھا۔ اس کام میں مجھے کافی دیر لگ گئی اور میں صرف چھ سات گولیوں کے سکے الگ کر کے سیاہ بارود جمع کر سکا۔ باقی کام میں نے دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا۔ کیونکہ کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اور باہر سے تامل گوریلوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ وہ ٹریننگ ختم کر کے بارک کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے سارا سامان چارپائی کے نیچے چھپا دیا اور جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔

تامل گوریلوں نے دوسرے سے مجھے ہاتھ ہلا کر سلام کیا۔ ہنگو انسٹرکٹر ان کے آگے آگے تھا۔ اس نے اونچی آواز میں مجھ سے کہا۔

"سر! لنچ پر ضرور آ جانا۔"

میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"فکر نہ کرو میں تم سے پہلے وہاں موجود ہوں گا۔"

اس کے بعد مجھے رات کو ہی وقت مل سکا۔ جب رات کافی گہری ہو گئی اور سارے گوریلے بارک میں سو گئے تو میں نے باقی کی گولیوں سے بھی بارود نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ مجھے تین راتیں صرف کرنی پڑیں تب کہیں جا کر اتنا بارود میرے پاس جمع ہوا جتنے بارود کی مجھے ضرورت تھی۔ مزید دو راتیں لگا کر میں نے اس بارود میں کچھ کیمیکلز ملا کر ان کا لیپ تیار کیا۔ یہ کیمیکلز مجھے منڈاپم کیمپ کے شہر کے بازار سے مل گئے تھے۔ وہ کیمیکلز عام قسم کے تھے۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ یہ کیمیکلز کیا تھا۔ بس آپ سمجھ لیں کہ میں ایک ہفتے کی محنت کے بعد ایک گز لمبی پلاسٹک کی سیاہ رنگ کی ٹیپ تیار کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ بظاہر یہ ایک چپکنے والی اور ڈبوں پر لگانے والی پلاسٹک کی ٹیپ تھی مگر حقیقت میں یہ اس قدر دھماکہ خیز اور تباہی مچانے والا بم تھا کہ اس کے پھٹنے سے پتھر کی چٹان میں گہرا

شگاف پڑ جائے اور لوہے کی چادریں دھماکے کے ساتھ اڑ سکتی ہیں۔
اس کو چلانے کا بھی ایک خاص ٹیکنیکل طریقہ ہے جو میں نہیں بتاؤں گا کیونکہ یہ چیزیں راز میں ہی رکھی جائیں تو بہتر ہوتا ہے۔ اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ پڑھنے سننے والا اس قسم کی چیزیں تیار کرنی نہ شروع کر دے جو خلاف قانون حرکت ہوگی۔ میگزین کی دونوں بیلٹیں گولیوں سے خالی ہوگئی تھیں۔ میں نے ان بیلٹوں کو اور گولیوں کے نوکیلے سکوں کو ایک تھیلے میں ڈالا اور ریلوے سٹیشن کی طرف جاکر ریت کے ٹیلے کے پاس زمین کھود کر اسے دبا دیا۔ اب مجھے تامل گوریلوں کو جنہیں پاکستان میں تباہی مچانے کی ٹریننگ دی جارہی تھی کب موت کی نیند سلانا ہے۔ مجھے منڈا پم کیمپ کے ٹریننگ سینٹر میں آئے بمشکل ایک ہی ہفتہ گزرا تھا۔ میں اتنی جلدی یہ کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس ان لوگوں کو تباہ کرنے کی ہر شے موجود تھی۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ ان تامل گوریلوں کو ہفتے میں ایک دن سمندر پر جاکر ٹریننگ دی جاتی تھی۔ اس ٹریننگ میں سمندر میں زیادہ سے زیادہ لمبا غوطہ لگانا' ڈوبتے ہوئے ساتھیوں کی جان بچانا اور سمندر کے اندر دشمن پر فائر کرنا شامل تھا۔ میں ان تمام چیزوں کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی دن مھلگو سے پوچھا کہ سمندر پر کب چلنا ہوگا۔ اس نے بتایا کہ کل دن نکلنے کے فوراً بعد سمندر کی ٹریننگ کا کورس ہوگا۔

دوسرے دن ہم سب لوگ منہ اندھیرے جیپوں میں بیٹھ کر سمندر کے ساحل پر چلے گئے۔ یہ ساحل ریتلا اور چٹانی تھا۔ ایک طرف چٹانوں کے درمیان سمندر میں پرانا سٹیمر کھڑا تھا۔ یہ سٹیمر نہ زیادہ بڑا تھا نہ چھوٹا تھا۔ اس کے پیندے کا دونوں جانب رنگ اڑ چکا تھا اور جگہ جگہ زنگ لگ رہا تھا۔ اس کے دو عرشے تھے۔ دوسرے عرشے پر تین کیبن تھے۔ یہ سٹیمر گوریلا ٹریننگ کے لیے ہی رکھا گیا تھا۔ سارے گوریلے سٹیمر کے اوپر والے ڈیک پر آ گئے۔ ھلگو انسٹرکٹر کے ہاتھ میں سیٹی تھی۔ اس نے تامل زبان میں انہیں کوئی آرڈر دیا۔ گوریلے ڈیک کے جنگلے کے ساتھ اٹن شن ہو کر کھڑے ہوگئے۔ دوسرے آرڈر پر انہوں نے ایک نعرہ لگایا اور ساکت ہوگئے۔ ھلگو انسٹرکٹر نے سیٹی بجائی سیٹی کی آواز پر سٹیمر کا لنگر اٹھا دیا گیا۔ انجن چلنے لگا۔ سٹیمر چٹانوں میں سے نکل کر کھلے سمندر کی طرف چل پڑا۔ گوریلے اسی طرح ساکت کھڑے تھے۔ ھلگو بھی ہاتھ میں سیٹی لیے اسی طرح ساکت کھڑا تھا۔ ہر گوریلے کے کندھے پر سٹین گن تھی۔ میں ڈیک پر ایک طرف ہو کر کرسی پر بیٹھا تھا۔

جب سٹیمر ساحل سے کافی دور کھلے سمندر میں آ گیا تو ھلگو انسٹرکٹر نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز باریک اور بڑی تیز تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی سٹیمر کا انجن بند ہوگیا اور ایک سی مین نے سمندر میں لنگر گرا دیا۔ سٹیمر کھڑا ہوگیا۔ انسٹرکٹر نے ایک بار پھر سیٹی بجائی اور دس کے دس گوریلوں نے باری باری سمندر میں چھلانگیں لگا دیں۔ یہاں سمندر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا

عفریت سانس لے رہا ہو۔ بھلگو نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ ہم سمندر میں دیکھ رہے تھے تامل گوریلے سمندر میں غائب ہو چکے تھے۔ وہ غوطے لگا گئے تھے۔ انسٹرکٹر اپنی گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ گوریلے کافی دیر سے سمندر کے اندر ہی رہے۔ پھر باری باری سمندر کی سطح پر آئے اور زور زور سے سانس لے کر دائرے کی شکل میں تیرنے لگے۔ بھلگو نے سب کے غوطوں کے ٹائم نوٹ کر لیے تھے۔

اس نے سیٹی بجائی۔ سارے گوریلے تیرتے ہوئے سٹیمر کی طرف آئے اور سٹیمر کے پہلو میں جو لوہے کی زنجیریں لٹک رہی تھیں ان کو پکڑ کر سٹیمر کے ڈیک پر چڑھ آئے۔ وہ ڈیک کے جنگلے کے ساتھ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ بھلگو انسٹرکٹر نے تیز آواز میں چیخ کر انگریزی میں کہا۔

"ایکسر سائیز نمبر ٹو۔ نمبر ون۔ گو۔"

اس حکم کے ساتھ ہی ایک گوریلا سمندر میں کود گیا اور یوں ہاتھ پاؤں مارنے لگا جیسے ڈوب رہا ہو۔ انسٹرکٹر نے چیخ کر کہا۔

"گو۔"

گوریلا نمبر دو نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ سمندر میں گرتے ہی وہ ڈوبتے ہوئے گوریلے کی طرف تیرتا ہوا گیا اور نیچے سے ہو کر اس کی ٹھوڑی کے نیچے اپنا بازو ڈال کر اسے اوپر اٹھا لیا اور تیرتے ہوئے اسے ساتھ تیراتا سٹیمر کی طرف بڑھا۔ اس دوران سمندر کی موجیں اسے سٹیمر سے کچھ دور لے گئی تھیں۔ سٹیمر اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ اسے وہاں سے چلانے کی اجازت نہیں تھی۔ گوریلا اپنے ساتھی کی جان بچانے اور اسے سٹیمر کی طرف لے کر آنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ آخر وہ اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا سٹیمر کے سٹار بورڈ کے پاس لے آیا۔ یہاں آنے کے بعد اس نے لٹکتی ہوئی زنجیر کو پکڑ لیا اور اپنے ساتھی کو اپنے کاندھے پر ڈال کر دونوں ہاتھوں سے زنجیر کو پکڑے دونوں پاؤں سٹیمر کے

سٹار بورڈ سے لگا کر اوپر چڑھنے لگا۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ مگر وہ تامل گوریلا اپنے ساتھی کو بچا کر ڈیک پر لے آیا ہملکو انسٹرکٹر نے گھڑی پر ٹائم دیکھ کر نوٹ بک میں نوٹ کیا اور چیخ کر انگریزی میں کہا۔

"ایکسر سائیز نمبر تھری۔ ٹارگٹ ریڈی!"

اس آواز کو سنتے ہی ایک طرف سے دو گوریلے نکل کر ڈیک کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دو ٹوکرے اٹھائے ہوئے تھے۔ ڈیک کے جنگلے کے پاس آتے ہی انہوں نے ٹوکروں کو سمندر میں الٹ دیا۔ ٹوکروں میں کم از کم دس دس پندرہ پندرہ سیر کی دس بارہ مچھلیاں تھیں۔ سمندر میں گرتے ہی مچھلیاں پانی میں غوطے لگا گئیں۔ انسٹرکٹر کی آواز گونجی۔

"اٹیک۔"

اس حکم کے ملتے ہی دس کے دس تامل گوریلوں نے سٹین گن کاندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑیں اور سمندر میں کود گئے۔ یہ بڑا دلچسپ کھیل یا ایکسر سائیز تھی۔ سارے تامل گوریلے اسلحہ سمیت سمندر میں غوطے لگا گئے۔ ایک دو سیکنڈ بعد ہی سٹین گنوں کے برسٹ فائر ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازوں کے دھماکے سمندر کے اندر ہو رہے تھے جس کی وجہ سے آواز مدہم تھی۔ ہم سمندر کی سطح پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے سمندر کی سطح پر چھ سات مردہ مچھلیاں تیرنے لگیں۔ ہملکو انسٹرکٹر نے مجھے کہا۔

"ان مچھلیوں کے ٹارگٹ کو ہمارے آدمیوں نے سمندر کے اندر مار لیا ہے۔"

جب تک ساری مچھلیاں مر نہ گئیں اور ان کے مردہ جسم سمندر کی سطح پر نہ نکل آئے کوئی گوریلا سمندر سے ابھر کر باہر نہ نکلا جب ساری مچھلیاں مر گئیں تو ایک ایک کر کے دس کے دس گوریلے سمندری موجوں میں سے ابھر کر باہر نکل آئے۔ وہ اپنی سٹین گنیں لہرا کر نعرے لگا رہے تھے۔

ہلگو انسٹرکٹر نے سیٹی بجائی۔ سارے گوریلے اس طرح سمندر میں تیرتے ہوئے سٹیمر کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے سٹین گنوں والے ہاتھ پانی سے باہر تھے اور وہ ایک بازو اور دو ٹانگوں سے تیر رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے جب سارے گوریلے ڈیک پر آ کر فال ان ہو کر کھڑے ہوگئے تو انسٹرکٹر نے سیٹی بجائی۔ سب گوریلوں نے مل کر نعرہ لگایا۔ انسٹرکٹر نے چیخ کر کہا۔ "ایٹ ایز۔"

اور سب لوگ ایک دوسرے سے ہنستے مسکراتے باتیں کرتے نیچے ڈیک نمبر ۲ کی کیبن کی طرف چل دیے۔ انسٹرکٹر ہلگو میرے پاس آگیا۔ کہنے لگا۔
"ہماری ٹریننگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
میں نے کہا۔ "ایک دم نمبر ون تم واقعی بڑی محنت سے ٹریننگ دے رہے ہو۔"

ہلگو میرے ساتھ نیچے کیبن میں آگیا۔ وہاں پہلے سے چائے اور کافی میز پر لگی تھی۔ میں چائے اور ہلگو کافی پینے لگا۔ ساتھ ہی ناشتہ آگیا۔ میں بڑے غور سے ڈیک نمبر ۲ کی ایک ایک شے کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے اس سٹیمر میں بڑی خاص خاص جگہوں پر پلاسٹک کی دھماکہ خیز ٹیپ لگانی تھی۔ سب سے اہم مقام سٹیمر کا انجن روم تھا۔
میں نے ہلگو سے پوچھا۔ "اس سٹیمر میں کتنے انجن کام کر رہے ہیں۔"
"دو انجن ہیں یہ زیادہ بڑا سٹیمر نہیں ہے اس کے دو انجن ہی کافی ہیں۔"
میں نے کہا۔ "مجھے پسٹن والے انجن دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔"
ہلگو بولا۔ "ابھی چل کر دکھاتا ہوں۔ ویسے یہ پرانے انجن ہیں۔"
ناشتے کے بعد ہم نیچے انجن روم میں آ گئے۔ چھوٹا سا کیبن نما انجن روم تھا۔ گریس اور تیل میں لتھڑے ہوئے انجن خاموش تھے۔ دو انجن مین ان کے پرزوں کی چیکنگ وغیرہ کر رہے تھے۔ میں نے وہ جگہ ذہن میں رکھ لی جہاں مجھے

دھماکہ خیز ٹیپ لگانی تھی۔ ہم اوپر آکر ڈیک پر بچھی ہوئی بانس کی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سمندر میں اگلی ٹریننگ اب کس روز ہوگی۔ اس نے کہا۔

"اگلے ہفتے آج ہی کے دن۔ یہ ٹریننگ ہم ہفتے میں صرف ایک بار کرتے ہیں۔ ہمیں سمندری ٹریننگ کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم تامل لوگ سمندر میں کھیل کود کر بڑے ہوتے ہیں۔ ہمارا بچہ بڑی جلدی سمندر میں تیرنا سیکھ جاتا ہے۔"

میں بھلگو انسٹرکٹر کی باتیں سنی ان سنی کر رہا تھا۔ اصل میں میرا ذہن صرف ایک سوال پر غور کر رہا تھا کہ مجھے یہ آپریشن کب کرگزارنا چاہیے۔ کون سا وقت اس کے لیے موزوں رہے گا۔ اگر میں اگلے ہفتے ہی دھماکہ خیز ٹیپ لگا کر ان سارے گوریلوں کو سٹیمر سمیت دھماکے سے اڑا کر سمندر میں غرق کر کر دیتا ہوں تو اس کا بال ٹھاکرے اور بھارت کی سنٹرل انٹیلی جینس پر کیا ردعمل ہوگا۔ قدرتی طور پر تو سب سے پہلے تو وہ وہ لوگ یہ سوچیں گے کہ ایسا ہر بار کیوں ہوتا ہے کہ جہاں میں کسی اہم مشن پر جاتا ہوں وہاں میرے جاتے ہی کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ ہو جاتا ہے۔ ان کے ذہن میں جالندھر والے پرتھوی میزائیل کے اڈوں کی تباہی اور کئی دوسرے بھارتی دہشت گردوں کی موت کا خیال بھی آسکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے یہاں ٹریننگ کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ جب میں نے انسٹرکٹر بھلگو سے یہ سوال کیا تو وہ کہنے لگا۔

"ہمارے گوریلے بالکل تیار ہیں۔ یہ پہلے سے تربیت یافتہ ہیں۔ یہاں ایک طرح سے ان کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ یہ تو تم نے طے کرنا ہے کہ تم کتنے دنوں تک ان لوگوں کو سندھی پنجابی اور اردو میں ضروری بول چال سکھا سکتے ہو۔"

میں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

"میرے خیال میں تو ایک ماہ بھی لگ سکتا ہے اور پندرہ دن بھی لگ سکتے

ہیں۔ یہ تو تمہارے تامل گوریلوں پر منحصر ہے کہ وہ کتنی جلدی سندھی اور پنجابی کے جملے بولنے اور سمجھنے لگیں گے۔"

"تم ایک ہفتے سے انہیں کورس پڑھا رہے ہو۔ تم نے کیا اندازہ لگایا ہے۔"

میں اپنے حساب سے سوچ رہا تھا کہ یہاں کتنے دنوں کے بعد دھماکہ کرنا مناسب رہے گا۔ میں نے کہا۔

"میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ دس پندرہ دنوں کے بعد مجھے گوریلوں کی کارکردگی کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔"

انسٹرکٹر ھلگو بولا۔

"اوکے جب تم کہو گے تو ہم ان گوریلوں کو پاکستان سمگل کریں گے۔"

میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ اس بار میں کوئی ایسی سکیم بنانا چاہتا تھا کہ دھماکہ نہ کیا جائے۔ کوئی دوسرا ایسا منصوبہ بنایا جائے کہ بھارت کی سنٹرل انٹیلی جنیس بال ٹھاکرے اور میرے چھپے دشمن بالا جی راؤ کو ذرا سا بھی مجھ پر شک نہ پڑے۔ لیکن ایسا کوئی منصوبہ' کوئی سکیم میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں ان لوگوں کو زندہ چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر انہیں زندہ چھوڑتا ہوں تو ظاہر ہے یہ پاکستان جا کر بے پناہ تباہی مچائیں گے کچھ پتہ نہیں وہاں کتنے بے گناہوں کا خون کریں۔ ان کو ہلاک کرنا تو میری بڑی اہم ذمے داری بن چکی تھی۔ سوچنا یہ تھا کہ انہیں کس طریقے سے ٹھکانے لگایا جائے کہ کسی دشمن کے دماغ میں یہ خیال نہ آئے کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔ مزید ایک ہفتہ اسی ادھیڑبن میں گزر گیا۔ کوئی ترکیب میرے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

دوسرے ہفتے کے آخری دن جبکہ صبح تامل گوریلوں کو سمندر کی ٹریننگ پر جانا تھا۔ بمبئی سے مجھے بال ٹھاکرے کا فون آ گیا۔ وہ بولا۔

"ابھی تم یہاں کتنی دیر اور لگاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "سیناپتی جی! بس تھوڑی سی مہلت اور دے دیں پنجابی اور سندھی زبان آسانی سے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

بال ٹھاکرے نے اپنے مخصوص کرخت لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں ایک ہفتہ اور دیتا ہوں۔ اس کے بعد چاہے یہ کچھ سمجھیں چاہے نہ سمجھیں تم انہیں لے کر بمبئی آ جاؤ گے۔ ہمیں انہیں بڑی جلدی پاکستان بھیجنا ہے۔"

میں نے دل میں کہا۔ "اس بات کو تو تم بھول جاؤ کہ یہ خطرناک گوریلے پاکستان میں جا کر دہشت گردی کریں گے۔"

اوپر سے کہا۔ "ٹھیک ہے پیشوا جی! مجھے ایک ہفتہ اور ان پر محنت کر لینے دیجئے۔"

بال ٹھاکرے نے اپنی عادت کے مطابق بغیر کوئی لفظ کہے فون بند کر دیا میں سوچ میں پڑ گیا اس کا مطلب تھا کہ مجھے اگلے ہفتے دھماکہ کر کے ان سارے پاکستان دشمن گوریلوں کا صفایا کر دینا تھا۔ جب دوسری کوئی صورت نظر نہ آئی تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ان لوگوں کا کام تو تمام کرو۔ ان سانپوں کے تو سر کچلو جنہیں پاکستان کی زمین پر چھوڑا جانے والا ہے۔ آگے جو ہو گا۔ میں اسے سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔ پہلے بھی تو میں نے ایسے حالات میں صورت حال کو سنبھال لیا تھا۔ اب میں بے چینی سے اگلے ہفتے کی سمندری مشق کا انتظار کرنے لگا۔

جس روز بال ٹھاکرے کا بمبئی سے ٹیلی فون آیا تھا اسی روز تامل گوریلوں کو سمندری مشقوں پر جانا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ مشقوں کے وقفے کے دوران جب ہم لوگ سٹیمر کے کیبن میں ناشتہ کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ میں نے انسٹرکٹر ھملگو سے کہا۔

"تم لوگ جس سمندر میں ایکسر سائز کر رہے ہو اس کی دوسری طرف سری

لنکا کا سمندر ہے جو یہاں سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہی ہے اور سری لنکا ہمارا اور خاص طور پر تم تامل ٹائیگروں کا جانی دشمن ہے اور ان کی برین سروس کے گوریلے بھی یہاں آ سکتے ہیں کیا کبھی ان لوگوں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

انسٹرکٹر پہلو کو سہلاتے ہوئے انگریزی میں کہنے لگا۔

"ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ سری لنکا کے میرین کمانڈو بھیس بدل کر ہمارے علاقے میں گھس آتے ہیں۔ لیکن ہمارے تامل گوریلے ان سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ ہم انہیں یا تو مار دیتے ہیں یا پکڑ کر ملٹری پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ وہ ہمارے ساحل کے آس پاس دو چار دھماکے کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔"

دوسرے ہی دن میں نے بال ٹھاکرے کو اس کے خفیہ نمبر پر فون کر کے اسے اس صورت حال کے بارے میں اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر بتایا اور کہا۔

"پیشوا جی! سری لنکا کی نیول فورس کے کمانڈو ہمارے سمندر میں آ کر دھماکے کر جاتے ہیں۔ ایسا کئی ماہ سے مسلسل ہو رہا ہے۔ ہماری انٹیلی جنس اس معاملے میں کوئی موثر کارروائی نہیں کر رہی۔"

بال ٹھاکرے نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے' مجھے معلوم ہے لیکن تم اپنا کام کیے جاؤ۔ ہماری انڈین نیوی کی سیکورٹی کو حالات کا پورا احساس ہے۔"

میں نے کہا۔ "سر! پرسوں شام کو میں نے منڈاپم کیمپ میں دو مشکوک آدمیوں کو اپنے ٹریننگ کیمپ کی بارک سے نکل کر سمندر کی طرف جاتے دیکھا ہے میں ان کے پیچھے پیچھے گیا مگر وہ مجھے جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ سر! اس طرف ہمیں توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ جب ہم سمندری ٹریننگ پر جاتے ہیں تو دوسرے ہمیں اپنے دشمن ملک سری لنکا کی نیوی کے

وارشپ صاف نظر آ رہے ہوتے ہیں۔"
بال ٹھاکرے ایک دو لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔
"ٹھیک ہے میں اس معاملے پر غور کروں گا۔ تم جتنی جلدی ہو سکے تامل گوریلوں کا کورس ختم کر کے انہیں لے کر بمبئی پہنچنے کی کوشش کرو۔"
میں نے کہا "ٹھیک ہے سر۔ بالکل ٹھیک ہے۔"
"ٹھیک ہے سر۔ بالکل ٹھیک ہے۔"
بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔

میں نے تھوڑی بہت پیش بندی کر دی تھی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔ مجھے تو ہر حالت میں اگلی سمندری ٹریننگ کے فوراً بعد ان لوگوں کو اڑا دینا ہے۔ یہ میں فیصلہ کر چکا تھا۔ ایک ہفتہ گراؤنڈ ٹریننگ میں گزر گیا۔ اس دن کا آغاز ہوا جس روز سورج نکلنے پر دس کے دس تامل گوریلوں نے اپنے انسٹرکٹر بھلگو کے ساتھ سمندری مشق کے لیے جانا تھا۔ ان مشقوں میں میں ان کے ساتھ ضرور جاتا۔ چنانچہ اس دن بھی تیار ہو کر ساتھ چل پڑا۔ ہم دو پرانی جیپوں میں سوار تھے۔ سٹیمر چٹانوں کی اوٹ میں سمندر میں کھڑا تھا۔ ہم سٹیمر پر آ گئے۔ بھلگو انسٹرکٹر نے گوریلوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے رسمی طور پر ان کی گنتی کی۔ پھر سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز پر انجن مین نے سٹیمر کا انجن چلا دیا۔ سٹیمر ساحل کو چھوڑ کر کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگا۔ ساحل سے کچھ دور جا کر سٹیمر کا لنگر گرا دیا گیا۔ سٹیمر رک گیا۔ اب معمول کے مطابق ایکسر سائز شروع ہو گئی۔ میں نے آج بانس کی کرسی پیچھے کر کے اس جگہ ڈال دی تھی جہاں سیڑھیاں نیچے انجن روم کو جاتی تھیں۔ چونکہ اس وقت انجن بند کر دیا جاتا تھا اس لیے میں نے نوٹ کیا تھا کہ انجن مین اور اس کا اسسٹنٹ فائر مین انجن روم سے نکل کر مشقیں دیکھنے اوپر ڈیک پر آ جاتے تھے۔ اس روز بھی وہ اپنی عادت کے مطابق اوپر ڈیک پر ایک طرف بیٹھے تامل

گوریلوں کو سمندر میں چھلانگیں لگا کر غوطے لگاتے دیکھ رہے تھے۔ میرے لیے یہ موقع بڑا غنیمت تھا۔ میں آہستہ سے کرسی چھوڑ کر اٹھا اور بڑے سکون کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ دوسری منزل کا ڈیک بالکل خالی پڑا تھا۔ میں نیچے انجن روم میں آ گیا۔

میرے پاس ہر چیز تیار تھی۔ جہاں جہاں مجھے دھماکہ خیز ٹیپ چپکانی تھی ان جگہوں کا بھی میں پہلے سے انتخاب کر چکا تھا۔ یہ چھ مقام تھے دو ٹیپیں میں نے خاص طور پر انجن کے بوائلر کے ساتھ نیچے کر کے چپکا دیں۔ باقی ٹیپیں جہاں جہاں لگانی تھیں لگا دیں۔ مجھے معلوم تھا کہ سمندری مشقیں تقریباً" دو گھنٹے تک جاری رہا کرتی ہیں اور اس دوران تامل گوریلے ناشتہ بھی سٹیمر پر ہی کرتے ہیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں تیزی سے چلتا انجن روم سے نکل کر اوپر ڈیک پر آ گیا۔ میرے حساب سے سٹیمر میں ٹھیک پون گھنٹے کے بعد زبردست دھماکہ ہونے والا تھا۔ اس وقت تامل گوریلے دوسری مشق کر رہے تھے اور اپنے ایک ساتھی کو ڈوبنے سے بچانے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں ڈیک کے جنگلے کے ساتھ کھڑا ہو کر یہ نظارہ دیکھنے لگا۔ میرا ذہن اس وقت صرف ایک ہی مسئلے پر غور کر رہا تھا اور وہ مسئلہ تھا کہ میں سٹیمر سے کیسے نکلوں؟ کیونکہ مجھے سٹیمر کے ساتھ دھماکے سے نہیں اڑنا تھا۔ مگر سٹیمر ساحل سے دور تھا۔ سٹیمر کی ایک جانب دو چھوٹی چھوٹی کشتیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ ہنگامی حالات میں استعمال کی جانے والی کشتیاں تھیں۔ دوسری مشق ختم ہوئی تو میں نے انسٹرکٹر ھملگو سے انگریزی میں کہا۔

"پیارے بھائی ھملگو! آج میرا سمندر میں کشتی چلانے کو بہت جی چاہتا ہے۔ بمبئی میں تو میں نے ایک کشتی ٹھیکے پر لے رکھی تھی ہر روز شام کو اس میں بیٹھ کر رونگ کرتا تھا۔

ھملگو نے فوراً" کہا۔

"ضرور کشتی رانی کرو۔ سٹیمر پر اس وقت دو کشتیاں موجود ہیں۔ ان میں

سے ایک اتروا دیتا ہوں۔ مگر یہ چھوٹی ہے۔"

میں نے کہا۔ "چھوٹی کشتی مجھے زیادہ پسند ہے۔ شکریہ۔"

اس نے اس وقت ایک تامل گوریلے کو آرڈر دیا کہ دھرم چند جی کے لیے ایک کشتی سمندر میں اتار دو۔ تامل گوریلے نے اونچی آواز میں یس سر کہا اور مجھے لے کر ڈیک کی سائیڈ پر جہاں دو کشتیاں رسیوں سے بندھی لٹک رہی تھیں اس طرف آ گیا۔ میں ایک کشتی میں بیٹھ گیا اور چپو ہاتھوں میں لے لیے۔ گوریلے نے رسی کھولی اور اسے آہستہ آہستہ چھوڑتا گیا۔ کشتی آہستہ آہستہ نیچے آتی آتی سمندر کی سطح کے ساتھ لگ گئی اور اوپر نیچے ہونے لگی۔ گوریلے نے اوپر سے رسی کھینچ لی۔ میں نے اوپر انسٹرکٹر ہلکو کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

"بائی بائی دوست۔"

مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر مجھے الوادع کہنے لگا۔ میں نے دل میں کہا ہمیشہ کے لیے الوداع! میرے وطن میں جا کر دہشت گردی کرنے والوں کا میں اسی طرح خاتمہ کروں گا۔ میں چپو چلاتے ہوئے کشتی کو سٹیمر سے دور لے گیا پھر اس کا رخ ساحل کی طرف پھیر دیا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر سٹیمر کی طرف دیکھا۔ سٹیمر مجھ سے کافی دور ہو چکا تھا اور تامل گوریلے اب دوسری مشق کے لیے سمندر میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ میں کشتی کو دائرے کی شکل میں چکر میں رکھے ہوئے تھا۔ دوسری مشق ختم ہوئی تو سب گوریلے ڈیک پر آ کر انسٹرکٹر کے ساتھ ڈیک پر سے چلے گئے۔ میں سمجھ گیا وہ لوگ دوسرے ڈیک کی کیبن پر ناشتہ کرنے چلے گئے تھے۔ یہ لوگ کافی دیر تک ناشتہ کرتے تھے۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھ لیتا تھا۔ مجھے انجن روم میں دھماکہ خیز ٹیپ لگائے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ ابھی تک سٹیمر کا ڈیک خالی تھا۔ سارے گوریلے اپنے انسٹرکٹر کے ساتھ کیبن میں ہی بیٹھے تھے۔

میں کشتی کو سمندر میں ذرا آگے لے گیا۔ ایک چھوٹا سا چکر لگا کر کشتی کو

ساحل کی طرف لے جانے لگا۔ اس وقت سٹیمر میں دھماکہ ہونے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔ میری کشتی سٹیمر سے محفوظ فاصلے پر تھی۔ میں سمندر میں ہی رہ کر سٹیمر کی تباہی کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ جب دھماکہ ہونے میں صرف چار منٹ رہ گئے تو دور سے مجھے سٹیمر کے ڈیک پر تامل گوریلے چلتے پھرتے دکھائی دیے۔ ان کی تیسری مشق شروع ہونے والی تھی۔ خطرہ اسی بات کا تھا کہ دھماکے سے پہلے تامل گوریلے تیسری مشق کے لیے سمندر میں نہ کود جائیں۔ میں نے چپو چلانے بند کر دیے تھے اور بے چینی سے سٹیمر کے ڈیک کو تک رہا تھا۔ دور سے مجھے گوریلے ڈیک پر چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ابھی وہ مشق شروع کرنے سے پہلے قطار میں فال ان نہیں ہوئے تھے۔ انسٹرکٹر ہملگو نے شاید انہیں کسی کام لگا دیا تھا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

دھماکے کا وقت ہو گیا تھا۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سٹیمر کو دیکھ رہا تھا۔ یا اللہ پاکستان کے ان منوں کو یہیں ختم کر دے۔ یا اللہ! پاکستان کو ان دشمنوں سے محفوظ رکھنا۔ یا ند! پاکستان کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ پاکستان کو اپنی فاظت میں رکھنا۔ یہ دعا میرے لبوں پر تھی کہ ایک بجلی چمکی۔ سمندر اس چمک ب ایک دم روشن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دھماکہ ہوا اور جہاں سٹیمر کھڑا تھا ہاں اس طرح شعلے بلند ہونے لگے جیسے سمندر کے اندر کوئی جوالا مکھی پوری اقت سے پھٹ گیا ہو۔ سٹیمر کے ٹکڑوں کو میں نے فضا میں اڑتے ہوئے دیکھا تو کون کا سانس لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اتنے زبردست دھماکے اور آگ کے شعلوں بں سٹیمر پر ایک بھی گوریلا زندہ نہیں بچا ہو گا۔ میرے دیکھتے دیکھتے سٹیمر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غرق ہو گیا۔ میں نے تیزی سے کشتی کو لے کر اس طرف بڑھا جہاں سٹیمر کھڑا تھا اور جہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ کشتی قریب گئی تو میں نے سمندر کے پانی کو ابلتے ہوئے دیکھا۔ وہاں گرم پانی کے بھنور پڑ رہے تھے اور بھاپ کے

بادل اٹھ رہے تھے۔

سمندر کی لہروں پر سٹیمر کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر تیر رہے تھے۔ میں نے کشتی کو مزید پیچھے کر لیا۔ میں اس تلاش میں تھا کہ کہیں کوئی تامل گوریلا زندہ تو نہیں بچ گیا مگر مجھے کوئی انسان سمندری لہروں پر تیرتا دکھائی نہ دیا اس کے باوجود میں کشتی میں وہیں ادھر ادھر چکر لگاتا رہا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ سارے تامل گوریلے اپنے انسٹرکٹر سمیت سمندر میں غرق ہوگئے ہیں تو تیزی سے کشتی چلاتا ہوا ساحل پر آگیا۔ ساحل پر آنے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کشتی کے پیندے میں ایک نوکیلے پتھر کی ضربوں سے سوراخ کر دیا۔ کشتی میں پانی بھرنے لگا اور پھر وہ بھی ڈوب گئی۔ میں نے سمندر میں ایک ڈبکی لگائی تاکہ میرے کپڑے گیلے ہو جائیں اور تامل گوریلوں کی بیرک کی طرف دوڑ پڑا۔

بیرک خالی پڑی تھی کچن کے باہر مدراسی نوکر گھبرایا ہوا سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ "یہ بم کی آواز کہاں سے آئی تھی سر؟"

میں نے بھرپور اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"سٹیمر کو مارٹر توپ کا گولہ لگا اور وہ تباہ ہوگیا۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ تم یہیں رہنا میں سٹیشن سے فون کر کے آتا ہوں۔"

میں تیز تیز چلتا منڈاپم کیمپ کے ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ میں نے سب سے پہلے پولیس کو فون کر کے بتایا کہ ہمارے سٹیمر کو مارٹر کے گولے نے تباہ کر دیا ہے۔ گولہ سری لنکا کے ساحل کی جانب سے آیا تھا۔

پولیس آفیسر نے کہا۔

"ہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے بمبئی بال ٹھاکرے کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے نوکر نے پوچھا۔ کون ہو؟ میں نے کہا میں دھرم چند بول رہا ہوں۔ مہاراج سے بات کراؤ۔ جلدی کوئی چار پانچ سیکنڈ بعد بال ٹھاکرے کی آواز آئی۔

"دھرم چند کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "پیشوا جی جس بات کا مجھے ڈر تھا آخر وہی ہوا۔ ہم سمندری مشقوں پر تھے کہ سری لنکا کی ساحلی بندرگاہ تالی منار کی طرف سے مارٹر کا گولہ آ کر سٹیمر کو لگا اور سٹیمر کو آگ لگ گئی۔ سٹیمر پھٹ گیا۔ اس وقت اپنے گوریلا ساتھی سٹیمر کی کینٹن میں ناشتہ کر رہے تھے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا سکا ہوں۔ ابھی تک کچھ پتہ نہیں کہ کون کون زندہ بچا ہے۔ میں نے پولیس کو فون کر دیا۔"

دوسری طرف خاموشی طاری تھی۔ میں اپنی بات ختم کر چکا تھا مگر بال ٹھاکرے کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"سر! آپ سن رہے ہیں۔"

"ہاں دھرم چند!" بال ٹھاکرے کی آواز آئی۔ میں سن بھی رہا ہوں اور سوچ بھی رہا ہوں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔

میں نے کہا۔ "سر میں نے آپ سے پہلے بھی ذکر کیا تھا اور اپنے گوریلا انسٹرکٹر منگلو بھائی سے بھی کہا تھا کہ سری لنکا کی نیول انٹیلی جینس کے آدمی کو میں نے ادھر مشکوک انداز میں پھرتے دیکھا ہے مگر سر! منگلو بھیا نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مہاراج! سری لنکا کی بندرگاہ تالی منار وہاں سے ہمیں صاف نظر آتی تھی جہاں ہمارا سٹیمر سمندر میں کھڑا تھا۔ سر! یہ مارٹر کا فائر تھا۔ سٹیمر پر ایک نہیں دو گولے فائر کیے گئے تھے۔"

میں نے بات ختم کی تو بال ٹھاکرے پر پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ جب میں نے کہا کہ میں پولیس کو فون کر دیا ہے۔ پولیس آ رہی ہوگی مجھے کیا بیان دینا چاہیے۔ تو بال ٹھاکرے نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں کیا بتاؤں کہ کیا بیان دینا ہے؟ جو جی میں آئے کہہ دینا۔ مجھے فوراً رپورٹ کرو کہ گوریلوں میں سے کون کون زندہ بچا ہے۔ بس۔"

بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔ میں دل میں پریشان ضرور تھا۔ اس لیے کہ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ اس معاملے میں میں بال ٹھاکرے کو قائل نہیں کر سکا اور ممکن ہے کہ اسے مجھ پر شک پڑ گیا ہو۔ میں سٹیشن سے واپس گوریلوں کی بیرک میں آگیا۔ اتنی دیر میں پولیس آ گئی۔ میں نے جو بیان بال ٹھاکرے کو دیا وہی پولیس کو دیا۔ پولیس کو معلوم تھا کہ یہاں تامل گوریلوں کو ہمسایہ ملک پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کے لیے ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ پولیس انسپکٹر نے مجھے ساتھ لیا اور ہم سمندر کے کنارے آ گئے۔ اس دوران وہاں کوسٹ گارڈ کی دو کشتیاں اور چھ سات کوسٹ گارڈ کے آدمی وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ہمیں بھی ساتھ لیا اور میری راہ نمائی میں سمندر کی اس جانب چل پڑے جہاں ہمارا سٹیمر غرق ہوا تھا۔

پولیس اور کوسٹ گارڈ کے آدمی کشتیوں میں بیٹھ کر دیر تک لاشیں تلاش کرتے رہے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا مگر کسی گوریلے کی لاش نہ مل سکی۔ جہاں سٹیمر دھماکے سے پھٹ کر غرق ہوا تھا وہاں سمندر کی موجوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ سٹیمر کے آہنی ٹکڑے ڈوب چکے تھے۔ لکڑی کے ٹکڑے تیرتے ہوئے نہ جانے کدھر نکل گئے تھے۔ کوسٹ گارڈ کے آفیسر نے انگریزی میں کہا۔

"کل تک کوئی نہ کوئی لاش کنارے پر آ جائے گی۔ ابھی یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ واپس چلتے ہیں۔"

واپس منڈا پم کیمپ پولیس سٹیشن آ کر میرا بیان لکھا گیا۔ جب کوسٹ گارڈ والے چلے گئے اور پولیس بھی اپنی کارروائی پوری کر چکی تو میں نے مدراسی پولیس انسپکٹر سے کہا۔

"میرے بارے میں کیا حکم ہے سر؟"

پولیس انسپکٹر بولا۔ "اگر کوئی لاش ملی تو آپ سے اس کی شناخت کروا لیں گے۔ آپ دو ایک دن یہیں رہیں ویسے آپ بال ٹھاکرے جی کے آدمی ہیں ہم آپ کو روک بھی نہیں سکتے۔"

میں نے کہا۔ "کیا میں یہاں سے ٹھاکرے جی کو فون کر سکتا ہوں۔"

پولیس انسپکٹر نے فون میرے آگے کر دیا۔ میں نے بمبئی کا نمبر ملا کر ڈائیل کیا تو بال ٹھاکرے فون پر موجود تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی تک سمندر سے اپنے کسی آدمی کی لاش نہیں ملی۔ پولیس کا خیال ہے کہ کل تک کوئی نہ کوئی

لاش ضرور ساحل پر آئے گی۔ بال ٹھاکرے کی آواز بڑی سنجیدہ تھی اور بھاری تھی۔ کہنے لگا۔

"تم ابھی یہیں رہو۔ کوئی بھی لاش نکلے تو مجھے اس کی اطلاع دینا۔"

اور اس نے فون بند کر دیا۔ میں پولیس سٹیشن سے گوریلا ٹریننگ کیمپ میں واپس آگیا۔ گوریلوں کی بیرک پر موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی سے مجھے سکون مل رہا تھا۔ میں نے پاکستان کے خلاف اٹھنے والے بازو کو کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ مجھے اپنے انجام کی پروا نہیں تھی میں تو پہلے ہی اپنی جان موت کے پاس گروی رکھ کر یہاں آیا تھا۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے پاکستان میں دہشت پھیلانے والے اور تباہی مچانے والے خطرناک ترین بھارتی گوریلوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ دوپہر کے بعد وہاں پولیس کے تین سپاہی آ گئے جنھوں نے تامل گوریلوں کے میگزین کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ میگزین والی کوٹھڑی کے باہر مدراسی پولیس کا پہرہ لگ گیا۔ میں نے کینٹین پر کھانا کھایا اور اپنے جھونپڑے میں آ کر لیٹ گیا اور بال ٹھاکرے کی آواز اس کے بولنے کے انداز اور اس تباہی کی خبر کے ردعمل کے بارے میں تجزیہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کسی وقت خیال آتا کہ بال ٹھاکرے کو میرے بارے میں یقین ہوگیا ہے کہ میں ڈبل ایجنٹ بن چکا ہوں اور پاکستان کے لیے بھی کام کر رہا ہوں۔ کسی وقت خیال آیا کہ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو بال ٹھاکرے کے ایک اشارے پر پولیس مجھے گرفتار کر چکی ہوتی۔ وہ دن گزر گیا۔

رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن کوسٹ گارڈ کے آدمی اور پولیس ساحل سمندر پر پہنچ گئی اور لاشوں کی تلاشی شروع ہو گئی۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی موٹر بوٹ میں بیٹھا تھا۔ ہم نے دور دور تک سمندر کھنگال ڈالا مگر کہیں کوئی لاش یا لاش کا کوئی ٹکڑا تیرتا ہوا نہ ملا۔ تین گھنٹے کی بے سود تلاش کے بعد ہم واپس آ

گئے۔ کوسٹ گارڈ والے شام کو آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ پولیس انسپکٹر نے مجھ سے انگریزی میں کہا۔

"جب کوئی مارٹر کا گولہ آ کر چھوٹے سٹیمر کو لگتا ہے تو پھر وہاں کسی انسان کے زندہ سلامت رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر سٹیمر ویسے ڈوب گیا ہوتا تو ممکن تھا کہ لاشیں نیچے سے اوپر آ جاتیں مگر سٹیمر ڈوبا نہیں تھا۔ وہ تو مارٹر کا گولہ لگنے سے پھٹ گیا تھا۔ انسانوں کے تو ٹکڑے اڑ گئے ہوں گے۔"

اس کے بعد پولیس انسپکٹر مجھ سے مارٹر فائر کے بارے میں پوچھنے لگا کہ مارٹر کا گولہ جب فائر ہوتا ہے تو ایک خاص قسم کی سیٹی کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ "کیا تم نے سیٹی کی آواز سنی تھی؟"

میں نے کہا "ضرور سنی تھی اس آواز سے میرے کان اچھی طرح آشنا ہیں توپ کے گولے اور مارٹر کے گولے کی آواز کا فرق معلوم ہے۔"

دوپہر کے بعد میں کینٹین سے کھانا کھا کر اپنے جھونپڑے میں آیا ہی تھا کہ ایک پولیس کانسٹیبل موٹر سائیکل پر سوار آیا اور بولا۔

"سر! بمبئی سے آپ کی کال آئی ہے۔ جلدی چلیں۔ بال ٹھاکرے جی بات کریں گے۔"

میں کانسٹیبل کے پیچھے بیٹھ گیا اور موٹر سائیکل پوری رفتار سے مجھے لے کر پولیس اسٹیشن آ گیا۔ پولیس انسپکٹر نے فون ہولڈ کیا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انگریزی میں کہنے لگا۔

"ٹھاکرے جی بات کریں گے۔"

اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے ٹھاکرے کی آواز آئی۔ "کوئی لاش ملی یا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج جی! ابھی تک ایک بھی لاش نہیں مل سکی مگر میں یہاں بیٹھا ہوں۔ کوسٹ گارڈز کا خیال ہے کہ دو تین دن میں کوئی نہ کوئی لاش

سمندر ضرور کنارے پر پھینک دے گا۔"

بال ٹھاکرے نے کوسٹ گارڈز کو مراٹھی میں فحش گالی دی اور کہا۔ "ان لوگوں کو کچھ پتہ نہیں ہے یہ سب بے کار لوگ ہیں۔ تم یہیں ٹھہرنا۔ تمہیں ابھی بمبئی آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوپہر کے بعد تم سمندر پر خود جا کر دیکھنا کوئی نہ کوئی لاش سمندر ضرور پھینکے گا۔"

میں اس خیال سے مطمئن ہوگیا کہ بال ٹھاکرے کو مجھ پر زیادہ شک نہیں پڑا تھا ورنہ وہ مجھے اسی وقت بمبئی بلا لیتا میں نے کہا۔ "یس سر! جیسے آپ کا حکم سر! میں آپ کے حکم کی پابندی کروں گا جب تک آپ کے آرڈر نہیں آئیں گے میں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔"

بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور سوچنے لگا کیا واقعی بال ٹھاکرے کو مجھ پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا؟ اس کی باتوں سے ہی ثابت ہو رہا تھا کہ میری تختی صاف ہے اور اس کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس زبردست تباہی میں میرا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ مدراسی پولیس افسر میری طرف دیکھ کر خوشامدانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس بھارت کے فرعون بال ٹھاکرے کا بھارت کے عوام پر شمال سے لے کر جنوب تک کتنا گہرا اثر ہے۔ وہ دن بھی گزر گیا۔

دیکھا جائے تو میرا وہاں اب کوئی کام نہیں تھا لیکن بال ٹھاکرے کو مجھ پر اس قدر بھروسہ ہوگیا ہوا تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ جب تک تامل گوریلوں کی لاشوں کا سراغ نہیں ملتا میں جائے واردات پر ہی رہوں۔ مزید ایک دن گزر گیا۔ لاشوں کی تلاش جاری تھی۔ سمندر جیسے تمام لاشوں کو ہضم کر گیا تھا۔ کسی لاش کی انگلی تک نہیں مل رہی تھی۔ ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ میں نے سوچا کہ بال ٹھاکرے کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہیے اور پوچھنا چاہیے کہ مجھے ابھی یہاں کب تک ٹھہرنا ہوگا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی سورج غروب

ہوگیا ہوا تھا اور شام کے سائے جنوبی ہند کے جنگلوں' کھیتوں اور ساحل سمندر کے ریتلے کناروں پر تیزی سے پھیل رہے تھے۔ میں نے سوچ کر فیصلہ کیا کہ کل دن کے وقت بال ٹھاکرے کو فون کروں گا۔ میں نے منڈا پم کیمپ کی نیم فوجی کینٹین پر جا کر کھانا کھایا۔ کافی کی ایک پیالی پی اور اپنے جھونپڑی نما کمرے میں آ کر سگریٹ سلگا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس روز صبح ہی سے آسمان پر بادلوں کا آنا جانا شروع ہوگیا تھا۔ ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ موسمی پیشین گوئی کے مطابق بارش ہونے والی تھی۔ ابھی میرا آدھا سگریٹ بھی نہیں جلا تھا کہ باہر مجھے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ آواز قریب آ کر میرے جھونپڑے کے پاس رک گئی۔ مجھے خیال آیا کہ ضرور بمبئی سے فون آیا ہے اور پولیس کانسٹیبل مجھے بلانے آیا ہے۔

میں جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔ باہر کھمبے پر بلب روشن تھا۔ سامنے پولیس کانسٹیبل موٹر سائیکل کھڑی کر کے میری طرف آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"سر! بمبئی سے ٹھاکرے جی کا فون آیا ہے۔"

میں نے دل میں کہا کہ چلو یہ بھی اچھا ہے۔ اسی وقت بات کر لیتا ہوں کہ اب میرا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ مجھے کوئی دوسرا مشن دیا جائے۔ میں موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر پولیس سٹیشن آ گیا۔ مدراسی پولیس افسر کافی کا گلاس سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ اس نے ٹیلی فون میری طرف بڑھاتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"سر! گورو دیو ٹھاکرے جی کا فون ہے۔"

میں نے ریسیور کان کے ساتھ لگا کر بڑے ادب سے کہا۔

"سینا پتی جی! میں آپ کا سیوک دھرم چند بول رہا ہوں"

دوسری طرف سے بال ٹھاکرے نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"دھرم چند! اچھا ہوا تم مل گئے مجھے ڈر تھا کہیں تم ادھر ادھر نہ نکل گئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "سر! میں آپ کے حکم کے بغیر یہاں سے کیسے ہل سکتا ہوں۔"

بال ٹھاکرے بولا۔ "شاباش! مجھے تمہاری وفاداری پر پورا بھروسہ ہے۔"
میں نے مزید خوشامدانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔
"پیشوا جی! حکم کیجئے۔"
بال ٹھاکرے نے مجھے ایک بار پھر شاباش دی اور کہا۔

"مجھے پولیس کے ذریعے اطلاع مل گئی ہے کہ اپنے تامل گوریلوں میں سے کسی کی لاش نہیں مل سکی اور خفیہ ذرائع سے مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ یہ کام سری لنکا کی بحریہ کی انٹیلی جینس کا ہے۔ اب تمہارا یہاں رکے رہنا بے کار ہے تم ایسا کرو آج رات کو ہی کوئی گاڑی پکڑ کر بمبئی کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میں تمہیں ایک بڑے اہم مشن پر بھیجنا چاہتا ہوں۔ یہ مشن اس قدر اہم ہے کہ اس پر تمہارے سوا میں کسی پر اعتماد بھروسہ نہیں کر سکتا۔"

میں خوش ہوگیا کہ اس منڈاپم کیمپ سے تو جان چھوٹی۔ میں نے کہا۔
"سر! رات کے بارہ بجے کے بعد یہاں سے ایک گاڑی ناگ پور مدراس کو جاتی ہے میں وہ گاڑی پکڑ کر روانہ ہو جاؤں گا۔"

بال ٹھاکرے نے ایک سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"نہیں نہیں دھرم چند۔ ٹرین میں دیر لگ جائے گی میں تمہیں جس نئے مشن پر بھیجنا چاہتا ہوں اس میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ تم ایسا کرو کی منڈاپم کیمپ سے مدھورائی تک کا ٹکٹ لے کر مدھورائی سٹیشن پر اتر جاؤ۔ مدھورائی سے بمبئی تک انڈین ایئر لائینز کی فلائٹیں آتی ہیں۔ تم مدھورائی کے انڈین ایئر لائینز کے آفس میں پہنچ کر میرا نام لینا۔ جہاز میں سیٹ نہ بھی ہوئی تو کسی دوسرے کی سیٹ کینسل کر کے تمہیں مل جائے گی۔ ایئر لائینز کے مینجر کو ابھی فون کر دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا تھوڑا سا وقت بھی ضائع نہ ہو۔ یہ مشن

میری اور تمہاری زندگی کا بڑا یادگار مشن ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ اس مشن کی کامیابی کے بعد تمہیں بھارت سرکار کی طرف سے پدم شری کا اعزاز بھی مل جائے۔"

میں خوشی سے پھول رہا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بال ٹھاکرے کا دل میری طرف سے بالکل صاف تھا اور دوسرے اس وجہ سے کہ اگر مجھے پدم شری کا سرکاری اعزاز مل گیا تو میرے لیے بھارتی حکومت کے پاکستان کے خلاف منصوبوں تک پہنچنا اور انہیں تباہ کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا میں نے کہا۔

"جو حکم مہاراج جی! میں کل آپ کے چرنوں میں ہوں گا۔"

"شاباش! دھرم چند! تم بھارت ماتا کے سچے بھگت ہو۔ بمبئی کے ائیرپورٹ پر اترتے ہی مجھے فون کر دینا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے مہاراج۔"

بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔ میرے سر پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا بلکہ دو بوجھ اتر گئے تھے۔ ایک تو مجھے تامل ناڈو کے منڈاپم کیمپ سے نجات مل گئی تھی دوسرے بال ٹھاکرے کی طرف سے یہ خوش خبری ملی تھی کہ اس کا ذہن میری طرف سے صاف ہے اور اسے مجھ پر کوئی شک شبہ نہیں ہے بلکہ سرکاری طور پر بھی اس کو معلوم ہوگیا ہے کہ سٹیمر پر سری لنکا کی بحریہ کے کسی جہاز پر سے مارٹر فائرنگ کی گئی تھی۔

میں اس نئے انکشاف پر حیران ضرور ہوا کہ بھارت کی ایسی کون سی بے خبر خفیہ ایجنسی ہے جس نے بال ٹھاکرے کو ایسی غلط خبر پہنچائی۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے بیوروکریسی اور بھارت کی سنٹرل انٹیلی جینس والے بھی بال ٹھاکرے کو اس قسم کی خبریں دے کر سری لنکا کی سرکار کے خلاف مزید بھڑکانا چاہتے ہوں کیونکہ بھارت کی حکومت سری لنکا سے دشمنی کی پالیسی پر عمل پیرا تھی اور وہ اپنے عوام کو بھی سری لنکا کے خلاف رکھنا چاہتی تھی اور بال ٹھاکرے [illegible]ام پر

زبردست اثر تھا۔

مجھے تیاری کچھ بھی نہیں کرنی تھی۔ کپڑے کے دو جوڑے اٹیچی کیس میں رکھے اور ٹریننگ کیمپ کی بیرکوں سے نکل کر پولیس سٹیشن آ گیا۔ کیونکہ رات کے بارہ بجے مجھے ٹریننگ کیمپ کے ریلوے سٹیشن تک کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی۔ پولیس کی گاڑی تو مجھے رات بارہ بجے بھی سٹیشن پر پہنچا سکتی تھی۔ پولیس سٹیشن کا عملہ پہلے ہی میرا مطیع ہو چکا تھا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے میرے لیے ایک کمرہ کھول کر اندر چارپائی بچھا کر پنکھا چلا دیا گیا۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا۔

"مجھے رات کے ٹھیک گیارہ بجے جگا دینا۔ مجھے بارہ بجے والی گاڑی پکڑنی ہے۔"

میرا ذہن چونکہ اب ہر قسم کے پریشان کرنے والے خیالات سے پاک ہو گیا تھا اس لیے مجھے بڑی آسانی سے نیند آ گئی۔ ٹھیک گیارہ بجے مجھے مدراسی کانسٹیبل نے جگا دیا۔ میں اٹھ کر پولیس کی گاڑی میں بیٹھا اور منڈا پم کیمپ کے چھوٹے سٹیشن پر آ گیا۔ بارہ بجے والی گاڑی جنوب کی جانب بھارت کی آخری تکونی بندرگاہ دھنش کوڑی سے ساڑھے بارہ بجے آئی۔ گاڑی میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اکثر مسافر سو رہے تھے۔ میں نے بال ٹھاکرے کی ہدایت کے مطابق مدھورائی یا مجورا کا ٹکٹ لیا تھا۔ ساری رات اور دوسرے دن دوپہر تک ٹرین چلتی رہی۔ دوپہر کے بعد مجورا کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں وہاں اتر گیا۔ بارش راستے میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے سٹیشن سے ٹیکسی پکڑی اور اسے انڈین ایئر لائینز کے آفس چلنے کو کہا۔ بال ٹھاکرے کا ٹیلی فون پہلے ہی کمپنی کے آفس مینجر کو پہنچ چکا تھا۔ جیسے ہی میں نے آفس مینجر سے اپنا تعارف کرایا اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور انگریزی میں کہنے لگا۔

"مجھے ٹھاکرے جی کا ٹیلی فون کل شام کو ہی آ گیا تھا۔ ہماری ایک ایئر

بس کی فلائیٹ ایک گھنٹے بعد حیدر آباد سے ہوتی ہوئی بمبئی روانہ ہونے والی ہے۔
اس میں آپ کی سیٹ کنفرم کر دی گئی ہے۔ آپ ٹکٹ لے لیجئے۔"

میں نے ٹکٹ لیا۔ بلکہ مدراسی آفس مینجر نے وہیں آفس میں میرا ٹکٹ منگوا دیا۔ کافی پلائی اور کہا۔

"آپ کو ہماری گاڑی ایئرپورٹ چھوڑ آئے گی آیئے میرے ساتھ۔"

باہر ایئرلائینز کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ آفس مینجر نے مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر مجھے رخصت کیا۔ میں ایئرپورٹ آ گیا۔ تھوڑی دیر وہاں انتظار کرنا پڑا۔ جب میری فلائیٹ کے روانہ ہونے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تو میں نے بورڈنگ کارڈ لیا اور ٹرانزٹ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ فلائیٹ کی روانگی کے اعلان کے ساتھ ہی میں بھی دوسرے مسافروں کے ہمراہ چلتا ہوا ایئربس میں سوار ہو گیا۔ ایئربس مجورائی سے ٹیک آف کرنے کے بعد حیدر آباد دکن رکی۔ وہاں سے ٹیک آف کیا تو سیدھا بمبئی کا رخ کر لیا۔ سارا راستہ بارش ہوتی رہی۔ طیارہ بادلوں میں ہی سفر کرتا رہا اور اس نے کافی ہچکولے بھی کھائے۔ بمبئی کی ایئر پورٹ پر طیارے نے لینڈ کیا تو بمبئی میں بھی بارش ہو رہی تھی جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ بھارت کے تمام شہروں میں سے مجھے بمبئی کی بارش بہت پسند تھی۔

میں نے طیارے کی کھڑکی میں سے ایئرپورٹ کی عمارت اور رن وے کو بارش میں بھیگتے دیکھا تو جی چاہا کہ اس وقت کسی ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر بمبئی کی سڑکوں پر بارش کو گرتے دیکھنا چاہیے۔ طیارہ ایئرپورٹ ٹرمینل کی عمارت سے کچھ دور آ کر رک گیا تھا۔ سیڑھی لگی۔ ہم بارش میں بھیگتے نیچے اتر کر جلدی سے ایئر پورٹ کی بس میں سوار ہو گئے۔ بس نے ہمیں ٹرمینل کی عالی شان عمارت کے گیٹ پر پہنچا دیا۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا ایک اٹیچی کیس ہی تھا جو میرے ہاتھ میں تھا۔ میں لاؤنج سے نکل کر لابی

میں آیا تو ایک آدمی جنگلے کی دوسری جانب ہاتھ میں پلے کارڈ لیے کھڑا تھا۔ پلے کارڈ پر میرا نام دھرم چند لکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے بال ٹھاکرے نے بھیجا ہے۔ میں نے اس کے قرب جا کر کہا۔ "میرا نام دھرم چند ہے۔ کیا تمہیں بال ٹھاکرے جی نے بھیجا ہے۔"

اس آدمی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"ہاں مہاراج! گورو جی نے آپ کے لیے گاڑی بھیجی ہے۔ میرے ساتھ آیئے۔"

میں مزید خوش ہوا۔ بال ٹھاکرے کے دل پر واقعی میں نے اپنے اعتماد کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ باہر نکل کر اس نے چھتری کھول دی کیونکہ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ وہ مجھے چھتری کے سائے میں پارکنگ میں اس طرف لے گیا جہاں میں نے بال ٹھاکرے کی جدید ماڈل کی سرخ رنگ کی شاندار گاڑی کو پہچان لیا۔ وردی پوش شوفر سفید دستانے پہنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ میں بڑی شان سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شوفر نے بڑے آرام سے دروازہ بند کیا۔ پھر خود بھی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کا قیمتی انجن ہلکا سا غرایا اور گاڑی ایسے چل پڑی جیسے کشتی پرسکون دریا کی سطح پر چل رہی ہو۔ شوفر نے انڈین فلم کے گانے کی کیسٹ آن کر دی۔ گاڑی میں ہلکا ہلکا ایئرکنڈیشنر چل رہا تھا کیونکہ بمبئی میں بارش کی وجہ سے ہلکا حبس ہو رہا تھا۔ مجھے اس خیال سے تھوڑی حیرانی ضرور ہوئی کہ بال ٹھاکرے نے میرے لیے پہلے کبھی گاڑی نہیں بھیجی تھی اب کیا بات ہوئی ہے۔ پھر یہ سوچ کر دل کو اطمینان دلایا کہ بال ٹھاکرے مجھے کسی نہایت اہم مشن پر بھیجنے والا ہے اور یہ اس کے مجھ پر اعتماد اور بھروسے کا ایک مظاہرہ ہے۔ گاڑی بمبئی کی بارش میں بھیگتی سڑکوں پر بے معلوم آواز کے ساتھ دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے سر پیچھے لگا رکھا تھا۔ کسی وقت سرور میں آ کر آنکھیں بند بھی کر لیتا تھا۔ ایک بار آنکھیں بند کر کے کھولیں تو گاڑی بال

ٹھاکرے کے شاندار بنگلے میں داخل ہو رہی تھی۔

مجھے اسی وقت ملازم نے بال ٹھاکرے کے کمرے میں پہنچا دیا۔

شام کا وقت ہوگیا تھا بال ٹھاکرے اپنے ایک سیٹ والے شاندار صوفے پر دونوں بازو پھیلا کر راجے مہاراجوں کی طرح گردن اونچی کیے بیٹھا تھا۔ کانوں میں ہیرے چمک رہے تھے۔ انگلیوں میں زمرد و مرجان اور ہیروں کی انگوٹھیاں تھے۔ زعفرانی سلک کا چولا اور کھلا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ گلے میں زعفرانی سلک کا پٹکا تھا۔ ماتھے پر شیو دیوتا کے تلک کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ دائیں جانب شیشے کی تپائی پر بئیر کی بوتل' گلاس' ایش ٹرے اور سنہری سگریٹ کیس پڑا تھا۔ گلاس میں تھوڑی سی بئیر پڑی تھی۔ اس کے سامنے ایک طرف بالا جی راؤ بیٹھا مجھے پر اسرار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ یہ کم بخت یہاں کس لیے بیٹھا ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر بال ٹھاکرے کو پرنام کیا اور آگے بڑھ کر اس کے گھٹنوں کو چھوا اور بڑے ادب سے سامنے والے صوفے پر ذرا آگے ہو کر بیٹھ گیا۔

بال ٹھاکرے اپنی عادت کے مطابق کچھ دیر تک مجھے گھور کر دیکھتا رہا۔ لیکن آج اس کی سکڑی ہوئی آنکھوں میں مجھے کچھ اور ہی طرح کی چمک نظر آ رہی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے کسی آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ یہ خطرہ کیا تھا؟ اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ بال ٹھاکرے مجھے مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ پھر اس نے میرے چہرے پر سے نظریں ہٹا کر اپنے گلاس میں بئیر ڈالی۔ بوتل میز پر رکھی۔ بڑے سکون کے ساتھ اور بڑی نفاست کے ساتھ بئیر کا گلاس ہونٹوں تک لے جا کر اس کے تین چار گھونٹ پئے۔ سگریٹ کیس میں سے اعلیٰ قسم کا سگریٹ نکال کر سلگایا۔ کبھی وہ سگار پیتا تھا اور کبھی سگریٹ سے شوق کیا کرتا تھا۔ سگریٹ کا کش لگا کر اس نے بالا جی کی طرف دیکھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے اندر سے کسی نے کہا۔ حیدر علی بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ۔

اتنے میں بالا جی نے بال ٹھاکرے سے کہا۔

"گورو دیو! آپ ہی بات شروع کریں۔"

بال ٹھاکرے صوفے پر ذرا آگے ہو کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مجھ سے پوچھا۔

"دھرم چند! تم کب سے پاکستان کے لیے جاسوسی کر رہے ہو؟"

یہ جملہ نہیں ایٹم بم تھا جو میرے سر پر گر کر پھٹ گیا تھا۔ میرے کانوں میں دھماکے ہونے لگے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میرے پاؤں کے نیچے سے فرش نکل گیا تھا۔ میں جیسے ہوا میں لٹکنے لگا تھا۔ کانوں میں شاں شاں ہونے لگی تھی مگر میں نے بڑی جلدی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ یہ کیفیت مجھ پر چند سیکنڈ کے لیے ہی طاری رہی تھی۔ میں نے اپنے چہرے سے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اندر سے ہل گیا ہوں۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"سینا پتی جی! جس بات کا مجھے ڈر تھا آخر وہ ہو کر رہی۔ میں جانتا تھا کہ آپ مجھ پر جس اعتماد اور بھروسے کا سلوک کرنے لگے ہیں اس سے دوسرے لوگ ضرور حسد کریں گے اور آپ کے کان بھریں گے۔ گورو دیو! میں پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ سازش میرے دشمنوں کی ہے جو میرے ساتھ آپ کا محبت بھرا سلوک دیکھ کر جلنے لگے ہیں۔ وہ مجھے آپ کی نظروں میں ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔"

بال ٹھاکرے نے بالا جی راؤ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بالا جی! میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا کہ دھرم چند ڈبل ایجنٹ نہیں ہے۔ وہ بھارت ماتا سے غداری نہیں کر سکتا بولو۔ دھرم چند کی اس وضاحت کے بعد تم کیا کہتے ہو۔"

بالا جی راؤ نے کہا۔

"پیشوا جی! یہ شخص جھوٹا اور مکار ہے۔"

بالا جی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"تم ڈبل ایجنٹ بھی نہیں ہو تم پاکستان کے جاسوس اور بھارت میں رہ کر بھارت کے خلاف تخریب کاریاں کر رہے ہو۔ یہ تم ہی تھے جس نے ہمارے تربیت یافتہ دہشت گردوں کو پاکستان میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنایا۔ یہ تم ہی تھے جس نے جالندھر کے میزائیل سینٹر میں خوفناک دھماکہ کر کے ہمارے سارے میزائیلوں کو بھک سے اڑا دیا۔ تم نے ہی اکھنور کے مورچوں کی توپوں اور مشکر میزائیلوں کو تباہ کیا اور پورے ٹیلے کو فوجی جوانوں سمیت بھسم کر دیا۔ یہ تم ہی تھے جس نے بھارت سے پاکستان سمگل کی جانے والی ایڈز زدہ طوائفوں کو بمبئی میں قتل کر دیا تھا تاکہ وہ پاکستان جا کر ایڈز کی بیماری نہ پھیلا سکیں۔ سورت میں مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگانے والے تینوں مراٹھوں کو تم نے ہی جالندھر کے شیومندر میں قتل کیا اور یہ تم ہی ہو جس نے منڈاپم کیمپ میں سٹیمر کو بم لگا کر غرق کیا اور سارے تامل گوریلوں اور انسٹرکٹر کو موت کی نیند سلایا بولو اس بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"
بال ٹھاکرے نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
"ہاں دھرم چند! بولو۔ اس بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"
میں اپنی جگہ سے ہل ضرور گیا تھا مگر ایک بات کا مجھے اطمینان تھا کہ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ میں دھرم چند نہیں ہوں بلکہ محب وطن پاکستانی مسلمان ہوں اور دھرم چند کا حلیہ بنا کر بھارت میں آیا ہوا ہوں۔ میں نے بڑے اعتماد سے بال ٹھاکرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"گورودیو! یہ سب جھوٹ ہے۔ مجھ پر بہتان لگایا جا رہا ہے۔ بالا جی راؤ سے پوچھا جائے کہ اس کے پاس مجھے پاکستان کا جاسوس ثابت کرنے کے لیے کیا ثبوت ہے؟"
بال ٹھاکرے نے بالا جی

"راؤ جو الزام تم نے دھرم چند پر لگائے ہیں کیا ان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟ اگر ثبوت ہے تو پیش کرو۔"

بالا جی راؤ کے پاس بھلا کیا ثبوت ہو سکتا تھا۔ میں نے جتنے بھی کمانڈو آپریشن کیے تھے بڑے سوچ سمجھ کر کیے تھے اور پیچھے ان کا ایک بھی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ بالا جی راؤ نے کھسیانا ہو کر کہا۔

"گورو دیو! اگر آپ کوئی ایسا ثبوت مانگتے ہیں جو تحریری شکل میں ہو تو مجھے افسوس ہے کہ ایسا کوئی ثبوت میرے پاس نہیں ہے لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ دھرم چند ڈبل ایجنٹ ہے۔ یہ پاکستان کے لیے بھی جاسوسی کر رہا ہے۔"

میں نے بالا جی راؤ کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"راؤ جی! میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو میرے ساتھ کیوں دشمنی ہو گئی ہے۔ آپ مجھے گورو دیو کی نگاہوں میں گرانے کے لیے موقع ڈھونڈتے رہتے ہیں جبکہ گورو دیو ٹھاکرے جی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں دیش بھگت ہوں۔ بھارت کا سپوت ہوں اور پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا تو آپ کو مجھ پر پاکستان کا جاسوس ہونے کا الزام لگاتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔"

باتیں کرتے کرتے میں نے بال ٹھاکرے کی طرف دیکھا تو وہ آنکھیں سکیڑ کر بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ انداز میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ جب میں نے اپنا بیان ختم کیا تو بال ٹھاکرے نے بیئر کے دو گھونٹ پیئے۔ دوسرا سگریٹ سلگایا اور بالا جی راؤ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بالا جی! اس کا مطلب ہے کہ دھرم چند کو پاکستانی جاسوس ثابت کرنے کے لیے تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

بالا جی راؤ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! میرے پاس تو ایسا کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے اگر آپ کے پاس کوئی ثبوت ہو تو وہ دھرم چند کو بتا دیجئے۔"

بالا جی راؤ کے اس جملے پر میں چونک گیا۔ اس جملے کے اندر جو معنی چھپے ہوئے تھے وہ میری سمجھ میں نہ آئے۔ بال ٹھاکرے کے پاس میرے خلاف کیا ثبوت ہو سکتا تھا۔ میں ابھی اسی الجھن میں تھا کہ بال ٹھاکرے نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس کوئی تحریری ثبوت تو نہیں ہے جو دھرم چند کو پاکستانی جاسوس ثابت کر سکے۔ ہاں البتہ ایک چلتا پھرتا زندہ ثبوت ضرور ہے۔"

میرے بدن میں شدید خطرے کے احساس کی سرد لہر سر سے پاؤں تک دوڑ گئی۔ بال ٹھاکرے کیا کہہ رہا تھا؟ میرے خلاف چلتا پھرتا زندہ ثبوت کیا ہو سکتا تھا۔

بال ٹھاکرے نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازے میں ایک نوکر پہلے سے کھڑا تھا۔ بال ٹھاکرے کا اشارہ پاتے ہی نوکر پردہ ہٹا کر دوسری طرف چلا گیا۔ میں عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ دوسرے لمحے پردہ ہٹا اور کیا دیکھتا ہوں اصلی دھرم چند کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دونوں جانب شیوسینا کے رضاکار ہاتھوں میں کلاشنکوفیں لیے آ رہے تھے۔

اصلی دھرم چند کو دیکھتے ہی میرا بدن دہشت اور خوف سے سرد پڑ گیا۔ سارے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس زندہ ثبوت کو رد کرنے کے لیے میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔

اصلی دھرم چند نے بال ٹھاکرے کے گھٹنوں کو چھوا اور ایک طرف کھڑا ہو کر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ بال ٹھاکرے نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اصلی دھرم چند سے پوچھا۔

"کیوں دھرم چند! بالکل تمہارا حلیہ نہیں ہے؟"

اصلی دھرم چند نے حیرانی کے ساتھ کہا۔
"گورو جی! میں خود حیران ہوں کہ میں یہاں کھڑا ہوں کہ آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں۔"

مجھے اس حقیقت کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اصلی دھرم چند پاکستان کی پولیس کو دھوکہ دے کر قید سے فرار ہونے اور باڈر کراس کر کے بھارت میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اتنی دیر میں میں نے بھی اپنے حواس پر بہت حد تک قابو پا لیا تھا۔ بالا جی راؤ نے غصیلی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"اتنے بڑے زندہ جیتے جاگتے ثبوت کو تم کس طرح غلط ثابت کر سکتے ہو۔ اصلی دھرم چند تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ تم نقلی دھرم چند ہو۔ جب اصلی دھرم چند پاکستان میں پکڑا گیا تو تمہاری پلاسٹک سرجری کر کے تمہیں ہوبہو اصلی دھرم چند کا حلیہ دے کر جاسوسی کرنے کے لیے بھارت سمگل کر دیا گیا اور تم نے ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور اب تک پہنچا رہے ہو۔ اگر ہمارا اصلی دھرم چند پاکستانی جیل سے فرار ہو کر بارڈر کراس کر کے بھارت نہ پہنچتا تو نہ جانے تم کب تک بھارت میں تباہی پھیلاتے رہتے۔"

میں نے اپنے اعتما کو ایک مرکز پر جمع کرتے ہوئے بڑے پر جوش لہجے میں کہا۔

"گورودیو! یہ شخص اصلی دھرم چند نہیں ہے۔ یہ نقلی دھرم چند ہے اور اس کی پلاسٹک سرجری کر کے پاکستان نے بھارت میں جاسوسی کے لیے سمگل کیا ہے۔ یقین کریں اصلی دھرم چند میں ہوں۔"

جوش اور جذبات میں آ کر میں نے یہ دعویٰ تو کر دیا تھا لیکن اس حقیقت کو بھول گیا تھا کہ میرے اس دعوے کا پول ایک سیکنڈ میں کھل سکتا ہے۔ بس ذرا میرا پاجامہ اتروا کر میرے ختنے دیکھنے کی تکلیف کرنی پڑنی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بالا جی راؤ نے بال ٹھاکرے سے کہا۔

"گورو دیو! یہ شخص تو کہتا ہے کہ میں اصلی دھرم چند ہوں اور جو سامنے کھڑا ہے وہ نقلی دھرم چند ہے۔ اب اس کا پتہ کیسے چلے کہ اصلی کون ہے اور نقلی کون ہے؟"

بال ٹھاکرے نے کہا۔

"دونوں کے پاجامے اتروا کر دیکھو۔ پہلے اس کا پاجامہ اترواؤ۔ اگر یہ اصلی دھرم چند ہے تو اس کے مسلمانوں والے ختنے نہیں ہوئے ہوں گے۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اس وقت میری حالت پھانسی کی کوٹھڑی میں بند اس قیدی کی سی تھی جس کو پھانسی کے تختے پر لے جانے کے لیے جیل کے عہدے دار کوٹھڑی میں آ گئے ہوں۔ بال ٹھاکرے نے اشارہ کیا۔ اس کا ملازم تیزی سے میری طرف آیا اور اس نے میرا پاجامہ نیچے کر دیا۔ میرا یہ راز سب پر کھل گیا کہ میں مسلمان ہوں اور نقلی دھرم چند ہوں۔ اس کے بعد اصلی دھرم چند کا بھی معائنہ کیا گیا۔ اس کے ختنے نہیں ہوئے تھے۔ بال ٹھاکرے نے میری طرف قہر آلود نظریں ڈالیں اور مراٹھی میں دو تین گالیاں دے کر گرج دار آواز میں کہا۔

"اب تم کیا کہتے ہو؟ تم ہمارے ملک کو اتنا نقصان پہنچا چکے ہو کہ بڑی سے بڑی سزا بھی تمہارے لیے کم ہوگی۔ لیکن میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو گے۔ تم اپنے آپ کو مرتے خود دیکھو گے۔

درد اور کرب سے گذرتے ہوئے
میں نے دیکھا ہے خود کو مرتے ہوئے

بتاؤ تمہارا اصلی نام کیا ہے اور یہاں تمہارے دوسرے پاکستانی ساتھی کہاں ہیں؟"

میرے آگے پیچھے دائیں بائیں پتھر کی اونچی اونچی دیواریں تھیں فرار کا راستہ نہیں تھا۔ دونوں شیو سینا کے رضاکاروں نے کلاشنکوفوں کی نالیوں کا میری طرف کیا ہوا تھا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے اور کہا۔

"ٹھاکرے جی! آپ مجھے جتنی چاہے اذیتیں دے کر دیکھ لیں میں آپ

تو اپنا اصلی نام بتاؤں گا اور نہ یہ بتاؤں گا کہ بھارت میں میرے ساتھی کہاں کہاں پر موجود ہیں۔ آپ مجھے ٹارچر دے کر زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ میں مر جاؤں تو یاد رکھیں ایک سچا مسلمان کافروں سے جہاد کرتے موت کو ہنسی خوشی اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔ میں مسلمان ہوں' محب وطن پاکستانی ہوں۔ آپ لوگ میرے ملک کو تباہ کرنے کی کارروائیاں کرتے آ رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا وہی کیا جو ایسی حالت میں ایک محب وطن پاکستانی کو کرنا چاہیے۔ میں نے آپ کے ملک میں کسی بے گناہ کو نہیں مارا۔ کسی عورت بچے بوڑھے پر ظلم نہیں کیا۔ میں نے ان لوگوں کو ہلاک کیا ہے جو میرے وطن کے دشمن ہیں جو میرے وطن پاکستان کو تباہ کرنے کی ناپاک کارروائیوں میں ملوث تھے۔ میرا ضمیر صاف ہے۔"

بال ٹھاکرے اور بالا جی راؤ کے چہرے غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔ اصلی دھرم چند نے کہا۔

"گورو دیو! اسے میرے حوالے کر دیں میں اسے خود قتل کروں گا۔"

بال ٹھاکرے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں دھرم چند! اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ میرا قاتل ہے۔ اس کو میں خود سزا دوں گا۔ میں اسے ایسی سزا دوں گا کہ یہ موت کی دعائیں مانگے گا مگر اسے موت نہیں آئے گی۔ اس کو باندھ کر لے جاؤ۔"

بال ٹھاکرے نے شیوسینا کے رضاکاروں کو حکم دیا۔ اسی وقت میرے دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے کر کے باندھ دیے گئے اور سیوسینا کے آدمی مجھے دھکے دیتے کمرے سے باہر لے گئے۔ دوسرے کمرے میں شیوسینا کے دو مسلح رضاکار پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں پر کالے کپڑے کی پٹی باندھ دی گئی اور مجھے کھینچتے ہوئے کسی طرف سے کوٹھی کے باہر لے جا کر ایک گاڑی میں دھکیل دیا گیا۔ دونوں جانب مسلح گارڈ بیٹھ گئے اور گاڑی کسی نامعلوم مقام کی طرف چل پڑی۔

خدا جانے یہ گاڑی جس میں مجھے قیدی کی حیثیت سے جکڑ کر بٹھا دیا گیا تھ کہاں کہاں سے گزر رہی تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ باہر سڑک پر سے دوسری گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیر ضرور سنائی دے رہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں بھی آنا بند ہوگئیں۔ گاڑی بمبئی شہ کے باہر کے علاقے میں آ گئی تھی۔ گاڑی ایک جگہ سے سڑک کی چڑھائی چڑھ کر نیچے آ گئی۔ اس کے بعد گاڑی نے کئی موڑ کاٹے اور پھر ایک طرف کو گھوم کر رک گئی۔ مجھے اتار کر ایک کمرے میں لے گئے۔ دروازہ بند کرنے کی آوا: آئی۔ پھر میری آنکھوں کی پٹی کھلوا دی گئی۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک چھوٹے سے کمرے میں ہوں جس کی دیواریں بالکل خالی تھیں۔ چھت زیادہ اونچی نہیر تھی۔ میں بانس کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ چھت کے ساتھ دیوار میں اوپر کر کے ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس میں لوہے کی سلاخوں والا جنگلا چڑھا ہوا تھا۔

مجھے اس قید خانے میں بند کر کے شیو سینا کے آدمی چلے گئے۔ مجھے باہر سے دروازے پر تالا لگانے کی آواز آئی۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ درواز لوہے کا تھا۔ اس میں کوئی درز یا سوراخ نہیں تھا۔ میں نے کمرے کے وسط میر کھڑے ہو کر روشندان کا جائزہ لیا ایک تو روشندان پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیر دوسرے وہ اتنا چھوٹا تھا کہ میرا جسم سلاخیں توڑنے کے بعد بھی اس میں سے نہیں گزر سکتا تھا۔ اس کمرے میں مجھے اذیتیں دینے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اذیتیر دینے والے ایسے لوگ تھے جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھ سے میرے دوسرے پاکستانی ساتھی جاسوسوں اور کشمیری مجاہدوں کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں پوچھا جاتا۔ میرا وہاں کوئی پاکستانی جاسوس ساتھی بالکل نہیں تھا۔ باقی ج کشمیری مجاہد شمالی بھارت کے شہروں میں اپنے اپنے طور پر جہاد کشمیر کے لیے کا کر رہے تھے ان کے خفیہ ٹھکانے دو تین ہی تھے جن کا مجھے علم تھا لیکن میں ا

ٹھکانوں کے بارے میں ان دشمنوں کو کبھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں اور کس جگہ پر ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو ہر قسم کی اذیتیں سہنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور سخت اذیتیں دے کر ہلاک کریں گے۔ میں نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ مر جاؤں گا مگر کشمیری مجاہدوں کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے وہاں سے فرار ہونے کے امکانات پر بھی سوچنا شروع کر دیا تھا مگر بظاہر وہاں سے فرار کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مجھے چوبیس گھنٹے اس تنگ سے کمرے کے اندر ہی رکھا جاتا تھا۔ باہر ہر وقت دو آدمی کلاشنکوفیں اٹھائے پہرے پر موجود ہوتے تھے اور دروازے پر باہر سے تالا لگا دیا جاتا تھا۔ جب ٹارچر کرنے والے مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آتے تو دروازے کو کھول کر اسی وقت دوبارہ تالا لگا دیا جاتا تھا۔ انٹیروگیشن کرنے والوں کے ساتھ ہی چار مسلح گارڈ ہوتے تھے جو دروازے میں داخل ہوتے ہی پوزیشنیں لے کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ جو لوگ مجھے ٹارچر کرنے اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آتے تھے ان میں پولیس یا ملٹری کا کوئی آدمی نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ سویلین کپڑے میں ہوتے تھے اور ان کے ماتھوں پر شیوسینا کے تلک لگے ہوئے تھے جو یہ ثابت کرتے تھے کہ ان لوگوں کا تعلق شیوسینا کی مسلم دشمن تنظیم سے ہے اور پولیس یا ملٹری انٹیلی جینس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ بال ٹھاکرے نے میرے پاکستانی جاسوس ثابت ہو جانے کے سنگین واقعے سے پولیس، خفیہ پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس کو بے خبر رکھا تھا۔ کیونکہ اس میں بال ٹھاکرے کی سخت بدنامی کا پہلو نکلتا تھا کہ ایک پاکستانی جاسوس بال ٹھاکرے کی گود میں بیٹھ کر اس کا آشیرباد حاصل کر کے بھارت کی فوجی تنصیبوں کو تباہ کرتا رہا اور بال ٹھاکرے کو علم تک نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے

مجھے شیوسینا کی فوجی تنظیم کے حوالے کر دیا تھا تاکہ مجھ سے جس قدر معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں کی جائیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ بال ٹھاکرے کے پاس ایسے وسائل لا محدود تھے وہ جس مسلمان کو چاہے راتوں رات غائب کروا سکتا تھا۔ وہ بھارت کا فرعون تھا۔ وہ مجھے قتل بھی کروا دیتا تو کسی کو خبر تک نہیں ہو سکتی تھی اور اس نے میرے بارے میں یہی فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اسنے خود مجھے بتا دیا تھا کہ میں تمہیں اس طرح ماروں گا کہ تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کی دعائیں مانگو گے اور تمہیں موت نہیں آئے گی۔

میں اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ لاہور میں بیٹھے ہوئے بٹ صاحب اور ملک صاحب سے کون سی ایسی غفلت ہو گئی تھی کہ اصلی دھرم چند ان کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ تجربہ کار کمانڈو اور دہشت گرد بڑے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ وہ قید میں رہ کر بھی ہر وقت وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی دہشت گرد اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اصلی دھرم چند بھی فرار ہو گیا تھا۔ بال ٹھاکرے کے پاس اصلی دھرم چند موجود تھا۔ اسے پولیس کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ ایک نقلی دھرم چند بھی پکڑا گیا ہے۔ اس میں بال ٹھاکرے کی بے عزتی تھی۔ اس کا اثر اس کے سیاسی کیریئر پر پڑ سکتا تھا۔ اس کی بنی بنائی ساکھ تباہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے میرے معاملے کو وہیں دبا دیا تھا اور اب مجھے ہلاک کر کے دبانے کی فکر میں تھا جو وہ جب اور جس وقت چاہے کر سکتا تھا۔ میں نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ میرا ایمان تھا کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میری زندگی لکھی ہوئی ہے تو بال ٹھاکرے کا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں فرار کے مختلف منصوبوں پر مسلسل غور کرتا رہتا تھا مگر کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اس دوران میرے پاس بال ٹھاکرے یا بالاجی راؤ یا منوویسانی میں سے کوئی

نہیں آیا تھا۔ مجھے ان لوگوں نے ہر قسم کے ٹارچر' ہر قسم کی اذیتوں کا نشانہ بنایا۔ میرے جسم پر زخموں اور جلے ہوئے زخموں کے جگہ جگہ نشان پڑ گئے تھے۔ میں شدید تکلیف میں چیخنے بھی لگتا تھا۔ آخر انسان تھا۔ مجھے اذیتیں برداشت کرنے کی ایسی کوئی تربیت نہیں دی گئی تھی جو عام طور پر کمانڈوز کو دی جاتی ہے۔ میری ایک آنکھ سوج گئی تھی۔ جسم کے نازک حصے بجلی کے جھٹکے کھا کھا کر سن ہو گئے تھے۔ ایک دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ناخن زخمی ہو گئے تھے۔ مگر میں نے اذیت کے شدید لمحوں میں بھی اپنی زبان نہیں کھولی تھی۔ صرف اپنا نام حیدر علی بتا دیا تھا کیونکہ اپنا نام بتانے میں کوئی ہرج نہیں تھا لیکن کسی کشمیری مجاہد یا کشمیری کمانڈو کا نام تک زبان پر نہیں لایا تھا نہ ان کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ میں ایک ہی جملہ بولتا تھا کہ مجھے پاکستان نے جاسوسی کے لیے بھارت نہیں بھیجا۔ میں اپنے طور پر پاکستان کے دشمنوں سے جنگ کرنے آیا تھا۔ میرا کسی کشمیری مجاہد سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔

مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس کمرے میں مجھے کتنے دن کتنی راتیں گزر چکی ہیں۔ صبح سے شام تک مجھ پر تشدد کیا جاتا تھا جب اس تشدد کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو مجھے ہمیشہ کی نیند سلانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس فیصلے سے مجھے اس آدمی نے آگاہ کیا جو لوہے کے دروازے کے نیچے سے مجھے باسی چاولوں کی طرف پکڑایا کرتا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ اس آدمی نے مجھے یہ بات کیوں بتائی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے مرنے سے پہلے موت کی اذیت میں مبتلا کرنا چاہتا ہو۔ کیونکہ وہاں میرے سبھی دشمن تھے۔ دوست کوئی نہیں تھا۔

میری جسمانی حالت کمزور ہو گئی تھی۔ صرف اپنی قوت ارادی اور ایمان کی قوت پر زندہ تھا۔ روشندان میں سے مجھے صرف دن کی روشنی طلوع ہوتے اور غروب ہوتے نظر آ جاتی تھی۔ کچھ دن میں نے دنوں کا حساب رکھا۔ پھر اذیتوں اور ٹارچر کی وجہ سے میں اس حساب کو یاد نہ رکھ سکا۔ کمرے کی بتی ہر وقت

جلتی رہتی تھی لوہے کے بند دروازے کی چھوٹی سی کھڑکی کی سلاخوں میں سے باہر پہرے پر کھڑے شیو سینا کے آدمی مجھے کبھی کبھی ایک نظر دیکھ لیتے تھے۔ اچانک مجھ پر تشدد کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ میں سارا دن فرش پر پڑا رہتا۔ اس حالت میں شاید دو یا تین دن گزرے ہوں گے۔ میں ننگے فرش پر پڑا تھا کہ لوہے کا دروازہ کھلا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ دروازے میں بالا جی راؤ اور بال ٹھاکرے کھڑے تھے۔ ان کے دائیں بائیں دو باڈی گارڈ موجود تھے۔ بال ٹھاکرے نے بالا جی راؤ سے کہا۔

"اس کو ڈیتھ چیمبر میں لے چلو۔"

یہ کہہ کر بال ٹھاکرے باہر نکل گیا۔ بالا جی راؤ نے اپنے مسلح گارڈز کو جو ان کے ساتھ آئے تھے اشارہ کیا اور وہ بھی بال ٹھاکرے کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گیا۔ ڈیتھ چیمبر کا نام سنتے ہی میں سمجھ گیا کہ اب کھیل ختم ہو گیا ہے۔ بال ٹھاکرے خود اسی لیے آیا ہے کہ مجھے اپنے سامنے مرتا دیکھے۔ وہاں مجھے سوائے خدا کے اب کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ میرے سامنے زندہ رہنے کی ایک ہی آخری امید تھی کہ اگر خدا نے میری موت نہیں لکھی تو میں نہیں مروں گا۔ اگر لکھی ہوئی ہے تو پھر مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں نے اپنے آپ کو مرنے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ جتنی قرآن پاک کی آیتیں یاد تھیں وہ دل میں پڑھنے لگا۔

بال ٹھاکرے کے مسلح گارڈز نے پہلے میرے ہاتھ پیچھے باندھے پھر دونوں پاؤں رسی سے اس طرح باندھے کہ میں نہ دوڑ سکتا تھا نہ لمبے لمبے ڈگ بھر سکتا تھا۔ بس چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چل سکتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر ان کے درمیان چلنے لگا۔ کمرے کے باہر ایک تنگ راہ داری تھی۔ تنگ راہ داری میں پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے آئے۔ اس کمرے میں چھت کے ساتھ ایک بلب روشن تھا جس چیز نے میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑا دی

وہ لوہے کی ایک کرسی تھی جو کمرے کے وسط میں ایک چھوٹے سے چبوترے پر رکھی تھی۔ پیچھے دیوار کے ساتھ ایک میز لگی تھی جس پر مختلف دوائیوں کی شیشیاں تھیں اور ٹیکہ لگانے والے چھوٹے بڑے سرنج بھی پڑے تھے۔ مجھے کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ کرسی لوہے کے بولٹوں سے چبوترے میں فکس تھی۔ یعنی وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی تھی۔ کرسی کے بازوؤں اور پشت کے اوپر بھی چمڑے کی چوڑی بیلٹیں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے انگریزی فلموں میں دیکھی ہوئی وہ کرسی یاد آ گئی جس پر بٹھا کر موت کی سزا پانے والوں کو بجلی کے جھٹکے دے کر مارا جاتا تھا۔

جیسے ہی میں کرسی پر بیٹھا میرے بازوؤں کو چمڑے کی بیلٹ سے باندھ دیا گیا۔ میرا سر پیچھے لگا کر چمڑے کی پٹی سے کس کر باندھ دیا گیا۔ اسی طرح میرے دونوں پاؤں کو بھی چمڑے کے پٹوں سے کس کا باندھ دیا گیا۔ اب میں نہ اپنا سر ہلا سکتا تھا۔ نہ بازو ہلا سکتا تھا اور نہ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ اتنے میں کمرے میں بال ٹھاکرے اور بالا جی راؤ آ گئے۔ ان کے لیے دو کرسیاں میرے بالکل سامنے دیوار کے ساتھ لگا دی گئی تھیں۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے بال ٹھاکرے نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ملیچھ! مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ اذیت ناک سزائے موت تمہارے لیے تلاش نہیں کر سکا۔ تمہیں ایک ایسے زہر کا انجکشن لگایا جائے گا جس کے اثر سے تم ایک دم نہیں مرو گے۔ تم بے ہوش ہو جاؤ گے۔ تمہیں اس وقت ہوش آئے گا جب تم ہزاروں من مٹی کے نیچے اپنی قبر میں پڑے ہو گے۔ تم دس منٹ تک ہوش میں رہو گے تمہارے جسم پر کیڑے رینگ رہے ہوں گے۔ چیونٹیاں اور کیڑے تمہارے جسم کو کاٹ رہے ہوں گے۔ اس زہر کے اثر سے تم ہوش میں ہوگے مگر اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکو گے۔ دس منٹ تک یہ اذیت برداشت کرتے رہو گے جب کہ قبر کے اندر آکسیجن بھی کم ہو رہی

ہو گی۔ دس منٹ بعد تم پھر بے ہوش ہو جاؤ گے۔ اب زہر کے دوسرے مرحلے کا اثر شروع ہو گا جو اس قدر شدید ہو گا کہ تمہارا جسم پھٹنا شروع ہو جائے گا۔ تم بے ہوش ضرور ہو گے۔ اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکو گے لیکن جسم کے پھٹنے اور بند بند الگ ہونے کی اذیت تمہیں ضرور محسوس ہو گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ اذیت دے کر تمہیں نہیں مار سکتا۔"

بال ٹھاکرے نے مسلح گارڈ کو اشارہ کیا۔ ایک گارڈ فوراً باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی تھے جنہوں نے ڈاکٹروں والے لمبے سفید کوٹ پہن رکھے تھے۔ ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ آتے ہی میری کرسی کے پیچھے جو دوائیوں اور ٹیکہ لگانے والے سرنجوں کی میز تھی اس طرف چلے گئے۔ کوئی دو منٹ کے بعد دونوں ڈاکٹر میری کرسی کے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر نے میرے بازو پر کہنی سے اوپر کر کے چھوٹی سی رسی کس کر باندھ دی جس سے میرے کلائی کے قریب بازو کی رگیں پھول گئیں۔ دوسرے ڈاکٹر کے ہاتھ میں انجکشن لگانے والی لمبی سرنج تھی۔ اس نے جھک کر میرے بازو کی ایک خاص پھولی ہوئی رگ کو ہاتھ سے دو تین بار دبایا پھر انجکشن کی سوئی پھولی ہوئی رگ کے اوپر رکھ کر اسے رگ میں داخل کر دیا۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس وقت مجھ پر موت کا خوف طاری تھا۔ مجھے سوئی کے چبھنے کا ہلکا سا درد ہوا اس کے بعد جیسے جیسے انجکشن میں بھرا ہوا زہر میرے جسم کے اندر سرایت کرتا گیا مجھ پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میں نے دنیا کی جو آخری آواز سنی وہ جے بجرنگ بلی کا نعرہ تھا جو یقیناً بالا جی راؤ نے لگایا تھا۔

اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ کچھ پتہ نہیں میں کب تک بے ہوش رہا اور کب ان لوگوں نے میری لاش کو اس قبر میں دفن کیا جو میرے لیے پہلے سے کھود کر تیار ہو چکی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں گھپ اندھیرے میں

سیدھا پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹولا میں قبر میں بند تھا۔ قبر کی چھت میرے سر سے کوئی ایک فٹ اونچی تھی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ چھت سیمنٹ کی تھی یعنی مجھے قبر میں دفن کرنے کے بعد ان لوگوں نے چھت پر لینٹر ڈال کر اسے بند کر دیا تھا۔ یقین کریں مجھے اس قدر خوف اور دہشت محسوس ہوئی کہ میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ مگر وہاں میری چیخ سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میرے پاؤں اور پنڈلیوں پر کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔ میں نے ٹانگیں اوپر اٹھانی چاہیں لیکن میرے گھٹنے قبر کی چھت کے لینٹر سے ٹکرائے۔ میں نے گڑگڑا کر خدا سے دعا کی یا خدا! مجھے موت عطا کر دے۔ مجھے موت دے دے۔ مجھے اپنی بیوی زیب النساء یاد آگئی اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ قبر میں اس قدر گھٹن تھی کہ میرا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور روتے ہوئے اپنی مرحوم بیوی زیب النساء کی روح سے فریاد کی۔ زیب النساء میری پیار بیوی۔ خدا کے آگے میری سفارش کر دے تاکہ مجھے موت آجائے۔ مجھے اپنے پاس بلا لے مجھے اپنے پاس بلا لے۔ زیب النساء! مجھے اپنے پاس بلا لے۔ میں روتا رہا، روتا رہا اور روتے روتے مجھ پر ایک بار پھر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میرا جسم اس خیال سے کانپ اٹھا کہ اب زہر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگا اور میرا جسم پھٹنا شروع ہو جائے گا۔"

میں ایک بار پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔

اب جو مجھے ہوش آیا تو مجھے بال ٹھاکرے کا جملہ یاد آگیا۔ اس نے کہا تھا کہ دوسری بار جب تمہیں ہوش آئے گا تو تمہارے جسم کا گوشت پھٹنا شروع ہو جائے گا۔ تمہیں اتنا ہوش ہوگا کہ جسم کے پھٹنے اور بند بند کے ٹوٹنے کی اذیت کو محسوس کرو گے مگر اپنے ہاتھ پیر نہیں ہلا سکو گے۔ یہ زہریلے ٹیکے کے دوسرے مرحلے کا اثر ہوگا۔ اس کے بعد تم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہو جاؤ گے۔ مجھ پر خوف کے مارے لرزہ طاری تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میرا جسم واقعی پھٹنا

شروع ہوگیا ہے۔ مجھے جسم کے پھٹنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے چیخ مار کر کہا۔

"یا اللہ پاک! مجھے اٹھا لے۔ مجھے اس اذیت سے نجات دے دے۔"

میں نے بے خیالی میں اپنا ہاتھ اپنے سینے کی طرف اٹھایا تو میرا ہاتھ اوپر کو اٹھ آیا جب کہ بال ٹھاکرے نے کہا تھا کہ زہر کے اثر کے دوسرے مرحلے میں تم اپنے جسم کو حرکت نہیں دے سکو گے۔ میرے کانوں میں ایک عجیب سے آواز آ رہی تھی۔ میں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا میرا جسم بالکل ٹھیک تھا۔ صرف قبر کی آکسیجن اتنی کم ہوگئی تھی کہ پورا منہ کھول کر بھی سانس لینے میں مجھے تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ اگر یہ میرے جسم کے پھٹنے کی آواز نہیں تھی تو پھر یہ کیسی آواز تھی؟

میں نے غور سے سنا۔ آواز قبر کے سرہانے کی جانب سے یعنی جس طرف میرا سر تھا اس طرف سے آ رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے قبر کے سرہانے کی جانب کوئی قبر کو کھود رہا ہے۔ میں پورا منہ کھولے سانس لے رہا تھا۔ قبر کی آکسیجن ختم ہو رہی تھی قبر کو کھودنے کی آواز میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ کوئی جلدی جلدی کھرپا چلا رہا تھا۔ اچانک مجھے اپنے سر کے پیچھے کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کی لکیر سی آتی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سانس لینے میں جو دقت ہو رہی تھی اس میں کمی ہونے لگی۔ ٹھنڈی ہوا کی لکیر جھونکے میں بدل گئی۔ اب کھرپا نہیں چل رہا تھا۔ کوئی دونوں ہاتھوں سے مٹی پیچھے کھینچ رہا تھا۔ مجھے سر کے پیچھے سے اب تازہ ہوا آنے لگی تھی۔ میرا سانس ٹھیک ہو رہا تھا۔ اچانک میرے سر کے اوپر سے روشنی کی کرنیں قبر کے اندر آنے لگیں۔ کسی نے ٹارچ جلا کر قبر میں دیکھا تھا۔ مٹی دوبارہ کھودی جانے لگی۔ میرے سر کے اوپر مٹی گرنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اپنے سر پر کسی انسان کی انگلیاں لگیں۔ ساتھ ہی باہر سے کسی نے اردو زبان میں پوچھا۔

"زندہ ہو؟"

میں نے جسم کا سارا زور لگا کر کہا۔

"ہاں میں زندہ ہوں۔"

"فکر نہ کرو ایسے ہی لیٹے رہو۔"

تھوڑی دیر بعد میرے سرہانے کی طرف کافی بڑا سوراخ بن گیا اور اس

آدمی کی آواز آئی۔

"اپنے بازو مجھے پکڑا دو۔"

میں نے دونوں بازو سینے کے اوپر سے لے جا کر پیچھے کر دیے۔ شگاف کے اندر ایک طرف ایک آدمی نے اور دوسری طرف دوسرے آدمی نے میرے بازو پکڑے اور آہستہ آہستہ مجھے قبر سے باہر کھینچنا شروع کیا۔ سب سے پہلے میرا سر قبر کے سرنگ نما شگاف میں سے گزر کر باہر نکلا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ باہر رات کی تاریکی میں مجھے اپنے اوپر دو آدمیوں کے سائے نظر آئے۔ انہوں نے مجھے باہر کھینچ لیا۔ وہاں دو اور آدمی بھی تھے۔ انہوں نے مجھے زمین پر بٹھا دیا اور میری پیٹھ پر زور زور سے ہاتھوں کی مالش کرنی شروع کر دی۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں قبر میں سے زندہ نکل آیا ہوں۔

میرا سر ڈول رہا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر اپنے محسنوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں مجھے ان کے چہرے کالی چادروں میں چھپے ہوئے نظر آئے۔ میرا سر اپنے آپ ایک طرف کو جھک گیا۔ دوسرے دو آدمی بھی قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"اسے جلدی سے گاڑی میں ڈال کر لے چلو۔"

دو آدمیوں نے مجھے اٹھا کر کھڑا کیا اور پوچھا۔ "کیا تم چل سکتے ہو؟"

میں نے قدم آگے بڑھایا اور نحیف آواز میں کہا۔

"چل سکتا ہوں۔"

وہ مجھے آہستہ آہستہ سہارا دے کر اپنے ساتھ چلانے لگے دو آدمی آگے آگے چل رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے رک کر کہا۔

"دیر مت لگاؤ۔"

وہ بڑی صاف اردو بول رہے تھے۔ یہ زبان بمبئی کے لوگوں کی زبان نہیں

تھی۔ میں اب تک اس معمے کو نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ مجھے تو زہر دیا گیا تھا اور زہر بھی ایسا کہ جس سے بچنا ناممکن تھا اور بال ٹھاکرے کی موجودگی میں مجھے زہر کا ٹیکہ لگایا گیا تھا۔ باہر رات کا وقت تھا۔ تازہ ہوا میں آنے سے میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہو رہے تھے میں نے کہا۔

"میں تیز چل سکتا ہوں۔"

جن دو آدمیوں نے مجھے سہارا دیا ہوا تھا ان میں سے ایک نے کہا۔ "کوئی بات نہیں تم آرام سے چلو۔"

میں نے اندھیرے میں اردگرد نگاہ ڈالی۔ یہ کوئی قبرستان نہیں تھا کیونکہ وہاں اندھیرے میں قبروں کی ڈھیریاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ قبروں کی ڈھیریاں رات کے اندھیرے میں بھی زمین سے ابھری ہوئی نظر آ جاتی ہیں۔ وہاں کوئی درخت بھی نہیں تھے۔ ہوا میں کسی وقت مٹی کے تیل ایسی بو آ جاتی تھی۔ لگتا تھا کہ قریب ہی کوئی کارخانہ وغیرہ ہے۔ میں نے سر اٹھا کر آسمان پر تاروں کو دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے چکر آ گیا۔ وہاں زمین پر کہیں جھاڑیاں تھیں۔ کہیں پتھر تھے اور کہیں خالی زمین تھی۔ ہم ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ یہ کوئی غیر آباد ویران جگہ تھی۔ بائیں جانب ایک اونچا ٹیلہ آ گیا۔ ہم ٹیلے کے قریب سے گزر کر آگے نکلے تو وہاں اندھیرے میں مجھے ایک ویگن کھڑی دکھائی دی۔

یہ چاروں آدمی بڑے پر اسرار سے تھے۔ انہوں نے اپنے جسم کو سیاہ چادروں میں چھپا رکھا تھا۔ مجھے ان کے چہروں کے دھندلے نقوش ہی نظر آ سکتے تھے۔ مجھے ویگن کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا۔ تین آدمی اندر میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے ویگن میں پڑا ایک ڈبہ کھولا۔ میرے بازو پر سے قمیض اونچی کی۔ پھر مجھے ایک انجکشن لگا دیا۔ اس انجکشن کے لگتے ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ مجھے آواز آئی۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

میں سوچنے لگا یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں جو مجھے موت کے منہ سے کھینچ لائے ہیں؟ میں نے سوچنا شروع ہی کیا تھا کہ غنودگی نے مجھ پر غلبہ پا لیا اور مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو میں ایک آرام دہ بستر پر پڑا تھا۔ میرے نیچے گدیلا تھا اوپر چھت سے لگا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مجھے جو چکر آتے تھے وہ ختم ہو چکے تھے۔ تشدد کی وجہ سے جسم پر جو زخم آئے تھے وہاں ضرور درد کی ٹیسیں پڑ رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ مختصر سا کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ تین چار بانس کی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میری چارپائی بھی بانس کی تھی۔ تپائی پر ایک گلاس پانی کا جگ اور دوائی کی دو تین شیشیاں پڑی تھیں۔ سامنے دروازہ بند تھا میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے سارا بدن پھوڑے کی طرح دکھتا محسوس ہوا۔

میرے حلق سے درد کے مارے بے اختیار کراہ سی نکل گئی۔

کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ سلاخوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ دروازہ کھلا ایک ادھیڑ عمر کی عورت جس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی سیدھی میری چارپائی کے پاس آئی مجھے جاگتا دیکھا تو بولی۔

"بیٹا! اب طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے کہا۔ "جسم درد کر رہا ہے۔"

اس نے ایک بوتل میں سے کسی دوائی کے چند قطرے گلاس میں ڈالے پھر اس میں پانی ڈالا اور گلاس میری طرف بڑھا کر کہا۔

"اسے پی لو' یہ تمہاری دوائی ہے۔"

میں نے دوائی پی لی۔ میں نے پوچھا۔

"بہن جی! میں کہاں ہوں۔"

اس نے کہا۔ "وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ابھی تم زیادہ نہ بولو آرام کرو۔"

وہ چلی گئی اس عورت کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مسلمان ہے۔ سامنے دیوار پر مجھے ایک کیلنڈر بھی نظر آگیا جس پر اللہ رسول کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں پھر اسی سوچ میں الجھ گیا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ مجھے تو کوئی فرشتے لگتے تھے۔ مگر دوائی کے اثر سے مجھے پھر نیند آگئی۔ اب آنکھ کھلی تو کھڑکی کے اندر آنے والی دن کی روشنی ماند پڑ رہی تھی۔ شاید سورج غروب ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی توانائی کافی بحال ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔ صرف جسم کے زخم درد کر رہے تھے۔ میں نے آنکھ پر ہاتھ پھیرا۔ آنکھ کی سوجن بھی کافی کم ہو گئی تھی۔

وہی عورت ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس اور ایک تھالی تھی۔ تھالی میں ابلے ہوئے چاول اور گلاس میں سوپ تھا۔ اس نے مجھے سہارا دے کر تکیے کے سہارے بٹھا دیا اور کہا۔

"یہ چاول کھالو۔ ساتھ یہ مرغ کی یخنی ضروری پینی ہے۔ یہ تمہارے لیے ہی بنائی ہے۔"

مجھے کافی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں سارے چاول کھا گیا جو پلاؤ کی طرح تھے اور یخنی بھی پی گیا۔ میں نے خاتون سے پوچھا۔

"آپ لوگ مسلمان ہیں کیا؟"

"ہاں، کیوں تمہیں کوئی شک ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں لیکن آپ لوگ کون ہیں میں کس جگہ پر ہوں؟"

خاتون بولی۔

"ابھی تمہیں ان باتوں کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیگ صاحب تمہیں خود سب کچھ بتا دیں گے۔ ابھی تم آرام کرو۔"

میں نے پوچھا۔

"بیگ صاحب کون ہیں؟"

خاتون نے کہا۔ "یہ بھی وہ تمہیں خود بتائیں گے۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

خاتون اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"بیٹا! کہہ دیا ناں کہ ابھی آرام کرو۔ زیادہ باتیں نہ کرو۔"

وہ دروازہ کھول کر چلی گئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس نے باہر سے کنڈی بھی نہیں لگائی تھی۔ میں چارپائی سے اٹھ کر قدم قدم چلتا کھڑکی کے پاس آ گیا۔ کھڑکی کی سلاخوں سے باہر دیکھا سورج غروب ہو چکا تھا۔ دور ایک جانب پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں باہر کھلی جگہ تھی۔ ایک طرف پتھر کی سیڑھیوں والا چھوٹا سا تالاب تھا۔ تالاب کے اوپر گھنے درخت جھکے ہوئے تھے۔ شام کا دھندلکا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ فضا میں ہلکا ہلکا حبس تھا۔ یہ علاقہ مجھے بھارت کا جنوب مشرقی یعنی ست پڑا کے پہاڑی سلسلے کا علاقہ لگتا تھا۔ اس علاقے میں ناریل کے درختوں کی اتنی بھرمار نہیں ہوتی جتنے درخت بھارت کے جنوب میں نیچے ناگ پور' مدراس اور ترچنا پلی کی طرف میں ہوتے ہیں۔ اس طرف کھیر' مہوا' املی اور جنگلوں میں مہاگنی اور دیار کے گھنے درخت بہت ہوتے ہیں۔ ویسے ناریل اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈ بھی ہوتے ہیں لیکن اتنی کثرت سے نہیں ہوتے باہر مجھے کوئی انسان دکھائی نہ دیا۔

خاموشی بھی تھی۔ اچانک دور سے ریل گاڑی کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ یہ کافی دور سے آ رہی تھی۔ ریل گاڑی وہاں پہاڑی علاقے میں سے گزرتی تھی۔ میں واپس چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ جب دن کی روشنی رات کے اندھیرے میں ڈوب گئی تو وہی خاتون کمرے میں آئی۔ اس نے مجھے دوائی پلائی۔ پھر یخنی کا ایک پیالہ پینے کو دیا۔ میں نے وقت پوچھا۔ اس نے کہا۔

"شام کے سات بجے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"بہن جی! بیگ صاحب کہاں ہیں میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے محسن ہیں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

اس پر خاتون نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"تمہیں زیادہ بولنا نہیں چاہیے۔ تمہیں ایک بار کہہ دیا ہے کہ وقت آنے پر بیگ صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ یخنی پی لو اس سے تمہاری طاقت بحال ہو جائے گی۔"

میں خاموشی سے یخنی کے گھونٹ بھرنے لگا۔

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

رات کے دس بج رہے تھے کہ اس خاتون نے آ کر مجھے چاول کھلائے جن
میں قیمہ ملا ہوا تھا۔ ساتھ یخنی تھی۔ میرے زخموں پر اس نے کوئی مرہم بھی لگا
اور یہ کہہ کر چلی گئی۔ "اب تم آرام کرو میں صبح آؤں گی۔"
بال ٹھاکرے کے ٹارچر چیمبر اور ڈ۔تھ چیمبر سے نکلنے کے بعد اس رات
پہلی بار میں میں گہری نیند سویا۔ رات کو سویا تو دوسرے دن گیارہ بجے آنکھ
کھلی۔ میں اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی کہ
درخت پر پرندے کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں گہری
خاموشی تھی یہ جگہ شہر سے دور کسی جنگل کے علاقے میں تھی۔ کمرے کی طرز
تعمیر بھی پرانی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ کسی بوسیدہ حویلی کا کمرہ ہے۔
مجھے خیال آیا کہ خاتون دروازے پر قفل نہیں لگاتی مجھے دروازہ کھول کر
ذرا باہر جا کر دیکھنا چاہیے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ میں دروازے کی طرف بڑھا
تو باہر عورت کے قدموں کی آہٹ سنائی دی میں وہیں سے پلٹ کر چارپائی پر آ کر
ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہی خاتون اندر آ گئی اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ٹرے تھا جس
میں میرے لیے ناشتہ تھا۔ اس نے ٹرے میرے قریب تپائی پر رکھ دیا اور بولی۔
"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"
میں نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے پہلے سے کافی اچھا ہوں۔"
"انشاء اللہ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ناشتہ کر لو۔"
وہ چلی گئی میں نے ناشتہ کیا اور چائے پیتے ہوئے ایک بار پھر سوچ میں

ہوگیا کہ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ میں یقیناً" بھارت کے ملک میں ہی تھا۔ پاکستان میں نہیں تھا۔ یہ لوگ بھارت کے مسلمان تھے مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہوں نے مجھے زہر کا ٹیکہ لگنے سے کیسے بچا لیا؟ یہ معمہ مجھ سے حل نہیں ہو رہا تھا۔ وہاں کوئی مرد بھی نہیں تھا۔ خاتون مجھے بالکل نہیں بتا رہی تھی کہ مرد لوگ جو مجھے قبر میں سے نکال کر لائے تھے کہاں گئے ہوئے ہیں۔ ایک دو بار میں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن خاتون نے مجھے آہستہ سے ڈانٹ دیا تھا اور یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ اس قسم کے سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

وہاں کوئی اور عورت بھی نظر نہیں آئی تھی معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر میں یا اس جنگلاتی حویلی میں یہ ادھیڑ عمر کی عورت اکیلی ہی ہے اور کھانا وغیرہ پکانے کا کام وہ خود ہی کرتی ہے۔ آدھے گھنٹے بعد خاتون واپس آئی۔ اس نے مجھے دوائی پلائی۔ میرے جسم کے زخموں پر جو اب اچھے ہو رہے تھے مرہم لگائی اور مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئی۔

اس طرح مجھے وہاں پانچ روز ہوگئے۔

میں اب کافی حد تک صحت مند ہوگیا تھا۔ جسم کے چھوٹے چھوٹے زخم بھی ٹھیک ہوگئے تھے۔ آنکھ کی سوجن بھی جاتی رہی تھی۔ پانچویں روز ناشتے کے بعد جب عورت برتن وغیرہ لے کر چلی گئی تو میں نے سوچا کہ باہر نکل کر ذرا سیر کرنی چاہیے دیکھنا چاہیے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ میں چارپائی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ اسے آہستہ سے کھول کر باہر دیکھا۔ باہر ایک ویران سا کچا صحن تھا۔ صحن کے درمیان نیم کا ایک گھنا درخت اگا ہوا تھا۔ آمنے سامنے بوسیدہ ستونوں والا ایک برآمدہ تھا۔ برآمدے میں کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سے چھوٹا سا راستہ باہر کو جاتا تھا۔ میں دروازے سے نکل کر صحن میں آیا تو پیچھے سے مجھے خاتون کی آواز آئی۔

"بیٹا! ابھی تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ چلو واپس اپنے کمرے میں آ جاؤ۔"
میں نے مڑ کر دیکھا تو ادھیڑ عمر خاتون دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹوکری تھی جس میں سبز ترکاری تھی۔ میں نے کہا۔
"بہن! میں کمرے میں پڑے پڑے تھک گیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ ذرا باہر کی سیر کروں۔"
خاتون بولی۔ "تمہارے لیے ابھی زیادہ چلنا پھرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کمرے میں جا کر آرام کرو دو ایک روز ٹھہر جاؤ' پھر جہاں چاہے چلنا پھرنا۔"
خاتون کے لہجے میں تھوڑی سرزنش کا پہلو بھی تھا۔ میں واپس کمرے میں آ گیا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ صبح خاتون میرے لیے نئے کپڑے لائی تھی' یعنی کرتہ پاجامہ جو میں نے نہانے کے بعد پہن لیا تھا۔ میری داڑھی کافی بڑھ آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں شیو کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے جواب میں اس نے کہا تھا۔
"مسلمان ہو۔ داڑھی کیوں رکھ لیتے۔ شرعی داڑھی رکھنا سنت ہے۔"
اس وقت مجھے خیال آیا کہ واقعی مجھے داڑھی رکھ لینی چاہیے۔ اس طرح سے میری شکل جو اصلی دھرم چند سے اتنی ملتی جلتی ہے تھوڑی مختلف نظر آنے لگے گی اور مجھے اتنی جلدی کوئی پہچان نہیں سکے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں شرعی داڑھی رکھ لوں گا۔ میرے سر کے بال بھی گردن سے نیچے تک آ گئے تھے۔ ان کے بارے میں بھی میں نے فیصلہ کیا کہ میں انگریزی طرز پر بال نہیں کٹواؤں گا بلکہ پٹے رکھ لوں گا۔ پانچواں دن بھی گزر گیا۔
اس دن کی رات کو شام ہی سے آسمان پر بادلوں کا چلنا پھرنا شروع ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی خوشگوار ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ بھارت کے جنوبی اور جنوب مشرقی علاقوں میں سردیوں کے موسم میں بھی وہ سردی نہیں پڑتی جو شمالی علاقوں میں پڑتی ہے۔ یہ علاقہ بھی بھارت کے جنوب مشرق میں واقع تھا اور کوہ ست پڑا کا

علاقہ تھا جہاں سردیوں میں رات کو تھوڑی خنکی ہو جائے تو ہو جائے باقی دن کے وقت موسم خوشگوار ہی رہتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں بھی پنجاب کی گرمیوں والی لو نہیں چلتی۔ گرمیوں کے موسم کے شروع ہوتے ہی بارشوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس سے موسم مسلسل حبس آلود رہتا ہے۔ جتنی دیر تک بارش ہوتی رہے یا بادلوں سے پہلے ہوائیں چلتی رہیں اتنی دیر تک موسم خوشگوار رہتا ہے۔ جنوبی بھارت میں تو بارش کے بعد جب دھوپ نکلتی ہے تو ایسی حبس آلود تپش پڑتی ہے کہ آدمی کا رنگ کالا پڑنے لگتا ہے۔

اس روز بھی شام کو بادل چھا رہے تھے مگر ساتھ ہوا بھی چل رہی تھی۔ ادھیڑ عمر شفیق خاتون میرے لیے رات کا کھانا لے کر آئی۔ اس نے کوئی سبزی پکائی ہوئی تھی۔ ساتھ چاول تھے اور دو تین روٹیاں بھی تھیں۔ ان علاقوں میں مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے لوگوں کی خوراک زیادہ تر چاول ہی ہے۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ اور مہاراشٹر میں تو روٹی گھروں میں ضرور پکتی ہے لیکن نیچے جا کر ناگ پور، دکن، مدراس، کیرالہ اور گوا وغیرہ کے علاقوں میں لوگ چاول ہی کھاتے ہیں۔ مدراس میں تو روٹی بھی چاول کے آٹے کی پکائی جاتی ہے جسے چپلا کہتے ہیں۔ مجھے کھانا دے کر خاتون چلی گئی۔ میں حسب عادت بستر پر لیٹ کر سگریٹ پینے لگا اور سوچنے لگا کہ یہاں مجھے کب تک پڑا رہنا ہوگا۔ وہ چاروں آدمی، وہ چاروں فرشتے جو مجھے قبر سے نکال کر لائے تھے کہاں غائب ہوگئے ہیں۔

کمرے کی بتی میں نے بجھا دی تھی کیونکہ بلب کی روشنی میں مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ چھت کا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا کھلی کھڑکی میں سے ساون کی رات کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ میں نے کلائی آنکھوں کے قریب کر کے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گھڑی کی چمکیلی سوئیوں نے بتایا کہ رات کے ساڑھے دس بجنے والے ہیں۔ میں نے سگریٹ چارپائی کے پاس فرش پر رکھے ہوئے مٹی کی رکابی میں بجھایا اور چادر اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بادلوں میں

گرج کی آواز پیدا ہوئی۔ بجلی نہیں چمکی تھی۔ اگر چمکی ہوگی تو میرے کمرے سے بہت دور ہوگی کیونکہ اس کی روشنی میرے کمرے تک نہیں آئی تھی۔ بادل دوسری بار گرجے تو مجھے بارش کی آواز سنائی دی۔

بارش کی آواز سن کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یہ آواز ہمیشہ بڑی اچھی لگتی تھی اور یہ آواز مجھے آج بھی اچھی لگتی ہے۔ بہرحال میں آنکھیں بند کر کے بہت کچھ سوچنے لگا کہاں سے چلا تھا' کہاں پہنچ گیا ہوں۔ گزرے ہوئے سارے ڈرامائی واقعات فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے پھر جب مجھے ڈیتھ چیمبر میں اپنی موت کا منظر نظر آیا تو میرے جسم پر خوف کی سنسنی سی طاری ہوگئی۔ اگر ان لوگوں نے بال ٹھاکرے اور بالا جی راؤ کی موجودگی میں مجھے زہر کا ٹیکہ لگایا تھا تو مجھ پر اس کا پورا اثر کیوں نہیں ہوا؟ میں زندہ کیسے بچ گیا اور اگر انہوں نے زہر کا ٹیکہ نہیں لگایا تھا تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ لوگ مجھے زہر کا ٹیکہ نہ لگا سکے؟

عجیب معمہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دماغ الجھنے لگا۔ میں نے ایسے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کی کوشش شروع کر دی۔ بادلوں کی آواز کے ساتھ اس بار مجھے ایک اور آواز سنائی دی جو پہلے تو مجھے بادلوں کی آواز ہی لگی۔ پھر غور سے سنا تو یہ موٹر گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھلی کھڑکی کے پاس آگیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا باہر سے مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ باہر بھی اندھیرا تھا کیونکہ بجلی نہیں چمک رہی تھی مجھے کسی موٹر گاڑی کی بتیوں کی روشنی نظر آئی۔ روشنی آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ پھر یہ گاڑی میری کھڑکی سے تھوڑے فاصلے پر تالاب کی دائیں جانب سے گھوم کر اس حویلی نما مکان کی دوسری طرف مڑ گئی۔ اس کے بعد گاڑی کے رکنے اور انجن کے بند ہونے کی آواز آئی۔

کسی نے کسی کو آواز دی۔

"گاڑی میں سے چیزیں سنبھال کر نکالنا۔"

گاڑی کے دروازوں کے زور سے بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ اس کے بعد سوائے بارش کی آواز کے وہاں اور کوئی آواز نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ چاروں فرشتے واپس آ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک کی آواز میں نے پہچان لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی میرا حال چال پوچھنے ضرور آئے گا مگر کوئی نہ آیا۔ میں سو گیا۔ دوسرے دن میں نے اٹھ کر کمرے کے غسل خانے میں منہ ہاتھ دھویا اور چارپائی پر بیٹھا ہی تھا کہ چار آدمی کمرے میں آ گئے۔ چاروں جوان تھے۔ قد درمیانے تھے، جسم گٹھے ہوئے تھے۔ دو نے کھلے پائنچوں کے پاجامے اور کرتے پہن رکھے تھے۔ دو نے بش شرٹ پتلونیں پہنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک پتلون قمیض والا جوان آگے آگے تھا۔ اس نے مجھ کو السلام علیکم کہا اور ہاتھ ملایا۔ کہنے لگا۔

"میرا نام وزیر علی ہے۔ یہ رمضان بھائی ہے۔ یہ قادر خان ہے اور یہ سلطان بھائی ہے۔"

رمضان بھائی اور قادر خان میری چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وزیر علی اور سلطان بھائی کرسیاں قریب کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میرے ذہن میں کئی سوال تھے اس سے پہلے کہ میں ان پر اسرار آدمیوں کے لیڈر وزیر علی سے کوئی سوال پوچھتا وزیر علی خود ہی بولا۔

"میں جانتا ہوں تمہارے دل میں اس وقت بہت سے سوال پیدا ہو رہے ہیں۔ سب سے پہلے تم ہم سے یہ پوچھنا چاہو گے کہ جب ڈ-تھ چیمبر میں بال ٹھاکرے اور اس کے چیلے بالا جی راؤ کے سامنے تمہیں زہر کا ٹیکہ لگایا گیا تھا تو تم مرے کیوں نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ پاکستان کا ایک محب وطن مجاہد جس کا اصلی نام حیدر علی ہے اور جو ایک خطرناک بھارتی دہشت گرد دھرم چند کے بھیس میں مسلمانوں اور پاکستان کی سلامتی کے لیے

بھارت میں کام کر رہا تھا اصلی دھرم چند کے ظاہر ہو جانے کے بعد پکڑ لیا گیا ہے اور بال ٹھاکرے کے آدمی اسے ٹارچر سیل میں لے گئے ہیں۔ ہم اسی وقت سے تمہیں ان کافروں سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہمارا ایک آدمی ڈیتھ چیمبر میں یعنی بال ٹھاکرے کے اپنے بنائے ہوئے ڈیتھ چیمبر میں خفیہ طور پر ہندو ڈاکٹر کے بھیس میں کام کر رہا تھا۔ جب ہم تمہیں ٹارچر سیل سے فرار نہ کروا سکے تو ہماری آخری امید ڈیتھ چیمبر میں اپنے خاص آدمی پر ہی منحصر تھی۔ ہم نے اسے تمہارے بارے میں پوری طرح بریف کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے تمہیں زہر دینے کے لیے جو ٹیکہ تیار کیا اس میں زہر نہیں تھا صرف بے ہوشی کی دوائی تھی۔ اس کے بعد بال ٹھاکرے کی نگرانی میں تمہیں ایک ویران جگہ پر زمین میں دفن کر دیا گیا۔ پھر جو کچھ ہوا تمہیں معلوم ہی ہے۔ ہم تمہیں قبر سے نکال کر یہاں لے آئے۔ اس سے پہلے بال ٹھاکرے نے مہاراشٹر اور سوراشٹر پرانت کے چھ مسلمانوں کو ڈیتھ چیمبر میں موت کا ٹیکہ لگایا تھا۔ ہم ان کو بھی قبروں سے زندہ نکال کر لے گئے تھے۔ ایسا ہم صرف اپنے گروپ کے اس خاص مسلمان ڈاکٹر کی مدد سے کر سکے تھے جو ڈاکٹر بال مکنہ کے روپ میں ڈیتھ چیمبر میں متعین ہے اور جس نے انجکشن میں زہر کی بجائے بے ہوشی کی دوائی ڈال دی تھی۔"

میں نے وزیر علی کا شکریہ ادا کیا اور اس سے پوچھا۔

"آپ کے مجاہدوں کا یہ گروپ کہاں کہاں کافروں کے خلاف سرگرم عمل ہے؟"

وزیر علی نے رمضان بھائی کی طرف دیکھا۔ رمضان بھائی کہنے لگا۔

"بھارت کے جس صوبے میں راشٹریہ سیوک سنگ بھارتیہ جنتا پارٹی اور شیو سینا ایسی مسلمانوں کی دشمن انتہا پسند ہندو جماعتیں بھارت کے مسلمانوں کا قتل عام کرتی ہیں ہم وہاں پہنچ کر مسلمان بھائیوں اور بہنوں کی جتنی مدد کر سکتے ہیں'

کرتے ہیں۔ انہیں جتنا بچا سکتے ہیں بچا لیتے ہیں۔"

وزیر علی کہنے لگا۔ "ہمارے وسائل بڑے محدود ہیں۔ ہمارے پاس اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے وافر مقدار میں اسلحہ وغیرہ بھی نہیں ہے لیکن ہمارے دلوں میں ایمان کی حرارت ہے۔ ہمارا جذبہ بلند ہے ہم بھارت میں اپنی بقا اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے بال ٹھاکرے ایسے انتہا پسند ہندوؤں سے جنگ کر رہے ہیں۔ ہماری یہ جنگ کھلی جنگ نہیں ہے ہم گوریلا جنگ لڑنے پر مجبور ہیں۔"

قادر بھائی نے کہا۔

"تم ہمارے مسلمان بھائی ہو اور پاکستان کے محب وطن مجاہد بھی ہو۔ ہمارے آدمیوں نے تمہاری سرگرمیوں کی پوری رپورٹ ہمیں دے دی تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم پاکستان اور اسلام کی سلامتی کی خاطر اپنی زندگی موت کے منہ میں ڈال کر بھارت میں کام کر رہے ہو۔ اسلام اور پاکستان کے لیے ہماری جان بھی حاضر ہے۔"

وزیر علی بولا۔

"یہ بات ہمیں آخری مرحلے میں معلوم ہوئی تھی کہ تم ایک خطرناک بھارتی دہشت گرد کا حلیہ بنا کر بال ٹھاکرے کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اس بھارتی دہشت گرد کا نام دھرم چند تھا جو پاکستان کی کسی جیل میں بند ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اصلی دھرم چند پاکستان کی جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو کر بھارت پہنچ گیا ہے اور تمہارا پول کھل گیا اور بال ٹھاکرے نے تمہیں پہلے ٹارچر سیل میں اور بعد میں ڈیتھ چیمبر میں پہنچا دیا۔"

سلطان بھائی نے میری طرف ذرا سا جھک کر کہا۔

"اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سورت کے فسادات میں جن ہندو غنڈوں نے مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کیا تھا اور مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی

تھی تم نے ان کو جالندھر جا کر ایک ایک کر کے قتل کر دیا۔"

وزیر علی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اور ہمارے مخبر نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ تم پاکستان میں کئی بھارتی دہشت گروں کو ہلاک کروا چکے ہو اور تم نے جالندھر اور اکھنور کی بھارتی فوجی تنصیبات کو بھی تباہ و برباد کیا ہے اور ان ایڈز زدہ بھارتی طوائفوں کو بھی تم نے ہی ہمیشہ کی نیند سلا دیا تھا جن کو بال ٹھاکرے پاکستان میں ایڈز پھیلانے کے لیے پاکستان سمگل کرنا چاہتا تھا۔"

قادر بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور پاکستان جا کر تباہی پھیلانے والے تامل ٹائیگرز گوریلوں کے بھی تم نے ہی کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے پرخچے اڑائے تھے۔"

میں حیران تھا کہ ان لوگوں کی جاسوسی کا سسٹم کس قدر کارگر اور اپ ٹو ڈیٹ ہے۔ وزیر علی نے کہا۔

"جو باتیں اپنے اور تمہارے بارے میں تم تک پہنچانی ضروری تھیں وہ ہم نے کہہ دی ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

میں نے کہا۔ "جو خاتون یہاں میری دیکھ بھال کر رہی تھیں یہ اس کی مہربانی اور تیمارداری کا نتیجہ ہے کہ میرے زخم بھی ٹھیک ہوگئے ہیں اور میری کھوئی ہوئی توانائی بھی واپس آگئی ہے۔"

وزیر علی نے گہرا سانس لیا اور بولا۔

"اس خاتون کا نام چاند بائی ہے۔ وہ احمد آباد کی رہنے والی ہے۔ گزشتہ سال احمد آباد کے مسلم کش فسادات میں ہندوؤں نے اس کے سارے خاندان کو شہید کر دیا تھا۔ ہم چاند بائی کو اپنے پاس لے آئے ہیں۔ وہ یہیں رہتی ہے۔"

عین اس وقت وہی ادھیڑ عمر خاتون چاند بائی کمرے میں آئی اور پوچھا۔

"ناشتہ میں نے لگا دیا ہے تم سب چل کر ناشتہ کر لو۔"

"اچھا چاند بن۔"

وزیر علی یہ کہہ کر اٹھا اور ہم سب وہاں سے نکل کر ویران صحن میں سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں آ گئے یہ کمرہ بھی بوسیدہ اور چھوٹا سا تھا۔ فرش پر دری بچھی تھی اور ناشتہ لگا ہوا تھا۔ چاند بائی نے پراٹھے اور چائے بنائی تھی۔ ہم سب مل کر ناشتہ کرنے لگے۔ میں نے وزیر علی سے پوچھا۔

"کیا آپ کو اصلی دھرم چند کے بارے میں کوئی اطلاع ملی ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

وزیر علی نے کہا۔ "وہ بمبئی میں ہے اور ابھی تک بال ٹھاکرے کے ساتھ ہی ہے۔"

ایک سوال قدرتی طور پر میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں نے وزیر علی سے پوچھا۔

"اگر بال ٹھاکرے نے میری قبر کھدوا کر میری لاش دیکھنے کی کوشش کی تو اسے تو فوراً علم ہو جائے گا کہ مجھے قبر سے نکال لیا گیا ہے۔"

وزیر علی نے کہا۔ "اس کا حل ہم نے بہت پہلے تلاش کر لیا تھا۔ سورت کے فسادات میں ایک ہندو کی لاش ہم اٹھا کر لے آئے تھے۔ وہ لاش اب کافی گل سڑ چکی ہے۔ جب کبھی بال ٹھاکرے کے ڈیتھ چیمبر میں کسی مسلمان کو موت کی سزا دی جاتی ہے اور اس کی زندہ لاش کو کسی جگہ قبر میں دبا دیا جاتا ہے تو ہم مقررہ وقت پر رات کو جاتے ہیں اور اس مسلمان کو قبر سے نکال کر اس کی جگہ ہندو کی گلی سڑی لاش لٹا دیتے ہیں۔ چونکہ مرنے والے کو انتہائی خطرناک زہر کا انجکشن لگایا گیا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں لاش نے راتوں رات پھٹ کر گل سڑ جانا ہوتا ہے اس لیے بال ٹھاکرے اگر لاش کو دیکھ بھی لے تو اسے یہ شک بھی نہیں پڑ سکتا کہ لاش اتنی جلدی کیسے گل سڑ گئی۔ ویسے آج تک کبھی ایسا ہوا نہیں اور بال ٹھاکرے ہماری اطلاع کے مطابق کبھی قبر کا معائنہ کرنے نہیں گیا۔

اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کے آدمیوں نے مسلمان کو صحیح زہریلا ٹیکہ لگایا ہے۔"

ناشتہ کرنے کے بعد وہ چاروں مجاہد جن کا تعلق گجرات کاٹھیاواڑ سے تھا مجھے حویلی کے نیچے لے گئے۔ حویلی کے نیچے جانے کے لیے ہمیں ایک خفیہ سیڑھیاں اترنی پڑیں جو ایک بوسیدہ کوٹھڑی کے اندر سے حویلی کے نیچے جاتی تھیں۔ یہ تہہ خانہ نہیں تھا بلکہ حویلی کے نیچے محرابی ستونوں والے کئی دالان تھے۔ وزیر علی کہہ رہا تھا۔

"یہ حویلی گجرات کی مسلمان حکمران رضیہ سلطانہ کے ایک جرنیل نے اپنے لیے بنوائی تھی اور یہ تہہ خانے بھی خاص طور پر بنوائے تھے۔ یہاں کی حویلیوں اور محلات کے نیچے اس قسم کے تہہ خانے اکثر بنوائے جاتے تھے۔ اسکی سیڑھیوں کا ایک عام راستہ ہے جو حویلی کی ڈیوڑھی سے ذرا آگے نیچے اترتا ہے۔ ہم نے اس راستے کو بند کر دیا ہے اور اس کی جگہ اس کوٹھڑی سے خفیہ راستہ نکالا ہے۔"

حویلی کے اس زمین دوز محرابی ستونوں والے دالان میں دو کوٹھڑیاں بھی تھیں جن کے دروازے بند تھے۔ وزیر علی نے مجھے دونوں کوٹھڑیاں کھول کر دکھائیں۔ ان کوٹھڑیوں میں کچھ اسلحہ رکھا ہوا تھا جن میں رائفلیں' چند ایک ریوالور اور ہینڈ گرنیڈ اور خنجر تھے۔ وزیر علی نے کہا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ ہمارے وسائل بڑے محدود ہیں۔ ہمارے پاس اگر پیسے بھی ہوں تو ہم بھارت میں اتنی آسانی سے اسلحہ نہیں خرید سکتے۔ ان میں سے زیادہ اسلحہ وہ ہے جو ہم نے شیوسینا اور ایس ایس ایس والوں سے چھینا ہے۔"

میں نے وزیر علی سے پوچھا۔

"عام زندگی میں آپ کی سرگرمیاں کیا ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کا ذریعہ آمدنی کیا ہے۔"

وزیر علی بولا۔

"یہ تمہیں آہستہ آہستہ معلوم ہو جائے گا۔ ویسے ہم سب اپنی اپنی جگہ پر محنت مزدوری کر کے رزق حلال کماتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی شادی شدہ نہیں ہے۔ ہم اپنے گروپ میں بڑی زبردست چیکنگ کرنے کے بعد ایسے مجاہدوں کو شامل کرتے ہیں جو شادی شدہ نہ ہوں۔ ہماری جدوجہد کا مقصد بھارت کے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کا تحفظ ہے اور بھارت کی برہمن سرکار کو یہ احساس دلانا ہے کہ بھارتی مسلمان آزادی اور اپنے دینی شعائر پر آزادی سے عمل کر کے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ ہماری طاقت بہت محدود ہے' ہمارا دائرہ کار بھی محدود ہے مگر ہم نا امید نہیں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری مثال کو سامنے رکھتے ہوئے بھارت کے دوسرے صوبوں خاص طور پر آندھرا پردیش اور وسطی بھارت کے مسلمان بھی اپنے جائز حقوق کی حفاظت اور اپنی بقا کے لیے ایک نہ ایک دن ضرور اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

میں ان بھارتی مسلمان مجاہدوں کے اس دینی جذبے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس تحریک کو بھارت کے مسلمانوں میں بیدار کرنا بہت ضروری تھا۔ وزیر علی نے مجھے کہا تھا کہ ہم نے اپنی سلامتی اور بقا کے لیے باہر کے کسی مسلمان ملک پر امیدیں نہیں لگائی ہوئیں۔ ہم خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک بھارت کے مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے خود بیدار نہیں ہوں گے اور جدوجہد نہیں کریں گے ان کی کوئی ملک مدد نہیں کرے گا۔

تہہ خانے سے نکل کر ہم واپس اس کمرے میں آ گئے جہاں میری چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے میں آ کر وزیر علی سے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ بال ٹھاکرے اور بالا جی راؤ اس وقت بھارتی مسلمانوں اور پاکستان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ یہ ایسے دشمن ہیں جو اپنی خطرناک دشمنی کا عملی مظاہرہ بھی کر رہے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں دشمنان

دین کا کام تمام کر دیا جائے؟"

سوراشٹر کے چاروں مجاہد چپ ہو گئے اور ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ وزیر علی نے کہا۔

"بال ٹھاکرے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے لیکن تمہیں اسی بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ جس وقت ہم نے بال ٹھاکرے کو قتل کیا اس کے ایک گھنٹے کے اندر اندر بھارت کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو جائے گا۔ کم از کم ایک لاکھ مسلمان تو بمبئی احمد آباد پونا اور سورت میں ہی قتل ہو جائیں گے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ جب بھارت کی پردھان منتری کو اس کے جیالے سکھ باڈی گارڈ نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا اس کے آدھے گھنٹے کے اندر اندر صرف دلی میں ہندوؤں نے دس بارہ ہزر سکھوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔"

قادر بھائی نے کہا۔

"ہماری حکمت عملی انتہا پسند اور مسلمانوں کے دشمن ہندو لیڈروں کو قتل کرنے کی نہیں ہے۔ ہمارے سامنے صرف مقصد ہیں۔ پہلا اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ بھارت کے کچلے ہوئے پسے ہوئے مسلمانوں میں اپنے دینی اور انسانی حقوق کے تحفظ کا شعور اور بیداری پیدا کرنا جس کی ضمانت بھارت کے آئین میں انہیں دی گئی ہے۔ دوسرے مقصد کا تعلق صرف ہماری جماعتی سرگرمیوں سے ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے زیر اثر صوبوں کے جس شہر میں ہندو وہاں کے مسلمانوں پر ظلم کریں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ ان کی اسلام دشمن سازشوں کو ناکام بنانے کی کوشش کی جائے اور ان پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ بھارت کا مسلمان مردہ نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔"

ان لوگوں نے بڑی منطقی بات کی تھی۔ بال ٹھاکرے اور کسی دوسرے

متعصب ہندو لیڈر کو قتل کر دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا بلکہ الٹا اس سے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں نے وزیر علی سے پوچھا۔

"میرے بارے میں آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

وزیر علی نے کہا۔

"تم کوئی بھی فیصلہ کرنے میں بالکل آزاد ہو ہم جانتے ہیں کہ تمہار میدان عمل سوراشٹر اور مہاراشٹر سے لے کر مقبوضہ کشمیر تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں بھارتی فوج کشمیری مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہی ہے۔ اگر تم کشمیر کے جہاد میں شریک ہونا چاہو تو ہمیں خوشی ہوگی اور اگر تم ہمارے ساتھ رہ کر مسلمانوں اور اسلام کے لیے کام کرنا چاہو تو ہمیں مزید خوشی ہوگی۔ تم جو چاہو فیصلہ کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "سب سے پہلے تو میں پاکستان میں اپنے خاص آدمیوں کو یہ اطلاع پہنچانا چاہتا ہوں کہ میں زندہ ہوں اگرچہ میرا راز فاش ہو چکا ہے اور اصلی دھرم چند آپ کی قید سے نکل کر یہاں پہنچ گیا ہے۔"

لیڈر وزیر علی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم یہ پیغام پاکستان کس طرح پہنچاؤ گے؟ کیا یہاں تمہارا کوئی ایسا آدمی ہے تو یہ پیغام لے کر پاکستان پہنچ سکے؟"

میں نے کہا۔ "میرے پاس ایک ہی ذریعہ ہے۔ اگر مجھے کہیں سے ریڈیو ٹرانسمیٹر مل جائے تو میں کوڈ الفاظ میں یہ پیغام پاکستان میں اپنے خاص آدمیوں کو پہنچا سکتا ہوں۔"

لیڈر وزیر علی نے کہا۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔"

وزیر علی اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔

"ابھی تم آرام کرو۔ ایک گھنٹے بعد میں اکیلا یہاں آؤں گا اور تمہیں ایسی

جگہ لے جاؤں گا جہاں تمہیں ریڈیو ٹرانسمیٹر کی سہولت مل جائے گی۔"

جب وہ چاروں مجاہد جانے لگے تو میں نے پوچھا۔

"بھائیو! مجھے یہ تو بتا دو کہ یہ جگہ کونسی ہے اور میں بمبئی شہر سے کتنے فاصلے پر ہوں؟"

وزیر علی مسکرایا اور کہنے لگا۔

"یہ بھی واپسی پر تمہیں بتا دوں گا۔ ویسے تم بمبئی کے قریبی جنگلوں میں ہو۔ خدا حافظ۔"

اور وہ چاروں مجاہد چلے گئے۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ قدرت کے کھیل نیارے ہوتے ہیں۔ خدا نے اس وقت میری جان بچائی جب میرے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی اور میری موت یقینی تھی بلکہ میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ میں مرچکا ہوں مگر خدا نے مجھے قبر سے زندہ باہر نکال لیا تھا۔ میں دھرم چند کے بارے میں سوچنے لگا کہ کیا اس کا ہم شکل ہونا مجھے اب کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتا ہے؟ فائدہ تو مجھے بظاہر کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایک خطرہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ جہاں کہیں میں بمبئی امرتسر بٹالہ یا جالندھر کے شیو سینا والوں کو نظر پڑ گیا میری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی کیونکہ اب ایک تو میں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ دوسرے ہو سکتا ہے جس وقت مجھے شیو سینا والے دیکھیں تو اس سے تھوڑی دیر پہلے اصلی دھرم چند ان سے مل کر گیا ہو یا وہ مدراس یا دلی میں ہو اور شیو سینا والے مجھے دوسرے شہر میں دیکھ لیں۔ کیونکہ ایک بات یقینی تھی کہ شیو سینا کے تمام رضاکاروں اور ان لوگوں کو جن سے میں مل چکا تھا یہ ضرور معلوم ہو چکا ہو گا کہ میں اصلی دھرم چند نہیں بلکہ نقلی دھرم چند تھا اور پاکستان کے لیے ان کے درمیان رہ کر کام کر رہا تھا۔

اس کا ایک حل میرے ذہن میں آیا کہ کسی طرح پاکستان واپس جاؤں اور چہرے کی دوبارہ پلاسٹک سرجری کروا کر ناک کو پھر سے اپنے پہلے جیسے ناک میں بدلوا لوں۔ جب ایک گھنٹے بعد وزیر علی آیا اور میں نے اس کے آگے خدشات کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

"تمہیں پاکستان جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کلکتے میں ہماری جماعت کا ایک سرگرم اور خاموش کارکن ڈاکٹر اور پلاسٹک سرجری کا ماہر ہے۔ ہم تمہیں اس کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ وہ تمہاری ناک کی جیسے تم کہو گے پلاسٹک سرجری کر دے گا۔"

یہ بڑی ہمت افزا بات تھی میں تیار ہوگیا۔ وزیر علی بولا۔ "ٹھیک ہے میں تمہیں ایک آدمی کے ساتھ کلکتے روانہ کرتا ہوں۔ اپنے سرجن ڈاکٹر کو میں فون پر ساری بات بتا دوں گا۔ اس کا نام سیف الاسلام ہے۔ وہ بنگالی ہے اور بنگال کے مسلمانوں کے حقوق کے لیے بھارت کی مسلم دشمن ہندو سرکار کے خلاف خاموش رہ کر کام کر رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مگر میرے پاس تو کوئی پیسہ نہیں ہے۔ میں اس کی فیس کہاں سے ادا کروں گا۔"

وزیر علی نے مسکرا کر کہا۔

"فیس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ڈاکٹر سیف الاسلام بہت امیر آدمی ہے اور پھر ہمارے آدمیوں کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہتا ہے۔ جب تم واپس آؤ گے تو سوچ لیں گے کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہے مگر سب سے پہلے تمہارا اپنی اصلی شکل میں واپس آنا بہت ضروری ہے۔ دھرم چند کا ہم شکل ہونا تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کے ہم شکل ہونے سے تمہیں جتنا فائدہ پہنچ سکتا تھا پہنچ گیا ہے اب نقصان ہی پہنچے گا۔"

جس جنگل کی پرانی حویلی میں وزیر علی اور اس کے احمد آباد سورت کے مسلمان مجاہدوں نے اپنا خفیہ ٹھکانہ بنا رکھا تھا وہاں سے قریبی سٹیشن اوپر کی جانب برہان پور ہی تھا۔ وزیر علی نے مجھے ایک آدمی کے ساتھ کر دیا۔ میرا حلیہ دھرم چند کے حلیے سے اس اعتبار سے کافی بدلا ہوا تھا کہ میری مونچھیں اور گھنی داڑھی تھی۔ یہ داڑھی میں نے نیچے سے مخروطی انداز میں ترشوائی ہوئی تھی۔

سر کے بال بھی پٹوں کی شکل میں گردن تک آئے ہوئے تھے۔ مجھے کلکتے کے مسلمانوں جیسا لباس پہنا دیا گیا تھا یعنی چارخانہ دھوتی' پاؤں میں چپل' کھدر کا کرتہ اور سر پر سفید ٹوپی۔ وزیر علی نے مجھے ایک چھتری بھی دے دی تھی جو آدمی میرے ساتھ تھا اس نے بھی تقریباً ایسا ہی لباس پہن رکھا تھا۔ ہم ایک ٹرین میں سوار ہو کر برہان پور پہنچے۔ وہاں سے کلکتہ میل پکڑی اور اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ برہان پور سے ایک رات اور دو دن کے سفر کے بعد ہم کلکتہ پہنچے جو گجراتی مجاہد میرے ساتھ تھا وہ مجھے اپنے بھائی کے گھر لے گیا۔ وہاں ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ کھانا کھایا اور ڈاکٹر سیف الاسلام کے کلینک آ گئے۔ اسے لیڈر وزیر علی نے فون پر سب کچھ بتا دیا ہوا تھا۔ وزیر علی کا خاص آدمی بھی ساتھ تھا۔ سیف الاسلام نے کہا۔ "کل میرے ہسپتال میں آ جائیں۔"

میں ہسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر سیف الاسلام نے میرے ناک کے اوپر اس جگہ کو چیک کیا جہاں سے میری پلاسٹک سرجری کر کے میری ناک کو دھرم چند کی ناک کی طرح بنایا گیا تھا۔ میں نے سیف الاسلام سے کہا۔

"بس میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے میرے ناک کو دوبارہ ذرا سا اوپر اٹھا دیا جائے۔"

ڈاکٹر سیف الاسلام نے کمپیوٹر پر میری ناک کو بالکل میری پہلے والی ناک کا خاکہ بنا کر مجھے دکھایا اور پوچھا۔

"کیا ایسی تھی تمہاری پہلی ناک۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے کہا۔ "بالکل یہی تھی میری ناک۔"

ڈاکٹر سیف الاسلام مسکراتے ہوئے بولا۔

"نو پرابلم! یہ بالکل ایسی ہی کر دی جائے گی۔"

دو دن تک میری پلاسٹک سرجری ہوتی رہی۔ اس کے بعد میں ایک ہفتہ ڈاکٹر سیف الاسلام کے ذاتی چھوٹے سے ہسپتال میں رہا۔ میں نے آئینے میں اپنی

ناک کو دیکھا تو وہ بالکل میری اصلی ناک بن چکی تھی یعنی اوپر جا کر ذرا سا اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ اب میری شکل دھرم چند سے مشابہ ضرور تھی جیسا کہ بعض لوگوں کی شکلوں کی مشابہت ہوتی ہے مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں دھرم چند ہوں یا خود میں کسی کو نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں دھرم چند ہوں۔ مجھے مزید ایک ہفتہ ڈاکٹر سیف الاسلام نے کلکتے میں اپنی نگرانی میں رکھا۔ جب میں پوری طرح سے صحت مند ہوگیا تو ہم واپس روانہ ہوگئے۔ اپنی خفیہ کمیں گاہ والی حویلی میں آیا تو لیڈر وزیر علی اور اس کے تینوں ساتھی قادر خان' رمضان اور سلطان بھائی میرے انتظار میں وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کچھ بدل گیا ہوں۔ وزیر علی نے پوچھا۔

"کیا ایسی تھی تمہاری اپنی ناک؟"

میں نے کہا۔ "بالکل ایسی ہی تھی۔"

قادر خان کہنے لگا۔

"میں نے دھرم چند کو دیکھا ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری شکل اس سے ملتی جلتی ہے مگر ناک اب بالکل مختلف ہوگئی ہے۔"

وزیر علی نے بھی کہا کہ اب تمہاری شکل دھرم چند جیسی ہرگز نہیں ہے۔ تمہاری داڑھی نے تمہیں اس سے بہت مختلف بنا دیا ہے۔ میں نے کہا۔

"وزیر علی بھائی! اب میں پاکستان اپنے ساتھیوں کو اپنے زندہ ہونے کے بارے میں اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ مجھے وہاں لے چلیں جہاں میں ریڈیو ٹرانسمیٹر سے اپنے ساتھیوں سے بات کر سکوں۔"

اس وقت سہ پہر کا وقت تھا۔ وزیر علی مجھے گاڑی میں بٹھا کر وہاں سے پندرہ بیس میل دور ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں ریڈیو ٹرانسمیٹر سیٹ موجود تھا۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ یہ جگہ کون سی تھی۔ آپ کو یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

بہرحال میں ایک چھوٹے سے کیبن میں ریڈیو ٹرانسمیٹر اون کر کے بیٹھ گیا۔ میں نے فریکوئنسی سیٹ کی اور سلطان صاحب یا بٹ صاحب کو سگنل دیا۔ دوسری طرف سے فوراً میرے سگنل کا جواب آگیا۔ میں نے کوڈ الفاظ میں کہا۔

"مجھے بٹ صاحب یا سلطان صاحب سے بات کرنی ہے۔"

دوسری طرف سے کوڈ الفاظ میں ہی آواز آئی۔

"تم کون بول رہے ہو۔ اپنی شناخت کراؤ۔"

میں نے اپنا خفیہ نمبر بتایا تو اس آدمی نے کہا۔

"میں بٹ صاحب کو بلاتا ہوں۔"

ریڈیو ٹرانسمیٹر میں ہلکا ہلکا شور سنائی دیتا رہا۔ کوئی دس سیکنڈ بعد بٹ صاحب کی آواز آئی۔

"کون؟ حیدر علی۔"

میں نے کوڈ زبان میں کہا۔

"میں حیدر علی ہوں۔ دھرم چند کیسے فرار ہوگیا تھا؟ اس نے تو مجھے موت کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ میری زندگی اللہ کو منظور تھی بچ گیا۔"

بٹ صاحب نے انتہائی افسوس اور شرمساری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غفلت اور غلطی ہے بس تم سمجھ لو کہ قدرت نے بھی اس کو فرار کرانے میں اس کی مدد کی تھی۔ میں نے امرتسر والے مجاہد کو اسی وقت خبردار کر دیا تھا کیا تمہیں اس نے اطلاع نہیں دی۔"

میں نے کہا۔ "امرتسر والا مجاہد تو خود پکڑ لیا گیا تھا۔ یہ لمبی اور الجھی ہوئی کہانی ہے۔"

"اب تم کہاں ہو، کیسے ہو؟"

میں نے کہا۔ "اب میں بالکل محفوظ جگہ پر ہوں۔ میں نے دوبارہ ناک کی پلاسٹک سرجری کروا کر اپنی ناک پہلے ایسی کروا لی ہے۔ اب میں دھرم چند کا ہم

شکل نہیں ہوں۔"

بٹ صاحب کی آواز آئی۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ یہاں ہم نے ایک دہشت گرد کو پکڑا ہے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ بھارت کی بدنام زمانہ اور پاکستان دشمن سرکاری تنظیم را کی طرف سے بھارت کے کسی شہر میں ایک خفیہ ٹریننگ سنٹر قائم کیا گیا ہے جہاں پیشہ ور دہشت گردوں کو پاکستان کے خلاف دہشت گردی اور خوفناک تخریب کاری کی تربیت دی جاتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہاں بھارت کی حسین ترین پیشہ ور عورتوں کو بھی پاکستان میں جا کر جاسوسی کرنے کی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ تم جس طرح بھی ہو سکے اس ٹریننگ سنٹر کے بارے میں ہمیں تفصیلی رپورٹ بھی بھیجو اور کوشش کرو کہ جن زہریلے سانپوں کو بھارت کی سرکار پاکستان بھیجنے والی ہے ان کو وہیں کچل دیا جائے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس ٹریننگ سنٹر کا پورا کھوج لگاؤں گا اور وہاں تربیت حاصل کرنے والے تمام سانپوں اور ان کے سپیروں کو ہمیشہ کے لیے کچل کر ختم کر دوں گا۔"

بٹ صاحب نے پوچھا۔

"تم سے ٹرانسمیٹر پر اب کیسے رابطہ ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "امرتسر والے مجاہد سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اس وقت پولیس کی حراست میں ہے۔ میں اگلی بار آپ کو بتاؤں گا کہ آپ مجھے کس جگہ پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ اب میں پیغام رسانی کا سلسلہ بند کرتا ہوں۔"

"اوکے خدا حافظ!" بٹ صاحب کی آواز آئی۔ میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ وزیر علی دوسرے کمرے میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر

پوچھا۔

"بات ہو گئی؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں ایک ضروری بات آپ سے پوچھنی ہے۔ یہاں نہیں گاڑی میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

ہم اس خفیہ ٹرانسمیٹر والی جگہ سے نکل کر باہر کھڑی وزیر علی کی پرانی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہ جگہ قریبی شہر سے کافی دور تھی۔ اردگرد آبادی کہیں نہیں پہاڑوں کی ڈھلانوں پر ہی تھی۔ ہماری گاڑی درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ را کے ٹریننگ سنٹر کے بارے میں جو باتیں مجھے بٹ صاحب نے وائرلیس پر بتائی تھیں وہ میں نے لیڈر وزیر علی کو پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیں اور ان سے پوچھا۔ "مجھے یہ معلوم کرنا ہو گا کہ را کا یہ ٹریننگ سنٹر کون سے شہر میں اور کس جگہ پر ہے۔"

وزیر علی نے میری باتیں بڑے غور سے سنیں اور ایک دو لمحے خاموش رہے پھر کہا۔ "یہ معلوم کرنا پڑے گا۔ میں اپنے دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔ اگر اس قسم کا کوئی سینٹر را کی طرف سے قائم ہوا ہے تو اس کی فل رپورٹ مجھے مل جائے گی۔ مجھے دو چار دن کی مہلت دے دو میں سارا پتہ لگا لوں گا۔"

شام ہو رہی تھی جب ہم واپس اپنی حویلی والی خفیہ کمیں گاہ میں آ گئے اس رات ان مجاہدوں کی جماعت کے کچھ اور رضاکاروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ مہاراشٹر اور سوراشٹر کے شہروں میں اپنی اپنی جگہوں پر بھارت کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ظاہری طور پر اور خفیہ طور پر کام کر رہے تھے۔ مہینے میں ایک دو بار ان کی آپس میں اسی حویلی کے تہہ خانے میں ملاقات ہوتی تھی۔ وزیر علی نے گجرات کاٹھیاواڑ اور پونا کے ان مسلمان مجاہدوں سے میرا تعارف کرایا۔ لیکن یہ بالکل نہ بتایا کہ اس میں حقیقت میں کون ہوں۔ وزیر

علی نے انہیں یہی کہا کہ حیدر علی مالیر کوٹلہ کا مسلمان مجاہد ہے اور یہاں ہمارے ساتھ رہ کر بھارتی مسلمانوں پر ہندو سرکار کی زیادتیوں کے خلاف کام کرنے آیا ہے۔

اسی رات میں نے وزیر علی سے کہا۔

"وزیر بھائی! میرا خیال ہے اب میرا حلیہ دھرم چند جیسا نہیں ہے۔ میں باہر نکل کر بھی کام کر سکتا ہوں۔ بمبئی یا سورت میں نہ سہی بھارت کے کسی دوسرے شہر مثلاً" احمد آباد میں رہ سکتا ہوں۔ کیا خیال ہے؟"

وزیر علی کچھ سوچ کر بولا۔ "ایسا ہو سکتا ہے لیکن میں ابھی تمہیں اس طرح کھلے بندوں باہر پھرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ مجھے را کے تربیتی کیمپ کا سراغ لگا لینے دو۔ اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ تمہیں اس خفیہ کمیں گاہ میں رہنا چاہیے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے را کے تربیتی کیمپ کو ختم کرنے کے مشن کے لیے تمہیں کسی دوسرے شہر جانا پڑ جائے۔"

وزیر علی کا مشورہ درست اور عقل مندوں والا تھا۔ میں نے اسی حویلی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے چاروں مجاہد دوست یعنی وزیر علی' قادر خان' سلطان بھائی اور رمضان بھائی چلے گئے۔ میں حویلی میں اکیلا رہ گیا۔ ادھیڑ عمر خاتون چاند بائی مجھے کھانا وغیرہ پکا کر دے دیتی تھی اور میرا پورا خیال رکھتی تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر بار کی تباہی اور خاوند بیٹوں دو بہوؤں اور ان کے بچوں کے ہندوؤں کے ہاتھوں قتل کی ایسی دلدوز کہانی سنائی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سوچنے لگا کہ گاندھی کے یہ چیلے کس منہ سے اپنے آپ کو امن اور شانتی کے پجاری کہتے ہیں۔ ان غنڈوں نے چاند بائی کی دونوں بہوؤں کو ان کے خاوندوں کو قتل کرنے کے بعد سب کے سامنے بے عزت کیا۔ پھر ان کے بچوں کو ایک ایک کر کے ذبح کیا اور چاند بائی کو اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ بڑھاپے میں اپنے بچوں بچیوں کا غم جھیلتی رہے۔

چاند بائی کی دکھ بھری داستان سننے کے بعد میں رات دیر تک جاگتا رہا۔ مجھے نیند نہ آئی۔ سوچتا رہا کہ متعصب ہندو واقعی مسلمان کا دشمن ہے۔ وہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ بھارت میں بھی مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے منصوبے پر عمل کر رہا ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں نے تو اپنے دشمن کو پہچان لیا ہے اور اس کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب بھارت کے مسلمان بھی ہندو کے ظلم و ستم کے خلاف بیدار ہوگئے ہیں اور وزیر علی ایسے مجاہدوں کی شکل میں مسلم دشمن کٹر ہندو جماعتوں کے خلاف سینہ سپر ہوگئے ہیں۔ بھارت میں مسلمانوں کی بیداری کی بہت ضرورت ہے۔ اگر بھارت کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے حقوق اور مذہبی آزادی کے حق میں جدو جہد شروع کر دیتے ہیں تو یہ ہندوؤں کے خلاف بہت بڑی طاقت ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ ہندو جو بھارت کے سارے مسلمانوں کو ہندو بنا دینا یا ختم کر دینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے باقاعدہ مصروف عمل ہیں۔

وزیر علی کو جنگل والی اس حویلی کی خفیہ کمیں گاہ سے گئے تین دن گزرے تھے کہ ایک رات وہ آگیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ را کے ایجنٹوں کے خفیہ تربیتی کیمپ کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر کے لایا ہوگا۔ کیونکہ ان لوگوں کے آدمی بھارت کے ہر صوبے ہر شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔

وزیر علی نے اپنی پرانی گاڑی پیچھے کھڑی کر دی تھی۔ کیونکہ ایک دن پہلے بڑی موسلادھار بارش ہوئی تھی اور باہر والے تالاب کا پانی باہر تک آگیا ہوا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آتے ہوئے چاند بائی کو چائے کے لیے کہہ آیا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے السلام علیکم کہہ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کرسی کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"وزیر بھائی! کوئی سراغ ملا؟"

اس نے کہا۔ "پہلے چائے پی لیں پھر بات کریں گے۔ میں خالہ چاند بائی کو

چائے کا کہہ آیا ہوں۔ تم سناؤ یہاں بور تو نہیں ہو گئے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں بھائی ہمیشہ ایکشن میں رہنے والا آدمی ہوں۔ یہاں بیکا
پڑے پڑے بور ہی ہو سکتا ہوں۔ میں تو ایکشن چاہتا ہوں۔ یعنی ملک و ملت
اسلام اور مسلمانوں کی سلامتی کی خاطر دشمنوں سے جنگ کرتے رہنا۔"

وزیر علی نے ہنس کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔ تمہیں اس کا موقع مل گیا ہے۔ میں نے را کے تربیتی کیمپ
پورا پتہ چلا لیا ہے۔"

وزیر علی نے مجھے را کے اس تخریب کاری کے تربیتی کیمپ کے بارے میر
جو کچھ بتایا وہ پاکستان کے خلاف دہشت گردوں کے اس تربیتی مرکز کی مکمل
رپورٹ تھی جو اس کے مخبروں نے اسے لا کر دی تھی۔ میں آپ کو اپنی زبان
میں اس رپورٹ کی تفصیل بتاتا ہوں۔

بھارت کا صوبہ مدھیہ پردیش بہت وسیع و عریض صوبہ ہے اور اس میر
بھارت کے بڑے بڑے شہر آتے ہیں۔ وسطی ہند کے خطرناک ترین پہاڑی
جنگلوں کا سلسلہ بھی اسی صوبہ میں ہے۔ بھوپال کا شہر بھی اسی صوبے میں واقع
ہے۔ اگر آپ بھوپال سے ٹرین میں بیٹھ کر جنوب کی طرف واردھا کی طرف
جائیں تو راستے میں ایک چھوٹا سا پہاڑی سٹیشن آتا ہے جس کا نام گومل واڑی
ہے۔ اس سٹیشن کے آس پاس وسطی ہند کے ہیبت ناک پہاڑی جنگل ہیں جہاں
بڑے بڑے بہادر ڈاکو بھی پناہ لیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ان جنگلوں میں آدم خور
شیر' آوارہ کتوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں۔ ایسی آدم خور جنگلی بیلیں ہیں کہ آدی
کو اچانک چمٹ جاتی ہیں اور جب تک اس کے جسم کا سارا خون نہ چوس لیں
اسے نہیں چھوڑتیں۔ دلدلیں اتنی گہری ہیں کہ اوپر تلے ان میں دو ہاتھ گر جائیں
تو انہیں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ گومل واڑی کا سٹیشن انگریزوں کے زمانے میں بنایا گیا
تھا جس کا مقصد جنگل میں کٹائی کے دنوں میں لکڑی کے گٹھے مال گاڑی میں لاد کر

شہروں کو سپلائی کرتا تھا۔ یہ سٹیشن اتنا ہیبت ناک اور خطرناک ہے کہ انگریز کے زمانے میں یہاں ہفتے میں صرف دو مال گاڑیاں آکر رکتی تھیں اور لکڑی لاد کر لے جاتی تھیں۔ اسی مال گاڑی میں سٹیشن کے مختصر سٹاف کے لیے راشن پانی بھی آتا تھا۔ آزادی ملنے کے بعد بھارت سرکار نے اس طرف ایک دو مسافر ٹرینیں بھی چلا دیں مگر گومل واڑی سٹیشن پر دن کے وقت بھی کوئی مسافر ڈر کے مارے نہیں اترتا تھا۔ جب بھارت کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا تو گومل واڑی کے قرب و جوار میں نئے نئے قصبے آباد ہو گئے جہاں پہنچنے کے لیے لوگوں نے ٹرین کے ذریعے بھی آنا شروع کر دیا مگر کوئی مسافر گاڑی رات کے وقت یہاں نہیں ٹھہرتی۔

دن کے وقت گاڑی ٹھہرتی تو مسافروں کو جب تک سٹیشن ماسٹر کی طرف سے یقین نہ دلا دیا جاتا تھا کہ پلیٹ فارم پر اور اس کے آس پاس کوئی شیر چیتا نہیں آیا کوئی مسافر ٹرین سے نہیں اترتا تھا۔ اس کے باوجود گومل واڑی کے سٹیشن پر آدم خور شیر کسی مسافر کو اٹھا لے جاتے تھے۔ سٹیشن کا سٹاف سٹیشن کے واحد کمرے میں بند رہتا۔ شام کو فارسٹ گارڈ کے ساتھ یہ لوگ اپنے کوارٹروں میں جاتے اور صبح تک کوارٹروں کے لوہے کی سلاخوں والے دروازے بند رکھتے تھے۔

را نے تخریب کاری کی تربیت کے لیے خدا جانے کیا سوچ کر یہی علاقہ چنا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ یہ علاقہ ویران رہتا تھا کوئی انسان آتا جاتا نہیں تھا۔ چنانچہ را کے ایجنٹ راز داری اور خفیہ طور پر تربیتی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے تھے۔ وزیر علی کے مخبروں کے بیان کے مطابق را کی پاکستان دشمن تنظیم نے بھارت سرکار کی امداد سے گومل واڑی کے جنگلاتی ٹیلوں کے درمیان ایک جگہ جنگل کو صاف کروا کر دو تین بیرکیں بنوا لی تھیں جہاں ایک اونچا واچ ٹاور بھی تھا جہاں ایک سنتری دوربین لیے یہ دیکھتا رہتا تھا کہ کہیں اس طرف کوئی شیر

پاکستان ورچوئل لائبریری

چیتا یا کوئی دوسرا جنگلی درندہ تو نہیں داخل ہو گیا۔ تخریب کاری کے اس تربیتی کیمپ میں اس وقت سات بھارتی تخریب کاروں کو تربیت دی جا رہی تھی۔ تربیت دینے والے دو انسٹرکٹر تھے جن میں ایک ہندو تھا جس کا نام چونی لال تھا جو بہار کا رہنے والا تھا۔ دوسرا انسٹرکٹر ایک اسرائیلی تھا جو بڑی روانی سے اردو ہندی بول لیتا تھا اور فلسطین میں ایک عرصے تک اسرائیلی حکومت کی طرف سے تخریب کاری کرتا رہا تھا۔ اس اسرائیلی کا نام جیکب تھا اور وہ مسلمانوں کا جانی دشمن تھا اور پاکستان کے خلاف دل میں نفرت کے شدید جذبات رکھتا تھا۔ تربیتی کیمپ پہاڑیوں کے درمیان ایک وادی نما جگہ پر تھا۔ اس کے اردگرد کانٹے دار دیوار کھنچی ہوئی تھی۔

زیر تربیت ساتوں تخریب کار رات کو بارک میں سوتے تھے۔ ہندو انسٹرکٹر اور اسرائیلی انسٹرکٹر بارک کے پیچھے دو الگ الگ کوارٹروں میں رہتے تھے۔ ان کے وہ الگ الگ باورچی تھے جو ان کے لیے کھانا وغیرہ بناتے تھے۔ ان کے لیے راشن پانی اور ٹریننگ میں کام آنے والا اسلحہ وغیرہ بھی کبھی مال گاڑی اور کبھی وہ مسافر ٹرین لے کر آتی تھی جو گومل واڑی کے سٹیشن پر بمشکل ایک منٹ رکتی تھی۔ پیشہ ور عورتوں کو جس کیمپ میں تخریب کاری کی ٹریننگ دی جاتی تھی وہ گومل واڑی میں نہیں تھا۔ یہ تربیتی کیمپ بھارت کے صوبہ اتر پردیش میں مراد آباد کے جنوب میں سمبل کے ایک فاریسٹ ریسٹ ہاؤس میں قائم کیا گیا تھا۔ سمبل سے چمبل کے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ اس کیمپ کے بارے میں وزیر علی کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں جن پیشہ ور لڑکیوں کو پاکستان میں جا کر تخریب کاری کی تربیت دی جانے والی ہے ان کا انتخاب مشرقی پنجاب کی ہندو لڑکیوں میں سے کیا جا رہا ہے۔ جن کی مادری زبان پنجابی ہو اور اردو بھی روانی سے بول لیتی ہوں۔ ایسی پیشہ ور لڑکیوں کو خاص طور پر ترجیح دی جا رہی ہے جو انگریزی میں بھی بات چیت کر سکتی ہوں اور

جنہیں جدید فیشن کے بارے میں بھی پوری شدھ بدھ ہو۔ جو انتہائی خوبصورت ہوں۔ اس کیمپ میں ابھی ٹریننگ شروع نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ہمارا ٹارگٹ گومل واڑی کا ٹریننگ سنٹر تھا۔

وزیر علی سے پوری تفصیل سننے کے بعد میں نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو۔"

وزیر علی کہنے لگا۔

"حیدر علی! را کا یہ تخریب کار کا ٹریننگ کیمپ صرف پاکستان کے خلاف ہی نہیں ہے بلکہ ہم بھارت کے مسلمانوں کے خلاف بھی ہے کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے۔ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ پاکستان کی طاقت ہماری طاقت ہے۔ اگر پاکستان کو خدانخواستہ کوئی نقصان پہنچتا ہے تو وہ ہمارا بھی نقصان ہے۔"

میں نے اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال میں مجھے کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ بات تو طے ہے کہ گومل واڑی کا تخریب کاری کا کیمپ مجھے ہر حالت میں تباہ کرنا ہوگا۔ لیکن یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ اس مشن کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ تم بھارت کے باشندے ہو اور یہاں کے سارے علاقوں اور ان علاقوں میں رہنے والوں سے واقف ہو۔"

وزیر علی نے فوراً کہا۔

"حیدر علی! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اس مشن میں میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا۔ اسلام اور پاکستان کی سلامتی کے لیے تو ہماری جان بھی چلی جائے تو ہم اسے اپنی خوش نصیبی سمجھیں گے۔ ہم تمہیں کیسے اکیلا چھوڑ سکتے ہیں ہم اس مشن میں تمہارے ساتھ ہوں گے اور اس سے پہلے کہ اس تربیتی کیمپ کا کوئی دہشت گرد ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں داخل ہو ہم گومل واڑی کے جنگل میں ہی اس کا سر کچل ڈالیں گے۔"

وزیر علی کے اس عزم نے میرے جسم میں ایک نئی طاقت بھر دی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے دبایا اور کہا۔

"تم میرے سچے مومن بھائی ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ ہمارا طریق کار کیا ہونا چاہیے؟"

وزیر علی کہنے لگا۔ "اس سے پہلے کہ ہم کوئی طریقہ کار وضع کریں مجھے گومل واڑی پہنچ کر تربیتی کیمپ کا پورا سروے کرنا ہو گا۔ وہاں کا محل وقوع دیکھنا ہو گا۔ زیر تربیت بھارتی دہشت گردوں کے روز مرہ معمولات کا جائزہ لینا ہو گا۔ یہ معلوم کرنا ہو گا کہ ہفتے میں دو بار ان کے لیے مال گاڑی یا مسافر گاڑی میں راشن پانی اور اسلحہ کی جو سپلائی آتی ہے اس کے لینے کون کون لوگ جاتے ہیں۔ ان کے اسلحہ کے ذخیرے کا پتہ چلانا ہو گا کہ ان کے پاس کس قسم کا اور کتنا اسلحہ ہر وقت موجود رہتا ہے اور رات کے وقت وہاں پہرے کی کیا صورت حال ہوتی ہے۔ میں نے فی الحال اپنے مشن کو ملتوی کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلے ان مسلمان دشمن تخریب کاروں کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔"

میں نے کہا "انداز!" تم کو وہاں کتنے دن لگ جائیں گے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" وزیر علی نے کہا۔ "بہرحال ایک ہفتہ تو ضرور لگ جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم وہاں اکیلے جاؤ گے؟ وہاں تو بقول تمہارے ہر طرف ہیبت ناک جنگل ہے جہاں دن کے وقت بھی آدم خور شیر پھرتے رہتے ہیں۔ تم وہاں ایک ہفتہ کہاں رہو گے؟"

وزیر علی مسکرانے لگا۔ بولا۔

"یہ ساری باتیں تم مجھ پر چھوڑ دو۔ مجھے معلوم ہے وہاں مجھے کہاں ٹھہرنا ہو گا اور پھر میں اکیلا نہیں ہوں گا۔ قادر خان میرے ساتھ ہو گا۔ وہ اس علاقے میں جنگل کے ایک ٹھیکیدار کے ساتھ دو تین برس گزار چکا ہے اور جنگل کے

اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔

میں اس پرانی حویلی میں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں مجھے سوائے اس کے اور کوئی بوریت نہیں تھی کہ میں اکیلا تھا۔ لیکن اب میں کسی وقت حویلی سے نکل کر آس پاس کے درختوں اور جنگل میں ٹہلنے نکل جاتا تھا۔ اگرچہ وزیر علی نے مجھے زیادہ دور جانے سے منع کر رکھا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"اگرچہ یہ علاقہ شہر سے کافی دور ہے اور جنگل میں ادھر جنگل درندوں کا بھی زیادہ خطرہ نہیں ہے پھر بھی بمبئی کی خفیہ پولیس بڑی چالاک ہے۔ ممکن ہے انٹیلی جینس کا کوئی آدمی پھرتا ہوا اس طرف سے آ نکلے۔"

چنانچہ میں وزیر علی کی ہدایت کے مطابق ٹہلنے کے واسطے زیادہ دور نہیں جاتا تھا اور اردگرد کے ماحول سے بھی ہوشیار رہتا تھا۔ وزیر علی را کے ٹریننگ سنٹر کا سروے کرنے جا چکا تھا۔ قادر خان بھی اس کے ساتھ ہی گیا تھا۔ ایک دن سلطان بھائی اور رمضان بھائی مجھ سے ملنے شام کے وقت آ گئے تھے۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اس کے بعد وہ واپس چلے گئے۔

وزیر علی نے ایک ہفتے کی بجائے پورے نو دن لگا دیے۔ دسویں دن وہ آ گیا کہنے لگا۔

"ہم رات کی گاڑی سے آ گئے تھے۔ اس وقت رات زیادہ ہو گئی تھی میں نے سوچا صبح تم سے ملنے جاؤں گا۔"

پھر اس نے مجھے کومل واردی کے را کے ٹریننگ کیمپ کے بارے میں ان لوگوں کے معمولات کی پوری تفصیل سنائی جو ہمارے مشن کے لیے بے حد فائدہ مند تھی۔ کہنے لگا۔

"ان کے پاس اسلحہ کوئی اتنا زیادہ نہیں ہوتا۔ دس بارہ آٹومیٹک پستولیں ہیں۔ چار چھ کلاشنکوفیں ہیں۔ ہفتے میں ایک بار ساتوں دہشت گردوں کو بم بنانے

اور لگانے کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ لیکن خطرے والی بات یہ ہے کہ انہوں نے تربیتی کیمپ کے اردگرد جھاڑیوں میں بارودی سرنگیں لگائی ہوئی ہیں۔ چونکہ یہ سرنگیں زمین میں دبائی گئی ہیں اس لیے ان کا پتہ چلانا مشکل ہے۔"

میں نے کہا۔ "انہوں نے اپنے آدمیوں کو ان بارودی سرنگوں سے بچانے کے لیے کوئی نہ کوئی نشانی تو وہاں ضرور لگائی ہوگی۔"

وزیر علی نے کہا۔ "بظاہر ہمیں وہاں سے ایسی کوئی نشانی لگی ہوئی نظر نہیں آئی لیکن اپنے آدمیوں کو خبردار رکھنے کے لیے وہاں کوئی نہ کوئی نشانی ضرور لگی ہوگی۔ اس کا ہمیں وہاں جاکر پتہ چل جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"رات کے وقت وہاں پہرے کی کیا پوزیشن ہوتی ہے؟"

وزیر علی بولا۔ "پہرے کی پوزیشن یہ ہے کہ دن کے وقت تو کیمپ کے جنوب میں سٹیشن کی جانب جو واچ ٹاور ہے اس پر ایک سنتری کی ہر وقت ڈیوٹی لگی رہتی ہے۔ اس کے پاس دوربین بھی ہوتی ہے اور لائیٹ مشین گن بھی اس نے لگائی ہوئی ہے۔ یہ واچ ٹاور موٹے موٹے بانسوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے جو زمین سے پچیس تیس فٹ اونچا ہوگا۔ یہاں ایک چھوٹی سرچ لائیٹ بھی لگی ہے جس کی روشنی کسی کسی وقت گھما پھرا کر سنتری آس پاس کے ماحول کا جائزہ لے لیتا ہے لیکن سرچ لائیٹ کی روشنی اس وقت اون کی جاتی ہے جب گارڈ سنتری کو جنگل میں کوئی آہٹ سنائی دیتی ہے چونکہ یہ کوئی جنگی کیمپ نہیں ہے اس لیے سیکورٹی اتنی سخت نہیں ہے یہ صرف را کی طرف سے دہشت گردوں کی ٹریننگ کو خفیہ رکھنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔"

جب میں نے وزیر علی سے پوچھا بلکہ اس سے مشورہ لیا کہ اس کیمپ کو تباہ کرنے کے سلسلے میں ہمارا طریق کار کیا ہوگا تو وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ وہ بہت کچھ سوچ کر آیا تھا پھر اب بھی بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ کوئی ایمونیشن ڈپو نہیں ہے کہ جسے بم لگا کر آن کی آن میں اڑا دیں گے یہ ٹریننگ سنٹر ہے اور یہاں سات جرائم پیشہ افراد کو ہر قسم کا اسلحہ چلانے اور بم لگانے بم بنانے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ یہ تربیت میری اطلاع کے مطابق دو ہفتے سے جاری ہے۔ اس دوران ان سات دہشت گردوں کا نشانہ کافی بہتر ہوگیا ہوگا۔ ہمارے مقابلے میں وہ زیادہ مہارت سے ٹارگٹ پر فائر کر سکتے ہیں ان حالات کے پیش نظر ہم ان دہشت گردوں کو ایک ساتھ ہی ہلاک نہیں کر سکتے کیونکہ وہ عام طور پر الگ الگ ہوتے ہیں بلکہ رات کے وقت بھی انہیں الگ الگ بارکوں میں سلایا جاتا ہے یہ را کے اسرائیلی انسٹرکٹر کی حفاظتی پیش بندی ہی ہو سکتی ہے تاکہ دشمن کا کوئی ایجنٹ وہاں آکر ان سب کو ایک ساتھ ہلاک نہ کر سکے ورنہ ان دہشت گردوں کے رات کے وقت بھی الگ الگ اور ایک دوسرے سے دور رکھ کر سلانے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم کسی طرح بارکوں کے نیچے بارود لگا کر انہیں اڑا بھی دیں تو یہ بات ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ساتوں دہشت گرد ہلاک ہوگئے ہیں' اس کے علاوہ تین بارکیں ہیں اور ان تین بارکوں کے نیچے گڑھے کھود کر بارود لگانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ بارکوں کے گرد رات کو برابر پہرہ لگا ہوتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر تمہارے خیال میں دوسرا کون سا طریق کار ہو سکتا ہے؟"

اس کے جواب میں وزیر علی ہنسنے لگا۔ میں حیران سا ہوا کہ وہ اتنے اہم اور سنگین سوال پر ہنسنے کیوں لگا ہے۔ کہنے لگا۔

"ہمیں ان دہشت گردوں کو ہلاک کرنے کے لیے غیر روایتی ہتھیاروں سے کام لینا پڑے گا۔"

وزیر علی کی یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے ہمیں اسلحہ کی بجائے بڑے کمانڈو چاقو استعمال کرنے ہوں گے؟"

وزیر علی نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔

"تو غیر روایتی ہتھیار کون سے ہوں گے؟"

وزیر علی اپنے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا کہنے لگا۔

"ہمیں سپیروں کا بھیس بدل کر جانا ہوگا۔"

میں اس کا منہ تکنے لگا۔ "سپیروں کا بھیس؟" میری زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔ "سپیرے وہاں کیا کریں گے؟"

وزیر علی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ چاند بائی چائے کی چینک ٹرے میں رکھے چلی آ رہی تھی۔ "بیٹا وزیر علی! اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو پہلے تم دونوں چائے پی لو۔ میں کھانا تیار کر رہی ہوں۔ آلو کی بھجیا بناؤں گی آج۔ تمہیں پسند ہے نا؟"

"ہاں بی اماں، بہت پسند ہے۔"

وزیر علی نے کرسی ذرا ایک طرف کر کے کہا۔ چاند بائی نے چائے کا ٹرے چارپائی پر میرے سامنے رکھ دیا اور "وہی بنا رہی ہوں" کہتی ہوئی چلی گئی۔ وزیر علی نے چائے پیالیوں میں ڈالی ایک پیالی مجھے دی اور دوسری پیالی خود لے کر چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔

"یہ فیصلہ میں نے اور قادر خان نے بہت سوچ بچار کے بعد کیا ہے۔"
میں نے کہا۔ "لیکن سپیرے بن کر ہم کیا کریں گے؟ ان لوگوں کو سانپ کا تماشا دکھائیں گے۔"

وزیر علی مزے سے چائے پی رہا تھا اور سامنے والی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی محویت کے عالم میں جیسے اپنے آپ سے بولا۔

"سانپوں کا ایسا تماشا دکھائیں گے کہ کسی نے آج تک نہ دیکھا ہوگا۔"

اس نے پیالی ٹرے میں رکھ دی اور کہنے لگا۔

"تم کیا سمجھتے ہو ہم احمق ہیں؟ ہمیں عقل نہیں ہے؟" "نہیں نہیں حیدر ملی' ایسی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ ہم بھگت کبیر جتنے عقل مند نہیں ہیں اور ہمارے پاس اسلام کے بہادر جرنیل محمود غزنوی جتنی فوجی طاقت بھی نہیں ہے یکن ہمیں خدا نے عقل ضرور دی ہے اور اس عقل کو استعمال کر کے ہم اپنے شمن کو ختم کر سکتے ہیں۔"

میں خاموش بیٹھا چائے پیتا رہا۔ وزیر علی کہہ رہا تھا۔

"قادر خان سانپوں کے بارے میں بہت علم رکھتا ہے۔ اس نے راجستھان ور بنگال کے سپیروں کے درمیان بہت وقت گزارا ہے۔ وہ سانپوں کو سدھانا ھی جانتا ہے۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔

"لیکن وزیر علی بھائی! سانپوں کا ہمارے اس مشن سے کیا تعلق ہے؟ سانپوں کا علم یہاں ہمیں کیا مدد دے سکتا ہے؟"

وزیر علی بولا۔ "سانپوں کا علم جس طرح ہماری مدد کرے گا' اسے تم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے یہ سب کچھ وقت آنے پر تمہیں اپنے آپ معلوم ہو جائے ۔ ابھی تمہیں میری کسی بات کا یقین نہیں آئے گا۔ آج رات ہم آرام کریں گے میں اور قادر خان بڑا لمبا ٹرین کا سفر کر کے آئے ہیں۔ کل رات کو ۹ بجے

والی گاڑی میں ہم گومل واڑی کے را کے تربیتی کیمپ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

اس کے بعد وزیر علی نے مجھ سے را کے تربیتی کیمپ مشن کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ میں نے ایک دو بار بات کرنی بھی چاہی تو اس نے کہا۔ "کل بات کریں گے۔"

وہ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھانے کے بعد چلا گیا۔ کہہ گیا کہ میں اور قادر خان کل دوپہر کے بعد آئیں گے۔ تم سفر کے لیے تیار رہنا۔ رات کو بستر پر لیٹ کر میں کافی دیر سوچتا رہا کہ سانپ ہمارے کس کام آئیں گے؟ یہ طریق کار مجھے الف لیلیٰ کی داستانوں والا لگ رہا تھا۔ دوسرے اور تیسرے پہر قادر خان اور وزیر علی اپنی پرانی کھٹارا گاڑی میں پہنچ گئے۔ قادر خان نے ایک چمڑے کا اٹیچی کیس اٹھا رکھا تھا۔ میں انہیں کھڑکی میں سے حویلی کے پرانے دروازے کی طرف جاتے دیکھ رہا تھا۔ صحن کی طرف سے ہو کر وہ میرے کمرے میں آ گئے۔ السلام علیکم۔ دونوں نے یک زبان مجھے سلام کیا' ہاتھ ملائے۔ قادر خان نے اٹیچی کیس چارپائی کے پاس زمین پر رکھ دیا۔ میں نے پوچھا۔

"اس میں کیا ہے قادر بھائی؟"

وہ حاجیوں والے زرد رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"اس میں بڑے زہریلے سانپ ہیں۔"

اور دونوں ہنس پڑے۔ میں نے دل میں کہا۔ یا اللہ خیر ہو۔ یہ سانپوں کا مشن مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ کہیں کوئی الٹی سیدھی بات نہ ہو جائے۔ چاند بائی ہمارے لیے چائے لے آئی۔ ہم چائے پینے اور موسم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ قادر خان نے بات کا رخ بدلتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"حیدر بھائی! تمہارا ہم شکل دھرم چند دہشت گردی کی ماڈرن طریقے سے ٹریننگ لینے اسرائیل کے ملک گیا ہوا ہے۔ اسے بھارت کی کندریہ انٹیلی جنس

نے را کے خرچ پر بھیجا ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہاں ٹریننگ لے کر بھی وہ ہمارے ملک پاکستان کا بال بھی انکا نہ کر سکے گا۔"

وزیر علی بولا۔ "یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پاکستان بڑی قربانیوں کے بعد بنا ہے۔ پاکستان ایک طاقتور ملک ہے۔ پاکستان کے مسلمان اپنے وطن کی حفاظت کرنا اور دشمن کو تہس نہس کرنا جانتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ بھارت ورش کے ہندو اور ہندو سرکار اس شکست کو ابھی تک نہیں بھولی۔ ساری دنیا میں بھارت کی بدنامی ہوئی کہ اتنے بڑے ملک نے اتنی بڑی فوج' تنے زیادہ جنگی ساز و سامان کے ساتھ اتنے چھوٹے سے ملک پر حملہ کیا تھا اور اکستان کی ایک انچ زمین پر بھی قبضہ نہ کر سکے بلکہ کھیم کرن اور چھمب جوڑیاں ھی اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھے لیکن ہندو کی ذہنیت سے شاید تم ابھی واقف نہیں ہو ہ میدان جنگ میں تم سے شکست کھا جائے گا لیکن اندر ہی اندر تمہاری جڑیں اٹتا رہے گا۔ بس تمہیں ہندو کے اس حملے سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم نے بالکل سو فیصد درست بات کہی ہے وزیر بھائی۔ لیکن کستان کے لوگ اپنے دشمن کی سازشوں اور اس کی مکار ذہنیت سے اچھی طرح اقف ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے دشمن کو پہچان لیا ہے۔ اب ہم میدان جنگ یں بھی ہندو کو شکست دیں گے اور میدان جنگ کے باہر بھی اس کی کسی پاکستان شمن کسی ناپاک سکیم کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔"

قادر خان کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے اس بار دھرم چند اسرائیل کے ملک سے ٹریننگ لے کر اپس آئے تو اس کا کام بھی تمام کر دیا جائے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی نسری۔ کچھ بھی ہو یہ آدمی پاکستان اور بھارت کے مسلمانوں کے لیے انتہائی طرناک ہے۔"

میں نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"اس کا کام میں تمام کروں گا۔ میں اس کے تمام ہتھکنڈوں سے واقف ہوں۔ ایک بار وہ میرے جال میں آگیا تو پھر میں اسے بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

میں نے وزیر علی سے بال ٹھاکرے اور بالا جی راؤ کے بارے میں پوچھا کہ ان کو کہیں میرے زندہ بچ نکلنے کا علم تو نہیں ہوگیا۔ وزیر علی نے ہنس کر کہا۔

"حیدر بھائی! ہم نے کچی گولیاں کبھی نہیں کھیلیں۔ ہم بڑا پکا پاؤں ڈالتے ہیں۔ بال ٹھاکرے کے ڈ-تھ چیمبر تک اپنے مسلمان ڈاکٹر کو پہنچانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ شیوسینا کے جاسوس تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ ہم نے ان کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک دی۔ یہ صرف عقل کی فتح نہیں ہے بلکہ اس میں ہمارا جذبہ بھی کام کر رہا ہے۔ اسلام کی فتح اور کافر کا سر کچل ڈالنے کا جذبہ۔ کافر بھی وہ کہ جو اسلام کے خلاف گھناؤنی سازشیں کر رہا ہے اور بھارت کے شہروں میں موقع ملتے ہی مسلمانوں کو قتل کرنا' ان کی بچیوں کی بے حرمتی کرنا' انہیں اغوا کرنا اور ان کے گھروں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ ہندو ہمارا اصل دشمن ہے بھارت میں جو امن پسند ہندو ہیں ہماری ان سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم تو اپنے دشمنوں کے دشمن ہیں۔ بال ٹھاکرے کے باپ کو بھی کبھی علم نہیں ہو سکتا کہ جس حیدر علی کو اس نے اپنی دانست میں زہر کا انجکشن دے کر قبر میں دفن کر دیا تھا وہ زندہ ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ تم اس کے سامنے نہ چلے جاؤ اور وہ تمہیں بمبئی کے کسی بازار میں چلتا پھرتا دیکھ کر پہچان نہ لے۔ ہم چائے بھی پیتے رہے اور باتیں بھی کرتے رہے۔ جب سہ پہر کے پانچ بجے تو وزیر علی نے قادر خان سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں تیاری پکڑنی چاہیے۔ ابھی ہمیں سٹیشن پر بھی جانا ہے۔"

قادر خان نے اٹیچی کیس کھول دیا۔ اس میں گیروے رنگ کے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ تین لمبے لمبے کرتے تھے' تین دھوتیاں تھیں' تین گلے میں لٹکانے والے کپڑے کے جھولے تھے' تین بنیں تھیں یہ سارا لباس اس علاقے کے سپیروں کا تھا۔ وزیر علی نے مجھ سے کہا۔

"حیدر علی! اب کوئی سوال مت پوچھنا۔ جس طرح ہم کرتے ہیں تم بھی کرتے جاؤ۔"

ہم نے اپنے کپڑے اتار کر سپیروں کا لباس پہن لیا۔ سروں پر بھی گیروے رنگ کے رومال باندھ لیے۔ وزیر علی نے ہم سب کو شہری لباس یعنی بش شرٹیں اور پتلونیں ایک طرف تہہ کر کے رکھ دیں۔ اپنی صدری کی جیب میں سے اس نے بٹوہ نکال کر کھولا۔ اس میں کافی کرنسی نوٹ تھے۔ وزیر علی نے تین سو روپے مجھے دیے۔ تین سو روپے قادر خان کو دیے اور باقی روپے اپنے لمبے کرتے کے اندر جو صدری تھی اس کی جیب میں رکھ لیے۔

میں نے کہا۔

"ہمیں اپنے پاس اسلحہ نہیں تو کم از کم ایک ایک بڑا چاقو ضرور رکھنا چاہیے۔"

قادر خان نے اٹیچی کیس میں ہاتھ ڈال کر ایک تھیلا نکالا اس میں سے تین کمانڈو چاقو اور ایک آٹومیٹک پستول تھا۔ چاقو انہوں نے اپنے پاس رکھ لیے اور آٹومیٹک پستول مجھے دے کر بولا۔

"ہمیں معلوم ہے تم تربیت یافتہ گوریلے ہو۔ پستول بھی تم اپنے پاس ہی رکھو۔"

میں نے پستول کو غور سے دیکھا۔ بڑا جدید قسم کا پستول تھا۔ اسکے آگے سائی لینسر بھی لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے فائر کا دھماکہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے روپے چاقو اور پستول اپنے گیروے رنگ کے لمبے کرتے کے اندر صدری کی

جیب میں رکھ لیا۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"قادر بھائی ہم سپیرے تو بن گئے ہیں لیکن ہمارے پاس سانپ ایک بھی نہیں ہے۔"

قادر خان مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"دلہا کے بغیر بھی کبھی برات سجی ہے۔"

اس نے اٹیچی کیس میں ہاتھ ڈال کر ایک درمیانے سائز کی پٹاری نکالی جس پر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ کپڑے ہٹا کر اس نے پٹاری ہمارے درمیان فرش پر رکھ دی۔ اپنے ایک ہاتھ میں رومال پکڑ لیا اور بولا۔

"پیچھے پیچھے ہٹ جاؤ ان سانپوں کا زہر نہیں نکالا گیا۔"

میں اور وزیر علی پرے ہٹ گئے۔ قادر خان نے پٹاری کا ڈھکنا اٹھایا تو اس کے اندر سے پھنکاروں کی آواز آئی۔ میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے دیکھا کہ پٹاری میں بالشت بالشت بھر کے کتنے ہی سانپ ایک دوسرے میں گھس کر رینگ رہے تھے اور اپنے انسانی انگوٹھے کے برابر اپنے منہ اٹھا اٹھا کر زبانیں باہر نکال رہے تھے۔ ان سانپوں کے رنگ مٹیالے تھے۔ قادر خان کہنے لگا۔

"یہ بہت ہی زہریلے سانپ ہیں۔ میں اپنے ایک بڑے پرانے دوست سپیرے سے ایک مہینے کے لیے مانگ کر لایا ہوں۔ میں نے ان کے کاٹے سے ایک آدمی کو مرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سانپ نے اس کے پاؤں پر ٹخنے کے قریب کاٹا تھا۔ جیسے ہی سانپ نے اسے کاٹا وہ کھڑے قد سے گر پڑا تھا۔ جیسے کوئی ٹہنی درخت سے کٹ کر گرتی ہے۔ نہ اس کے جسم سے خون نکلا' نہ منہ ناک سے خون نکلا' نہ اس کا جسم نیلا پڑا' نہ اس کا جسم گلا سڑا۔ بس وہ پتھر بن گیا تھا۔ ہم نے اسے ہاتھ لگا کر دیکھا تو اس آدمی کا جسم ایسا تھا جیسے ٹھنڈا پتھر ہوتا ہے۔ ایک آدمی نے اس کے پاؤں کے انگوٹھے پر چھڑی ماری تو انگوٹھا یوں ٹوٹ

کر الگ ہوگیا جیسے مٹی کے لوٹے پر چھڑی ماری جائے تو اس کی ٹوٹنی الگ ہو جاتی ہے۔ جب میں نے اپنے بنگالی سپیرے استاد سے اس سانپ کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ یہ مہاپدم سانپ ہے۔ اس کے کاٹنے سے آدمی اور جانور کا جسم ایک دم سے پتھر بن جاتا ہے۔ پھر اس نے مجھے اس سانپ کی ایک ایسی خوبی یا وصف بتایا جس کو سن کر مجھے الف لیلیٰ کی کہانیاں یاد آ گئیں۔ میرے بنگالی استاد سپیرے نے بتایا کہ اس سانپ میں یہ وصف ہے کہ اسے دشمن کے جسم سے اترا ہوا کوئی کپڑا سنگھا دیا جائے اور اس کے بعد اسے کچھ کھانے پینے کو نہ دیا جائے پھر اسے نکال کر چھوڑا جائے تو دشمن جہاں ہوگا یہ سانپ اس کی بو پر وہاں پہنچ جائے گا اور اسے کاٹ کر اپنے سپیرے کے پاس واپس آ جائے گا۔ دشمن چاہے ملک کے کسی کونے میں ہو یہ وہاں پہنچ جائے گا۔ راستے میں چاہے آندھی آئے' طوفان آئے یہ آندھی طوفان گزر جانے کے بعد دوبارہ اس آدمی کی بو پر چل پڑے گا۔ یہ جس آدمی کے اترے ہوئے کپڑے ایک بار سونگھ لے اسے اس آدمی کے جسم کی بو سینکڑوں میل سے محسوس ہو جاتی ہے۔ یہ خاص وصف قدرت نے صرف اسی مہاپدم سانپ کو دیا ہے۔"

اب میں سمجھ گیا تھا کہ ان لوگوں کا منصوبہ کیا ہے۔ جب میں نے اس منصوبے کی کامیابی کے امکانات کا ذکر کیا تو وزیر علی بولا۔

"حیدر بھائی! ہم تمہاری طرح تربیت یافتہ گوریلے یا کمانڈو نہیں ہیں۔ ہمیں ہر طرح کے حربے استعمال کر کے دشمن کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم دشمن کو قتل کرتے ہوئے کبھی نہیں جھجکتے۔ اس وقت ہم جہاد کے میدان میں ہوتے ہیں اور کافر کو صرف اس لیے قتل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کا دشمن ہے۔ ہم اپنے مشن کے دوران جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ہمارے وسائل بھی محدود ہیں۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ بھی نہیں ہے کہ دشمن کے ساتھ زیادہ دیر پوزیشن میں رہ کر لڑائی کر

سکیں۔ ہمیں عیاری اور چالاکی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہم ہر وہ حربہ استعمال کرتے ہیں جس سے ہم اسلام کے دشمنوں کو تہہ تیغ کر سکیں۔ میرا خیال ہے اب تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔"

"بالکل سمجھ گیا ہوں۔"

میں نے کہا اور دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ مجھے اس موذی سانپ سے اپنے پناہ میں رکھنا۔ سات بجے ہم نے شام کا کھانا کھا لیا اور پونے آٹھ بجے جب اندھیرا چھا گیا تو ہم گاڑی میں بیٹھ کر قریبی ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہماری گاڑی بمبئی کے مضافاتی جنگلوں کے پہاڑی راستوں میں سے گزر رہی تھی۔ اندھیرے میں صرف گاڑی کی بتیاں ہی ہمیں راستہ دکھا رہی تھیں۔ ساڑھے آٹھ بجے ہم ایک ریلوے سٹیشن کے قریب پہنچے۔ سٹیشن کی روشنیاں دیکھ کر وزیر علی نے گاڑی ایک طرف پہاڑی کی کھوہ میں کھڑی کر کے اس کے اوپر جھاڑیوں کی شاخیں کاٹ کر ڈال دیں۔ اب ہم پورے سپیروں کے بھیس میں سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ میں اس ریلوے سٹیشن کا نام نہیں لکھوں گا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ بھارت کے یہ مسلمان مجاہد آج بھی اپنے حقوق اور آزادی اور عزت نفس کے وقار کے لیے ہندو سے جنگ لڑ رہے ہوں گے اور کوئی عجب نہیں کہ آج بھی احمد آباد اور سورت کے یہ مسلمان مجاہد اس پرانی حویلی کو اپنی خفیہ پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر رہے ہوں۔ اس لیے میں یہاں اس ریلوے سٹیشن کا نام نہیں بتاؤں گا۔ ہم سٹیشن کے برآمدے میں جا کر بیٹھ گئے۔

گاڑی کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ یہ بمبئی سے بھوپال جانے والی گاڑی تھی۔ ایک قلی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ ہم سپیروں کی طرح وہیں برآمدے کے فرش پر ایک طرف ہو کر بیٹھے رہے۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہ دی۔ سپیرے سادھو سنیاسی بھارت کے سٹیشنوں اور شہروں میں عام نظر آجاتے تھے۔ وزیر علی نے کہا۔

"میں جا کر ٹکٹ لے آتا ہوں۔ تم یہیں بیٹھو۔"

وہ اپنا جھولا اور بین ہمارے پاس رکھ کر اس طرف چلا گیا جہاں لوگ گاڑی کے ٹکٹ لے رہے تھے۔ زہریلے سانپوں والی پٹاری قادر خان کے جھولے میں تھی۔ سانپوں کو اس نے اپنے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی ایسی دوائی یا مہرہ نہیں ہے جس کو پینے یا منہ میں رکھنے سے ان سانپوں کے کاٹنے کا اثر نہ ہو۔"

قادر خان ہنس کر کہنے لگا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں کسی سانپ کو تمہارے پاس نہیں آنے دوں گا۔ ویسے ان سانپوں کے کاٹنے کی کوئی دوا میرے علم میں نہیں ہے۔ پرانے تجربہ کار سپیرے بھی ان سانپوں سے کبھی غافل نہیں ہوتے اور بڑی عقل مندی سے انہیں پکڑتے ہیں۔ کوئی مہرہ بھی ایسا نہیں ہے جو ان سانپوں کا زہر انسان کے جسم سے چوس لے۔ ان کا زہر اتنا موقع ہی نہیں دیتا۔ ادھر یہ کاٹتے ہیں ادھر آدمی گر کر پتھر ہو جاتا ہے۔ پتھر میں سے مہرہ زہر کہاں سے چوسے گا؟"

اتنے میں وزیر علی ٹکٹ لے کر آ گیا۔ اس نے ایک ایک ٹکٹ ہمارے حوالے کر دیا۔ کہنے لگا۔

"ٹکٹ بابو کہہ رہا تھا ٹرین نے کچھ لیٹ نکال لیا ہے۔ پندرہ بیس منٹ میں پہنچنے والی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں پلیٹ فارم پر چلے چلنا چاہیے۔"

ہم برآمدے سے اٹھ کر پلیٹ فارم پر گئے۔ وہاں مسافروں کا کافی رش تھا بھارت کی آبادی کافی بڑھ گئی تھی۔ پندرہ بیس برس پہلے اتنی آبادی نہیں تھی ٹرین آ گئی۔ ہم تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ میرے پاس آٹو میٹک پستول تھا جو بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنے لمبے کرتے بلکہ چولے کے اندر صدری کی جیب میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ ساتھ فالتو گولیوں کا ڈبہ بھی تھا۔ دوسری جیب میں بڑا کمانڈو چاقو بھی تھا۔ چونکہ ہم سپیروں کے بھیس میں تھے اس لیے ہم پر کسی کو شک نہیں پڑ سکتا تھا۔ ٹرین چل پڑی۔ پہلا بڑا سٹیشن دیولالی آیا۔ اس کے بعد ناسک کا شہر آیا۔ ناسک سے ٹرین بھوساول کھنڈوا والی لائن پکڑ لی۔ بھوساول کہیں رات کے دو بجے آیا۔ یہ جنکشن تھا یہاں سے اورنگ آباد کی طرف ایک ریلوے لائن جاتی تھی۔ بھوپال کا سٹیشن دوسرے دن نو دس بجے کے قریب آیا۔ یہاں سے ہم ناگ پور جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئے۔ یہ ٹرین گومل واڑی نہیں ٹھہرتی تھی۔ ہمیں گومل واڑی ہی جانا تھا۔ ہم اس سے سات میل پیچھے ایک سٹیشن پر اتر گئے۔

یاد نہیں رہا اس سٹیشن کا کیا نام تھا۔ اس وقت دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ سٹیشن پہاڑی کے نشیب میں ایک سنسان جنگل میں واقع تھا۔ میں نے وزیر علی سے پوچھا کہ یہاں سے ہمیں کوئی بیل گاڑی وغیرہ نہیں مل سکتی۔ وہ بولا۔

"ہو سکتا ہے مل جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں سات میل پیدل چلنا پڑے۔ تم تو کمانڈو ہو۔ تمہیں دشواری نہیں ہونی چاہیے۔

میں نے کہا۔ "نہیں مجھے کوئی دشواری نہیں ہو گی۔"

قادر خان کہنے لگا۔ "فکر نہ کرو۔ گومل واڑی کا تربیتی کیمپ یہاں سے سات میل کے فاصلے پر ہے مگر ہمیں پانچ میل ہی چلنا پڑے گا۔ وہاں ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں آتا ہے۔ یہ گاؤں ان لوگوں نے آباد کیا ہے جو گومل واڑی کے را کیمپ کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان میں ایک گوالے کا گھر ہے جو تربیتی کیمپ کو تازہ دودھ وغیرہ سپلائی کرتا ہے۔ دو تین گھر کیمپ میں صفائی وغیرہ کرنے والوں کے ہیں۔ ایک مستری ہے' ایک بجلی کا کام کرنے والے کا گھر ہے اور دو گھر دھوبیوں کے ہیں جو کیمپ میں رہنے والوں کے کپڑے وغیرہ پہاڑی ندی پر لے جا کر دھوتے ہیں۔"

"کیا ہم ان گاؤں والوں کے پاس جا رہے ہیں۔"

میرے سوال پر وزیر علی کہنے لگا۔

"قادر خان سب کچھ سوچ سمجھ کر اپنے منصوبے کے مطابق کام کر رہا ہے۔ بس تم دیکھتے جاؤ کہ جہاں جانباز کمانڈو اپنا مشن پورا نہیں کر سکتے وہاں ہم ایسے مجاہد عیاری سے کس طرح کام لیتے ہیں۔"

راستہ جنگلاتی تھی۔ جھاڑیاں' درختوں کے جھنڈ ندی نالے تھے۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ حبس بہت ہو رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم پسینے میں شرابور ہو گئے۔ خوش قسمتی سے دو ڈھائی میل چلنے کے بعد ایک بیل گاڑی مل گئی جو پیچھے سے آ رہی تھی۔ گاڑیبان نے تین سپیروں کو پیدل جاتے دیکھا تو قریب آ کر گاڑی روک لی۔ قادر خان نے اس علاقے کی دیہاتی زبان میں گاڑیبان سے کہا۔

"بھیا ہمیں گومل واڑی کے دھوبیوں کے گاؤں جانا ہے۔ لے چلو گے؟"

گاڑی بان بولا۔ "بیٹھ جائیں مہاراج' میرا کیا لگتا ہے آ جائیں۔"

گاڑی کے آگے دو بیل جتے ہوئے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بیٹھنے سے جسم کو تھوڑی ٹھنڈی ہوا لگی تو کچھ سکون محسوس ہوا۔ گاڑی پہاڑی جنگل کے نشیب و فراز میں آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتی سفر کرتی رہی۔ گاڑیبان نے قادر

خان سے پوچھا۔

"بھیا آپ لوگ جنگل میں سانپ پکڑنے جا رہے ہیں تو مال کنڈی ندی کے طرف ہمنیر کالے سانپوں کا ایک جوڑا رہتا ہے۔ اس جوڑے نے ادھر سے راستہ بند کر رکھا ہے۔ ان کو جا کر ضرور پکڑو۔ بڑے پن کا کام ہوگا۔"

قادر خان بولا۔

"ادھر بھی ضرور جائیں گے اور جوڑے کو پکڑ لیں گے' شانت رہو۔"

سورج مغرب کی طرف پہاڑیوں کے اوپر جھکنا شروع ہو گیا تھا کہ مجھے دور سے ایک ٹیلے کے پاس کچھ ڈھلواں چھتوں والے جھونپڑی نما مکان نظر آئے یہ وہی گاؤں تھا جہاں ہمیں جانا تھا۔ ہم گاؤں سے تھوڑا پہلے گاڑی سے اتر گئے۔ قادر خان کو سپیروں والی بین بجانی خوب آتی تھی۔ مجھے اور وزیر علی کو بالکل نہیں آتی تھی۔ قادر خان نے ہمیں صرف اتنا سکھا دیا تھا کہ جب وہ بین بجا رہا ہوتا تھا تو ہم اپنی اپنی بین میں سے لمبی آواز نکال لیتے تھے۔

گاؤں کے قریب پہنچے تو قادر خان نے ہمیں اشارہ کیا اور خود بین بجانی شروع کر دی۔ ہم بھی اپنی اپنی بین منہ کے ساتھ لگا کر اس میں سے تھوڑی تھوڑی آواز نکالنے لگے۔ اسی طرح بین بجاتے ہم دس بارہ جھونپڑی نما بوسیدہ مکانوں کی بستی میں داخل ہوئے تو بچے دوڑ دوڑ کر ہمارے پاس آنے لگے۔ کچھ بوڑھے مرد جھونپڑوں کے باہر بیٹھے ناریل کے حقے پی رہے تھے۔ عورتیں اپنے اپنے کاموں میں لگی تھیں۔ کہیں کہیں چولہوں میں آگ جل رہی تھی اور عورتیں روٹیاں پکا رہی تھیں۔ کچھ جوان مرد درختوں کے تنوں سے بندھی ہوئی رسیوں پر سکھانے کے لیے کپڑے ڈال رہے تھے۔ قادر خان نے بین بجانی بند کر دی۔ ہم جھونپڑی کے باہر چارپائی پر بیٹھے ایک سیاہ رنگ کے بوڑھے کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ بوڑھے نے پوچھا۔

"بھائی لوگ آپ کہاں سے آ رہے ہو؟"

قادر خان نے ان ہی کی زبان اور لہجے میں کہا۔

"ماراج ہم تو جنگل جنگل شہر شہر پھرنے والے سپیرے ماندری ہیں۔ ادھر پتہ چلا تھا کہ زمین کے اندر کسی راجہ کے خزانے پر دو سفید سانپ پہرہ دیتے ہیں بس انہیں پکڑنے آئے ہیں۔"

بوڑھے نے ہنس کر کہا۔

"بابا لوگ ادھر خزانہ دبا ہوا ہوتا تو ہم یہاں بیٹھ کر کیمپ والوں کی مزدوری نہ کرتے۔ تم کو کسی نے غلط خبر دی ہے۔"

وزیر علی بولا۔ "بابا! آپ ہمیں رہنے کو ایک جھونپڑی دے دو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ راجہ کا خزانہ ملا تو ہم سارا خزانہ تمہیں دے دیں گے کیونکہ ہم تو سفید سانپ پکڑنے کے واسطے آئے ہیں ہم سپیروں کو خزانے کی دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے۔"

بوڑھا لالچ میں آگیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر ناریل کا حقہ چارپائی پر ایک طرف لٹا کر آگے کو جھک کر وزیر علی سے کہنے لگا۔

"اگر تم لوگ وعدہ کرو کہ راجہ کے خزانے کا ذکر گاؤں کے کسی دوسرے آدمی سے نہیں کرو گے تو بے شک جتنے دن چاہو یہاں رہو۔ میں گاؤں والوں سے کہہ دوں گا کہ ادھر زہریلے سانپوں کا جوڑا آگیا ہے۔ یہ ماندری اسے پکڑنے آئے ہیں۔"

وزیر علی نے کہا۔

"بابا جی ہم وعدہ کرتے ہیں۔ اس بات کا ذکر ہم کسی دوسرے آدمی سے نہیں کریں گے۔"

بوڑھے نے ہمارے لیے ایک جھونپڑی نما کمرہ کھول دیا۔ اس نے گاؤں کے لوگوں کو بلا کر کہا کہ اس طرف جنگل میں بڑے زہریلے ناگوں کا جوڑا آگیا ہے۔ خطرہ ہے کہ وہ ہماری بستی میں نہ آجائے۔ یہ ماندری اس جوڑے کو پکڑ

کر لے جائیں گے۔ گاؤں کے دوسرے مردوں نے اس بات کو زیادہ اہمیت دی۔ وہاں سانپ بھی آ جایا کرتے تھے اور ان کی تلاش میں سپیرے لوگ آتے رہتے تھے کسی نے ہم پر کوئی اعتراض بھی نہ کیا اور اپنے اپنے کام مصروف رہے۔ بوڑھے کو ہم نے یقین دلا دیا کہ وہاں سے ایک میل کے فا پر جنگل میں ایک کھنڈر کے نیچے راجہ کا خزانہ دفن ہے۔ ہم وہ خزانہ ض تلاش کر لیں گے۔ بوڑھے نے پوچھا۔

"تم زمین کے اندر خزانہ کیسے دیکھو گے؟"

قادر خان نے کہا۔ "ہمارے پاس ایک ایسا سانپ ہے جو زمین سونگھ ہمیں بتا دے گا کہ یہاں زمین کے اندر خزانے کے سفید سانپوں کا جوڑا مو ہے۔ بس وہیں سے ہم زمین کھودنا شروع کر دیں گے۔ جب خزانہ مل گیا تو سفید سانپوں کے جوڑے کو پکڑ کر لے جائیں گے اور خزانہ تمہیں دے جا گے کیونکہ ہمارا خزانہ سانپ ہی ہیں۔ ہمیں دنیا والوں کے خزانوں سے ک دلچسپی نہیں ہوتی۔"

یہ بوڑھا ہماری بہت خاطر مدارت کرتا تھا۔ اس کا بیٹا گومل واڑی کے ت کیمپ میں مرمتوں وغیرہ کا کام کرتا تھا اور مستری تھا۔ بیرک کی کہیں سے چ ٹپک رہی ہوتی تو اسے درست کرتا۔ کہیں سے فرش اکھڑا ہوتا تو وہاں سیم سے مرمت لگا دیتا۔ رات کو ہم نے کھانا کھایا۔ بوڑھا حقہ لے کر ہمارے پ بیٹھا راجہ کے خزانے کی باتیں کرتا رہا۔ جب وہ چلا گیا تو ہم نے آپس میں باتیں شروع کر دیں۔ جھونپڑے میں لالٹینیں جل رہی تھیں۔ وزیر علی نے ق خان سے کہا۔ "اس بوڑھے کے ذریعے معلوم کرنا ہوگا کہ یہاں اس دھوب مکان کہاں ہے جو کیمپ کے آدمیوں کے میلے کپڑے لا کر دھوتا ہے۔"

قادر خان بولا۔

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا پہلے تو ہم دن نکلنے کے بعد گومل واڑی کیمپ

اردگرد چل پھر کا ایک بار پھر اس کا جائزہ لیں گے تاکہ اگر ہماری سانپوں والی سکیم کسی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہے تو ہم کسی دوسرے طریقے سے ان لوگوں کو ختم کر سکیں۔"

کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد ہم لوگ وہیں لیٹ کر سو گئے۔ دوسرے دن کافی دن چڑھے ہم سپیروں کے ہی بھیس میں گومل واڑی کیمپ کی طرف چل پڑے۔ بوڑھے کو ہم نے یہ کہا کہ راجہ کے خزانے کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ قادر نے کہا۔

"بابا! تم ساتھ چلو گے تو جس سانپ نے زمین سونگھ کر خزانے کا پتہ لگانا ہے وہ پٹاری سے باہر نہیں نکلے گا۔ تم گاؤں میں ہی رہو۔ اور فکر نہ کرو اگر خزانہ مل گیا تو ہم تمہیں وہاں لے جا کر خزانہ تمہارے حوالے کر دیں گے اور ہم خزانے کے سانپ لے کر چلے جائیں گے۔"

بوڑھا مطمئن ہو گیا۔ قادر خان ہماری راہ نمائی کر رہا تھا۔ گومل واڑی کیمپ وہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا مگر قادر خان ہمیں مختصر پہاڑی راستے سے لے جا رہا تھا۔ یہ سارا علاقہ حبس آلود تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں' جنگلی بیلوں سے ڈھکے ہوئے درخت اور زمین سے نکلے ہوئے بڑے بڑے پتھر تھے جن پر سبز کائی جمی ہوئی تھی کہیں کوئی کھیت نہیں تھا۔ کوئی آتا جاتا دیہاتی بھی ہمیں نہ ملا۔ ایک ٹیلے کا چکر کاٹ کر ہم باہر نکلے تو درختوں کے جھنڈ کے پار سامنے گومل واڑی تربیتی کیمپ تھا۔ پہلی نگاہ میں یہ مجھے جنگی قیدیوں کا کیمپ معلوم ہوا۔ چاروں طرف کانٹے دار تاروں کی اونچی دیوار تھی۔ ایک طرف اونچی مچان پر واچ ٹاور تھا۔ مغربی جانب تین بیرکیں تھیں۔

کیمپ کی طرف سے آدمیوں کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وزیر علی نے بتایا کہ دہشت گردوں کی ٹریننگ شروع ہو گئی ہے۔ ہم درختوں کے جھنڈ میں ایک جگہ آڑے کھڑے کیمپ کو دیکھ رہے تھے۔ قادر خان

بولا۔

"وزیر بھائی! یہاں تو اپنے سانپوں کی ترکیب ہی کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی دوسرا طریقہ اختیار کیا تو اس میں دشواریاں پیش آ سکتی ہے۔"

قادر خان کا مشورہ بالکل صورت حال کے مطابق تھا۔ کیونکہ ہم اپنے محدود وسائل اور مختصر اسلحے کے ساتھ کیمپ پر کمانڈو اٹیک نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے قادر خان سے پوچھا۔

"کیا آپ لوگوں کے سانپ آپ کو دھوکا بھی دے سکتے ہیں؟ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اس طریق کار سے زیادہ مطمئن نہیں ہیں۔"

قادر خان بولا۔ "سانپ آخر سانپ ہوتا ہے۔ کوئی گوریلا تو نہیں ہے کہ ٹارگٹ پر جا کر یا ٹارگٹ مار لے یا خود مر جائے۔ سانپ سے کوئی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم ہے بہرحال یہ طے شدہ بات ہے کہ ہمیں اپنے سانپوں سے ہی کام لینا پڑے گا۔ چلو واپس چلتے ہیں' جنگل خطرناک ہے۔ کسی طرف سے بھی کوئی درندہ نکل کر حملہ کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہمارے پاس درندے کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے چاقو اور آٹومیٹک پستول موجود ہیں۔"

وزیر علی کہنے لگا۔

"حیدر بھائی! یہاں ہلکے سے ہلکا درندہ بھی نکل کر آیا تو وہ شیر ہی ہو سکتا ہے اور شیر تمہارے آٹومیٹک پستول کی ساری گولیاں کھا کر بھی ہم سے ایک دو کو مار کر ہی مرے گا۔"

ہم واپس مڑ گئے۔ اب قادر خان اور وزیر علی کا مشن شروع ہوگیا۔ قادر خان نے بوڑھے کو جا کر بتایا کہ جنگل میں جا کر پٹاری سے سانپ باہر نہیں نکلا۔

بوڑھے نے پوچھا۔

"وہ باہر کیوں نہیں نکلا ماندری بھائی؟"

قادر خان نے کہا۔

"اس کی وجہ یہ ہے بابا کہ ان سانپوں کو مرد آدمیوں کے پرانے کپڑوں کے سونگھنے کی عادت پڑ گئی ہوئی ہے۔ اگر انہیں اردگرد موجود تمام مرد آدمیوں کے پرانے کپڑے ہمیں کسی طرح لا دو تو ہم اپنے سانپ کو باری باری سارے پرانے کپڑے سنگھائیں گے۔ ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ ان پرانے کپڑوں میں سے ایک کپڑا ایسا ضرور ہو گا جس کو سونگھنے سے یہ سانپ جنگل میں جا کر پٹاری سے باہر نکل آئے گا۔ ایک بار یہ پٹاری سے باہر نکل آیا تو پھر زمین سونگھ کر ہمیں بتا دے گا کہ راجہ کا خزانہ کس جگہ پر زمین میں دبا ہوا ہے۔"

بوڑھا کہنے لگا۔

"ماراج یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اپنے یہاں جتنے مرد ہیں میں ان سب کے میلے کپڑے تمہارے پاس لا کر ڈھیر کر دوں گا۔"

وزیر علی نے کہا۔

"لیکن صرف ان کپڑوں سے بات نہیں بنے گی جو لوگ کیمپ میں رہتے ہیں تمہیں ان کے میلے کپڑے بھی لانے ہوں گے کیونکہ ہو سکتا ہے ان مردوں کے کپڑوں میں سے کسی کی بو ہمارے سانپ کو پسند آ جائے اور وہ جنگل میں جا کر پٹاری سے نکل کر خزانے کا سراغ لگا لے۔"

بوڑھا بولا۔ "یہ بھی کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اپنا کلوا دھوبی کیمپ کے سارے مردوں کے میلے کپڑے گھاٹ پر لے جا کر دھوتا ہے۔ میں اس کے جھونپڑے سے میلے کپڑوں کا گٹھڑا اٹھا کر لے آؤں گا۔"

قادر خان نے کہا۔

"لیکن بابا اس میں ایک بات کی شرط ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ کام بڑے خفیہ طریقے سے ہونا چاہیے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ تم یہ میلے کچیلے کپڑے ہمارے سانپ کو سنگھانے لے جا رہے ہو اگر یہ راز کسی کو

معلوم ہوگیا تو سانپ پٹاری سے باہر نہیں نکلے گا اور تمہیں راجہ کا خزانہ کبھی نہیں مل سکے گا۔"

بوڑھا ہمارے جھونپڑے میں ہمارے سامنے زمین پر بیٹھا ناریل کا حقہ پی رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بابا لوگ کسی کو کاہے کو خبر ہوگی۔ ارے یہ کام میں ایسے کروں گا کہ خود کلوا دھوبی کو پتہ نہیں چلے گا کہ میں اس کا میلے کپڑوں کا گٹھڑا اٹھا کر لے آیا ہوں۔"

وزیر علی نے کہا۔

"بس پھر سمجھو کہ تمہیں راجہ کا خزانہ مل گیا۔ تمہاری باقی زندگی عیش میں گزرے گی۔"

اس بوڑھے کو دھن دولت کا بڑا لالچ تھا۔ اسی لالچ کی وجہ سے وہ یہ سارے کام کرنے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ قادر خان نے پوچھا۔

"کلوا دھوبی کس روز کیمپ کے مردوں کے میلے کپڑے دھونے کے لیے لاتا ہے؟"

بوڑھا کہنے لگا۔

سات دنوں میں ایک بار لاتا ہے۔ ابھی تین چار روز پہلے وہ کپڑے دھو کر استری کر کے کیمپ میں دے کر آیا ہے۔ اب دو دن بعد ہی وہاں سے کپڑے لائے گا۔ اتنی دیر میں میں اپنے گاؤں کے مرد لوگوں کے میلے کپڑے لا کر تمہیں دیتا ہوں۔"

وزیر علی نے کہا۔ "سارے میلے کپڑے ایک دم سے مت لانا۔ اس طرح گاؤں والوں کو شک پڑ سکتا ہے۔ تم ایک ایک دو دو کر کے کپڑے لاؤ۔ ہم اپنے سانپ کو سنگھاتے جائیں گے۔"

"جیسے آپ کہتے ہیں ویسے ہی کروں گا۔"

جب بوڑھا چلا گیا تو قادر خان کہنے لگا۔
"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں کیمپ کے دہشت گردوں اور اسرائیلی اور بنگالی انسٹرکٹروں کے میلے کپڑوں کا تین دن تک انتظار کرنا ہوگا۔"
"مجبوری ہے۔" وزیر علی نے کہا۔ "کوئی بات نہیں ہمیں کون سی جلدی ہے۔ یہاں اطمینان سے بیٹھے ہیں تین دن اور انتظار کر لیں گے۔"
میں نے کہا۔
"کہیں اس دوران کیمپ سے زیر تربیت دہشت گردوں کی پہلی کھیپ بمبئی کی طرف روانہ نہ کر دی جائے۔"
قادر خان بولا۔ "مجھے بھی یہی فکر ہے۔"
اس نے وزیر علی سے کہا۔
"وزیر بھائی! تمہیں دن میں گومل واڑی کیمپ کا ایک چکر ضرور لگانا پڑے گا۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ دہشت گرد ابھی کیمپ میں ہی ہیں اگر وہ نکلنے والے ہوئے تو ہم کسی دوسرے طریقے سے انہیں ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔"
وزیر علی بولا۔ "ٹھیک ہے میں سروے کرتا رہوں گا۔"
شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ کہ لالچی بوڑھا کپڑوں کی ایک گٹھڑی اٹھا کر ہمارے جھونپڑے میں آ گیا کہنے لگا۔
"میں گاؤں کے مردوں کا تو ایک ایک میلا کپڑا باندھ کر لے آیا ہوں۔ انہیں تو اپنے سانپ کو سنگھائیں۔"
ہم نے گٹھڑی کو کھول کر دیکھا۔ اس میں کچھ پرانے میلے کچیلے لنگوٹ تھے۔ ایک دو میلی کچیلی بنیانیں تھیں۔ تین چار گھٹنوں سے اوپر تک باندھی جانے والی میلی دھوتیاں تھیں۔ قادر خان نے ان کپڑوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے بابا! اب تم جاؤ ہم اپنے سانپ کو یہ کپڑے رات کو سنگھائیں

گے۔"

لالچی بوڑھا اپنی آنکھوں کے سامنے یہ کام ہوتا دیکھنا چاہتا تھا۔ کہنے لگا۔
"ماندری جی! اگر تم میرے سامنے اپنے سانپ کو یہ کپڑے سنگھاؤ تو میری بڑی تسلی ہو جائے گی۔"

قادر خان نے وزیر علی کی طرف دیکھا۔ وزیر علی نے کہا۔

"ہاں ہاں کوئی حرج نہیں۔ بابا کے سامنے سانپ کو کپڑے سنگھاؤ۔"

قادر خان کونے میں رکھی ہوئی خطرناک زہریلے سانپوں کی پٹاری اٹھا کر لے آیا۔ پٹاری کے گرد لپٹا ہوا کپڑا ہٹایا کہنے لگا۔

پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاؤ بابا۔ یہ سانپ بڑا زہریلا ہے۔ اگر اس نے تمہیں کاٹ کھایا تو تم زندہ نہیں بچ سکو گے۔"

بوڑھا جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ جھونپڑے میں لالٹین کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اور وزیر علی بھی پرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ قادر خان نے پٹاری کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اندر سے بالشت بھر کے بارہ تیرہ سانپوں کی پھنکاریں سنائی دیں۔ قادر خان جلدی جلدی ایک میلے کپڑے کو پٹارے کے اوپر لے جاتا۔ کپڑے کو دیکھ کر سانپ اور زیادہ پھنکاریں مارتے۔ اسی طرح اس نے سارے کپڑے پٹاری کے اوپر لے جا کر دوسری طرف ڈال دیے اور جلدی سے پٹاری کو بند کر دیا۔ پٹاری بند ہوئی تو ہماری جان میں جان آئی۔

قادر خان نے بوڑھے سے کہا۔

"بابا! ہم نے گاؤں کے سارے مردوں کے کپڑے سانپوں کو سنگھا دیے ہیں۔ تم یہ کپڑے واپس لے جا سکتے ہو۔ اب خیال رکھنا جس روز کلوا دھوبی کیمپ کے مرد لوگوں کے اترے ہوئے کپڑے لائے گا تم اسی روز رات کو وہ سارے کپڑے ہماری جھونپڑی میں لے آنا۔"

بوڑھا خوش ہو کر بولا۔

"فکر نہ کرو ماندری جی! وہ کام بھی ہو جائے گا پر ماندری جی! ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔"

"کون سی بات کی سمجھ نہیں آئی بابا؟" قادر خان نے پوچھا۔

لالچی بوڑھے نے کہا۔

"تم تو کہتے تھے کہ تمہارے پاس ایک ہی سانپ ہے مگر پٹاری میں سے کتنے ہی سانپوں کی پھنکاریں آ رہی تھیں۔"

قادر خان بولا۔ "ہم سپیرے اپنے پاس ہر طرح کے سانپ رکھتے ہیں۔ ان سانپوں میں وہ سانپ تو موجود ہے جس نے ہمیں خزانے کا سراغ لگا کر بتانا ہے۔"

"تب ٹھیک ہے ماراج! بالکل ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔ لکشمی دیوی! ہم پر اپنی دیا کرنا۔"

لالچی بوڑھے کے جانے کے بعد وزیر علی نے سانس بھر کر کہا۔ "اس بوڑھے نے تو ہمیں خطرے میں ڈال دیا تھا۔ خدا نخواستہ اگر سانپ پٹاری میں سے باہر نکل آتے تو ہم سب مارے گئے تھے۔"

قادر خان نے کہا۔

"ایسا ہو سکتا تھا مگر خدا نے ہمیں بچا لیا۔ کیونکہ ایک بار سانپ پٹاری سے نکل آئے تو پھر میں بھی ان کو کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔ چلو بوڑھے کو تسلی تو ہو گئی۔ بابا لوگ اس بوڑھے کی تسلی ضرور ہونی چاہیے تھی۔ اس نے ہمارے مشن کا راستہ صاف کرنا ہے۔"

ہم اس گاؤں میں رہ رہے تھے۔ سپیروں اور سادھوؤں سے ہندو لوگ ڈرتے ہیں اور ڈر کے مارے ان کی خاطر داری کرتے ہیں۔ سادھوؤں سے انہیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں وہ کسی بات سے ناراض ہو کر انہیں شراپ یعنی بد دعا نہ دے دیں اور سپیروں مداریوں سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں کسی بات سے ناراض ہو کر سپیرے اپنا کوئی سانپ ان کے پیچھے نہ لگا دیں۔ اس کے علاوہ ہمیں گاؤں کے ایک بوڑھے کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ہماری خوب ٹہل سیوا ہوتی۔ مزید تین دن گزر گئے تو دوپہر کے وقت بوڑھے نے آکر ہمیں بتایا کہ کلوا کیمپ کے میلے کپڑوں کی گٹھڑی گھر لے آیا ہے۔ قادر خان نے پوچھا۔

"بس تم ایسا کرو کہ آج رات میلے کپڑوں کی وہ گٹھڑی ہماری جھونپڑی میں لے آؤ۔ کیا تم کسی کو خبر ہوئے بغیر ایسا کر سکتے ہو؟"

بوڑھے کو راجہ کے خزانے کا لالچ تھا۔ کہنے لگا۔

"کیوں نہیں مہاراج! میں آدھی رات کو جب گاؤں کے سارے آدمی سو رہے ہوں گے تو کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر یہاں لے آؤں گا۔"

وزیر علی نے پوچھا۔

"کیا اس گٹھڑی میں کیمپ کے سارے آدمیوں کے اترے ہوئے کپڑے ہیں؟"

بوڑھا بولا۔ "مہاراج! وہ سب مردوں کے کپڑے لاتا ہے۔ باقی ایک دو آدمیوں کے رہ گئے ہوں تو میں کہہ نہیں سکتا۔"

قادر خان نے کہا۔ "نہیں بابا۔ یہ بات غلط ہے پہلے تو کلوا دھوبی سے یہ معلوم کرو کہ کیمپ کے سبھی مرد لوگوں کے کپڑے لایا ہے کوئی آدمی رہ تو نہیں گیا۔ کیونکہ اس کے بغیر اپنا کام پورا نہیں ہوگا۔"

بوڑھا کہنے لگا۔ "یہ میں پتہ کر لوں گا مہاراج۔ آپ فکر نہ کریں۔"

وہ چلا گیا۔ شام کے وقت ہمارے لیے کھانا لے کر آیا تو بڑا خوش تھا۔ کہنے لگا۔

"لو مہاراج! یہ کام بھی ہو گیا۔ کلوا سے میں نے پوچھا تو وہ بولا۔ میں تو کیمپ کے سبھی مرد لوگوں کے میلے کپڑے ایک بار ہی لاتا ہوں۔ میں نے پھر پوچھا۔ کلوا کسی مرد لوگ کا پرانا کپڑا وہاں رہ تو نہیں گیا؟" وہ بولا۔

"بھیکو بابا تم اتنا کس لیے پوچھ رہے ہو' کیا بات ہے؟"

اور بوڑھا اپنا بغیر دانتوں والا منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ پھر رازداری سے قادر خان کے قریب ہو کر بولا۔

"فکر نہ کریں مہاراج! اس کو میں نے شک نہیں پڑنے دیا۔ بس آج رات کو کپڑوں کا گٹھڑ اٹھا کر یہاں لے آؤں گا۔ یہ شرط بھی آج رات پوری ہو جائے گی۔"

اور اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ ہم رات کو جاگ رہے تھے۔ ویسے بھی اس جھونپڑے میں حبس اور مچھر ہمیں آدھی رات کے بعد تک جگائے رکھتے تھے۔ ہم جھونپڑی کے کھلے دروازے کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ لالٹین روشن تھی۔ ہم نے گاؤں کے جھونپڑوں کی طرف سے بوڑھے کو آتے دیکھا۔ اس نے ایک گٹھڑ سر پر اٹھا رکھا تھا۔ جھونپڑے کے آگے آ کر اس نے کپڑوں کا گٹھڑا زمین پر ڈال دیا اور صافے سے منہ کا پسینہ صاف کرتے ہوئے وہ بھی بیٹھ گیا اور بولا۔

"مہاراج! گٹھڑا لے آیا ہوں۔ اب جلدی سے سانپ کو یہ کپڑے سنگھا دیں۔ تاکہ میں واپس لے جا کر کلوا کی جھونپڑی میں رکھ دوں۔"

ہم گٹھڑ کو کھینچ کر جھونپڑی کے اندر لے گئے۔ لالٹین کی روشنی میں اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں کھدر کے کرتے اور پاجامے۔ نیکریں، بنیانیں، چار پرانی پتلونیں، ایک فوجی بش شرٹ اور فوجی خاکی رنگ کی پتلون بھی تھی۔ ہم نے سارے کپڑوں کو گنا وہ کل چودہ جوڑے بنتے تھے یعنی چودہ آدمیوں کے کپڑے تھے۔ وزیر علی نے مجھ سے کہا۔

"کیمپ میں میرے سروے کے مطابق دس دہشت گرد ہیں۔ دو انسٹرکٹر ہیں۔ باقی دو آدمی ہو سکتا ہے نوکر اور باورچی ہوں۔"

قادر خان نے کہا۔ "اب جو کچھ بھی ہو ہمیں نہیں سوچنا چاہیے۔ مجھے ایک ایک کر کے کپڑے پکڑاتے جاؤ۔"

بوڑھا جھونپڑی کے باہر ہی بیٹھا سانس درست کر رہا تھا۔ قادر خان کونے سے سانپوں کی پٹاری اٹھا کر لے آیا۔ اس نے پٹاری کا منہ کھول دیا۔ سانپوں کی پھنکاریں گونج اٹھیں۔ وزیر علی قادر خان کو ایک ایک کر کے کپڑے پکڑاتا جاتا تھا اور قادر خان اس کپڑے کو سانپوں کی پٹاری کے اوپر تھوڑی دیر کے لیے رکھتا پھر دوسری طرف رکھ دیتا۔ اسی طرح جب وہ سارے میلے کچیلے کپڑے سانپوں کو اچھی طرح سے سنگھا چکا تو بولا۔

"یہ کام ختم ہو گیا ہے۔ بوڑھے سے کہو کہ یہ کپڑے اٹھا کر لے جائے۔"

وزیر علی نے بوڑھے کو بلا کر کہا۔

"بابا لوگ! سانپ نے سارے کپڑے لتے سونگھ لیے ہیں۔ انہیں واپس لے جا کر جہاں سے اٹھائے ہیں وہاں رکھ آؤ۔"

بوڑھا بے صبری سے کہنے لگا۔

ماراج! اب خزانے کا پتہ لگانے نکل جائیں گے ناں؟"

قادر خان نے کہا۔ "نہیں ہمیں دو دن انتظار کرنا ہو گا۔ کیونکہ خزانے کے جاسوس سانپ کے علاوہ ہم نے یہ کپڑے دوسرے سانپوں کو بھی سنگھا دیے

ہیں۔ اب سارے سانپ آپس میں دو دن مشورہ کریں گے اور جاسوس سانپ کو اپنی طرف سے بھی بتائیں گے کہ خزانہ کہاں زمین میں دبا ہوا ہو سکتا ہے۔"

بوڑھے نے سارے کپڑے اکٹھے کر کے ان کا گٹھڑ بنایا۔ اسے سر پر اٹھایا اور جدھر سے آیا تھا ادھر کو واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے قادر خان سے پوچھا۔

"ہم دو دن کس لیے ضائع کریں گے؟"

قادر خان کہنے لگا۔

"میں نے آپ لوگوں کو پہلے بھی بتایا تھا کہ ان سانپوں میں سے کسی کو جب اپنے دشمن کا کوئی اترا ہوا کپڑا سنگھایا جاتا ہے تو اس کپڑے میں دشمن کے بدن کی بو ہوتی ہے۔ سانپ اس بو کو سونگھ کر اپنے ذہن میں رکھتا ہے مگر وہ ہمارے دشمن کو مارنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتا۔ جب سانپ کو اس کے بعد دو دن تک بھوکا پیاسا رکھا جاتا ہے تو اس کے اندر غصے اور بھوک سے شدید ردعمل پیدا ہوتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کو اسی آدمی نے بھوکا رکھا ہوا ہے جس کی اس نے بو سونگھی تھی۔ چنانچہ وہ اس کا جانی دشمن بن جاتا ہے اور تیسرے دن جب ہم سانپ کو چھوڑتے ہیں تو وہ اپنے دشمن کی بو کے پیچھے غضبناک ہو کر جاتا ہے اور وہ جہاں کہیں ہوتا ہے اسے جا کر ڈس دیتا ہے۔"

مجھے یاد آ گیا قادر خان نے یہ نقطہ ہمیں پہلے بھی بتایا تھا۔ ہمیں دو دن تک انتظار کرنا تھا۔ قادر خان نے پٹاری بند کر کے کونے میں رکھ دی اور دو دن تک سانپوں کو دودھ پانی کا ایک قطرہ بھی پینے کو نہ دیا۔ ورنہ وہ ان سانپوں کو دن میں دو تین بار دودھ ضرور پلاتا تھا۔ تیسرے دن جھونپڑے میں سانپوں کی غضبناک پھنکاروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں سانپوں کی بند پٹاری میں سے آ رہی تھے۔ قادری خان نے کہا۔

"سانپ بھوکے پیاسے غضبناک ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے دشمن کو ڈسنے کے لیے تلملا رہے ہیں؟"

وزیر علی نے فورا" کہا۔

"تو پھر چلو۔ ابھی جنگل میں چل کر انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

قادر خان بولا۔ "تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو نا وزیر بھائی؟ دن کے وقت سانپوں کو چھوڑ دیا تو ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا ایک دو کو کاٹیں گے باقیوں کو کیمپ کے لوگ انہیں مار مار کر کچل دیں گے۔ اس کے لیے ہمیں رات پڑنے کا انتظار کرنا ہو گا۔ ہم آدھی رات کے بعد جائیں گے۔"

وزیر علی نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ارے بھائی! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں پاکستان کے دشمنوں کا فورا" سے پیشتر سر کچل ڈالنا چاہتا ہوں۔"

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بھارت کے مسلمان پاکستان سے اور پاکستان کے مسلمان بھائیوں سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ وہ انہیں طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی طاقت سے انہیں بھی طاقت ملتی ہے۔ جب وہ پاکستان میں دیکھتے ہیں کہ بھائی بھائی سے لڑ رہا ہے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہا ہے تو انہیں دکھ ہوتا ہے۔ کیونکہ آپس کی منافرت اور نا اتفاقی سے پاکستان کمزور ہو جاتا ہے اور بھارت کے مسلمان پاکستان کو کمزور ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ اسے روز بروز طاقتور سے طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ہمیں اب رات پڑنے کا انتظار تھا۔ اس دوران بوڑھا دو تین بار ہمارے پاس آ کر پوچھ گیا کہ ہم سانپ کو خزانے کا سراغ لگانے کے واسطے کب جنگل میں لے جا رہے ہیں۔ قادر بھائی نے اسے کہہ دیا کہ سانپ اب بالکل تیار ہے اور کل صبح ہم اسے جنگل میں لے جا رہے ہیں رات کو تھوڑا بہت کھانا کھا کر ہم نے لالٹین کی بتی دھیمی کر دی اور بیٹھ کر باتیں کرتے اور مچھروں کو مارتے

رہے۔ جب رات کافی گہری ہو گئی تو قادر خان بولا۔

"میرا خیال ہے اس وقت تک کیمپ کے سارے لوگ گہری نیند سو چکے ہوں گے۔ دشمن پر شب خون مارنے کے لیے اس سے اچھا وقت اور کوئی نہیں چلو۔"

قادر خان نے سانپوں کی پٹاری کو کپڑے میں اچھی طرح سے لپیٹ کر جھولے میں ڈال لیا۔ بھوکے سانپ بڑے غصے کے ساتھ پھنکاریں مار رہے تھے۔ وزیر علی بولا۔

"خدا خیر کرے۔ کہیں یہ اس جگہ پٹاری کے باہر نہ نکل آئیں۔"

قادر خان نے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ یہ اسی جگہ پر پٹاری سے نکلیں گے جہاں میں انہیں نکالوں گا۔"

ہم جھونپڑے سے خاموشی کے ساتھ نکلے اور پیچھے کی طرف سے ڈھلان اتر گوہل واڑی کیمپ کی طرف چل پڑے۔ عجیب گیلی گیلی بوجھل بوجھ فضا والی خاموش رات تھی۔ پٹاری میں بند پھنکارتے سانپوں کی آواز ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ہم ایک شارٹ کٹ سے ہو کر اس مقام پر آ گئے جہاں سے ہمیں کچھ فاصلے پر را کے تربیتی کیمپ کی چند اک روشنیاں جھلملاتی صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہم رک کر کیمپ کی طرف دیکھنے لگے میں نے قادر خان سے کہا۔

"ہمیں کم سے کم کتنے فاصلے پر سانپوں کو چھوڑنا چاہیے؟"

وہ بولا۔ "چاہے دس میل کے فاصلے پر چھوڑ دیں۔ سانپ اپنے دشمنوں تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ کیمپ کے زیادہ سے زیادہ قریب جا کر سانپوں کو چھوڑوں۔ اس طرف سے آ جاؤ۔"

ایک چھوٹے سے ٹیلے کو پار کرنے کے بعد ہم کیمپ کے عقب میں آ گئے۔ یہ کیمپ کی بیرکوں کا پچھواڑا تھا۔ بیرکوں کے عقب میں صرف دیوار پر دو تین

بلب روشن تھے۔ کیمپ پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم چلتے چلتے بیرکوں کے اور زیادہ قریب آ گئے۔ اب ہمارے درمیان صرف خاردار دیوار حائل تھی۔ ہم ایک طرف جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو کر اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ وزیر علی بولا۔ "گشتی سنتری نہ آ جائیں۔"

قادر خان نے کہا۔ "تھوڑا ان کا انتظار کر لیتے ہیں۔"

ہم نے چھ سات منٹ تک انتظار کیا میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے رات کو کوئی گشتی پارٹی نہیں نکلتی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" قادر خان نے کہا۔ "ہمیں دشمنوں پر حملہ کر دینا چاہیے۔ تم لوگ مجھ سے کم از کم دس قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔"

ہم دس دس قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اس جگہ ایک بیرک کی دیوار پر جلتے بلب کی روشنی پڑ رہی تھی۔ قادر خان نے جھولے میں سے پٹاری نکالی۔ اس پر لپٹا ہوا کپڑا اتار کر جھولے میں ڈالا اور بند پٹاری کو ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ کانٹے دار تاروں والی دیوار کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ہم اسے بیرک کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ خاردار دیوار کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ وہاں اونچی جگہ تھی۔ اس نے ہمارے دیکھتے دیکھتے پٹاری کا منہ کھولا اور سانپوں سے بھری ہوئی پٹاری کو زور سے کانٹے دار تاروں والی دیوار کے اوپر سے اندر کی طرف اچھا دیا۔ پٹاری دیوار کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف جا گری۔ ہم نے سانپوں کی بڑی تیز پھنکاروں کی آواز سنی۔ پھر یہ آواز غائب ہو گئی۔

قادر خان دوڑ کر ہمارے پاس آ گیا۔ ہم کیمپ کی بارکوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ قادر خان کہنے لگا۔

"دس کے دس دہشت گرد اگر کیمپ سے کہیں باہر نہیں گئے تو وہ ان بیرکوں میں سو رہے ہوں گے۔ وہ تو تھوڑی دیر میں ختم ہو چکے ہوں گے۔ اگر اسرائیلی اور بنگالی انسٹرکٹر کسی دوسری جگہ سو رہے ہیں تو سانپ ان کو بھی

تلاش کر لیں گے اور وہ بھی زندہ نہیں بچیں گے۔"
وزیر علی نے پوچھا۔ "کیا ہمیں یہاں رہ کر ان دشمنوں کی موت کا انتظار کرنا ہو گا۔"

قادر خان اندھیرے میں مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"تمہارا خیال ہے کہ کیمپ میں سے چیخ و پکار کی آوازیں آئیں گی۔ کوئی واویلا مچے گا؟ لوگ ایک دوسرے کو مدد کے لیے پکاریں گلے؟ ہرگز نہیں اگر ان میں سے کوئی جاگ نہیں رہا اور اس نے سانپ کو نہیں دیکھ لیا تو پھر یہ کیمپ ایک منٹ بعد قبرستان بن چکا ہو گا اور قبرستان میں کوئی واویلا نہیں مچاتا۔ کوئی ایک دوسرے کو مدد کے لیے نہیں پکارتا۔ سانپوں نے اس کیمپ کے سارے آدمیوں کو موت کی نیند سلا دیا ہو گا۔ اگر اتفاق سے کوئی آدمی کیمپ میں موجود نہیں ہو گا اور کسی دوسرے شہر گیا ہوا ہو گا تو یہ سانپ اس کی بو پر اس شہر کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ اگر راستے میں کسی نے اسے مار نہ دیا یا وہ کسی گاڑی وغیرہ کے نیچے نہ آ گیا تو یقین کرو چاہے سانپ دس دن بعد اس شہر میں پہنچے وہ اس شہر میں پہنچ کر اپنے دشمن کو ضرور ہلاک کر دے گا۔"

گومل واڑی کے اس را کیمپ پر اس طرح خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پہلے بھی ایسی ہی خاموشی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ موت کی خاموشی ہے یا نہیں۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"پھر تو یہاں ٹھہرے رہنا بے کار ہے۔ ہمیں واپس گاؤں میں جا کر سو جانا چاہیے۔ اب تو صبح ہی پتہ چلے گا کہ ہمارا مشن کامیاب رہا یا نہیں۔"

وہ بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ چلو واپس چلتے ہیں۔" ہم نے خاموشی سے واپسی کی راہ پکڑ لی۔

اپنی جھونپڑی میں واپس آ گئے تو وزیر علی نے قادر خان سے پوچھا۔
"تم نے تو کہا تھا کہ یہ گیارہ سانپ مجھے اپنے دوست سپیرے کو واپس کرنے ہوں گے مگر وہ تو سارے کے سارے تم نے کیمپ میں ہی چھوڑ دیے۔"
وہ کہنے لگا۔
"بھائی! یہ سارے سانپ اگر میرے پاس نہیں آئے تو یقین کرو میرے دوست سپیرے کی جھگی میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جائیں گے جب ہم واپس جائیں گے تو سانپ وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔"
میں نے کہا۔ "اب تو صبح ہی پتہ چلے گا کہ کیمپ میں کون زندہ بچا' کون مر گیا۔"
قادر خان نے کہا۔
"بچا وہی ہوگا جو کیمپ میں موجود نہیں ہوگا جو کیمپ میں موجود تھا اور اس کے اترے ہوئے کپڑے سانپوں نے سونگھ لیے تھے تو وہ زندہ نہیں ہوگا۔"
ہم سو گئے صبح لالچی بوڑھے نے ہمیں آ کر جگایا وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔
"ماراج بڑا غضب ہو گیا۔"
"کیا ہوا؟" وزیر علی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔
بوڑھے کے اس جملے سے میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جو میں چاہتا تھا وہ ہو گیا تھا۔ بوڑھا بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ کہنے

لگا۔

"ماندری ماراج! ادھر کیمپ میں سارے کے سارے لوگ مرگئے ہیں۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" قادر نے حیرانی سے پوچھا۔

بوڑھا بولا۔ "ماراج کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سارا گاؤں وہاں گیا ہوا ہے۔ صبح گوالا دودھ لے کر گیا تو کیمپ میں کوئی بھی زندہ نہیں تھا۔ ماراج اس نے بتایا کہ سب کے جسم پتھر ہوگئے ہیں۔"

"یہ تو برا ہوا۔" میں نے کہا۔ "آخر ہوا کیا؟ کچھ پتہ نہیں چلا۔"

بوڑھا بولا۔ "ماراج! کہتے ہیں کسی نے کھانے میں زہر ملا دیا ہوگا۔ سارے مرگئے ماراج ایک بھی نہیں بچا۔"

"چلو چل کر دیکھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر قادر خان جھونپڑی سے نکل گیا۔ ہم بھی اس کے ساتھ چل پڑے کیمپ میں پہلے سے گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ یہ سب سہمے ہوئے تھے اور کیمپ کے اندر ایک طرف دبک کر کھڑے تھے۔ وہاں نہ کوئی سنتری تھا نہ دہشت گرد تھا نہ نوکر چاکر تھا اور نہ انسٹرکٹر ہی تھا۔ گاؤں کا لالچی بوڑھا اور ایک گوالا اور دھوبی ہمارے ساتھ کیمپ کی بارکوں کی طرف آگئے۔ ہم ایک بیرک میں داخل ہوئے۔ وہاں چارپائی پر تین اور لاشیں پڑی تھیں۔ یہ تین دہشت گرد تھے۔ دوسری بارک میں گئے وہاں چار لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے جسم ہم نے چھو کر دیکھے پتھر کی طرح سخت ہوگئے تھے۔ قادر خان نے ہمیں رازداری سے لاشوں کے جسم پر وہ چھوٹے چھوٹے نشان دکھائے جہاں سانپوں نے انہیں کاٹا تھا۔ یہ نشان لاش کی گردن پر تھا۔ کسی کے ٹخنوں پر اور کسی کے بازو پر تھا یہ لوگ بنیانیں اور نیکریں پہن کر سوئے تھے۔ تیسری بیرک میں بھی تین لاشیں پتھر بنی پڑی تھیں۔ میں نے وزیر علی کے کان میں کہا۔

"دہشت گرد تو دس کے دس مارے گئے ہیں باقی اسرائیلی اور ہندو

انسٹرکٹر کی لاشیں نظر نہیں آ رہیں۔"
گوالے نے کہا۔

"ماراج ایک لاش مچان کے اوپر سنتری کی ہے جو رات کو پہرہ دے رہا تھا۔ رسوئی میں بھی دو لاشیں پڑی ہیں۔ ایک رسویا کی لاش ہے دوسری لاش جمعدار کی ہے جو رات کو رسوئی میں ہی سوتا تھا۔"

کلوا دھوبی بولا۔ "وہ سامنے والی چھوٹی بیرک میں بھی ایک لاش پڑی ہے۔"

ہم چھوٹی بیرک میں آ گئے۔ یہاں پلنگ پر مچھر دانی لگی ہوئی تھی۔ پنکھا چل رہا تھا۔ مسہری کے اندر ایک لاش پڑی تھی۔ یہ ہندو انسٹرکٹر کی لاش ہی ہو سکتی تھی۔ اس کی تصدیق گوالے نے کر دی۔ کہنے لگا۔

"ماراج! یہ فوجی یہاں دوسرے جوانوں کو قواعد اور چین ماری سکھاتا تھا۔"

میں نے قادر خان کے کان میں سرگوشی کی۔
"اسرائیلی انسٹرکٹر کی لاش کہیں دکھائی نہیں دیتی۔"
قادر خان نے گاؤں کے لوگوں سے باہر آ کر پوچھا۔
"بابا لوگو! کیا اس کیمپ میں اتنے ہی لوگ تھے۔"
ایک نوجوان نے کہا۔

"ماراج اتنے ہی لوگ تھے۔ ہاں ایک گورا فوجی بھی قواعد سکھاتا تھا۔ وہ پتہ نہیں کہیں چلا گیا ہو گا۔ اس کی لاش ہم نے بھی یہاں کہیں نہیں دیکھی۔"

ہم نے فکرمند نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسرائیلی انسٹرکٹر کیمپ میں موجود نہیں تھا۔ وہ بچ کر نکل گیا تھا۔ میں نے گوالے سے پوچھا۔

"کیا تم نے کل گورے فوجی کو کیمپ میں دیکھا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔

"ماراج! کل مجھے وہ کیمپ میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دن نکلے کیمپ
ں دودھ لے کر آتا ہوں۔ اس وقت فوجی پریڈ کر رہے ہوتے ہیں۔ ان میں
ورا فوجی نہیں تھا۔"

میں نے قادر خان سے کہا۔

"واپس چلتے ہیں۔"

قادر خان نے گاؤں کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"بھائیو! اس کیمپ میں یا تو کوئی وبا پھوٹ پڑی ہے یا پھر ان لوگوں کے
کھانے میں کوئی زہریلا سانپ بھی پکھل گیا ہوگا۔ جس کے زہر سے یہ سارے کے
سارے مارے گئے۔ اب آپ لوگ گاؤں چلے جاؤ۔ ہم لوگ شہر جاتے ہیں وہاں
پولیس کو خبر کر دیں گے۔ پولیس آ کر خود ہی پتہ چلا لے گی کہ یہ لوگ کیسے مر
گئے۔"

گاؤں کے لوگ وبا کا سن کر پریشان ہو گئے۔ ایک بوڑھے نے پوچھا۔

"ماراج! یہ وبا ہمارے گاؤں میں تو نہیں آئے گی۔"

قادر خان بولا۔

"اگر اس وبا نے گاؤں میں آنا ہوتا تو اب تک آ گئی ہوتی۔ تم اطمینان
سے رہو اور پھر یہ وبا کا اثر نہیں ہے۔ مجھے وشواش ہے کہ ان لوگوں کے کھانے
میں کوئی زہریلا سانپ پک گیا ہوگا۔ یہ سانپ کے زہر سے مرے ہیں۔"

ہم واپس گاؤں کی طرف چلے تو لالچی بوڑھا ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے
قادر خان کے قریب ہو کر کہا۔

"ماراج! خزانے کا پتہ چلانے کب جائیں گے؟ آپ کہیں شہر تو نہیں جا
رہے؟"

قادر خان نے مسکرا کر کہا۔

"بابا لوگ! تم خوامخواہ کیوں پریشان ہوتا ہے ابھی ہم شہر نہیں جائیں گے۔ ہم راجہ کے خزانے کا پتہ چلا کر ہی شہر جائیں گے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ہم اپنے جاسوس سانپ کو لے کر جنگل میں جائیں گے۔ ہاں۔"

جھونپڑی میں آتے ہی وزیر علی کہنے لگا۔

"وہ اسرائیلی انسٹرکٹر بچ کر نکل گیا۔ یہ بہت برا ہوا۔ اصلی آدمی تو وہی ہے جو دہشت گردوں کو تخریب کاری کی ٹریننگ دیتا ہے۔"

قادر خان نے کہا۔

"مجھے یقین ہے ایک سانپ اس کی بو پر اس کی تلاش میں نکل چکا ہوگا۔ اسرائیلی انسٹرکٹر جہاں کہیں بھی ہوگا سانپ اس کا کام تمام کر کے ہی واپس آئے گا۔"

میں نے کہا۔ "اگر اسرائیلی انسٹرکٹر دلی گیا ہوا ہے یا بمبئی گیا ہوا ہوگا تو بالشت بھر کا سانپ اتنا فاصلہ کیسے طے کرے گا؟ وہ تو بمبئی اور دلی پہنچنے سے پہلے ہی کہیں نہ کہیں لوگوں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔"

قادر خان بولا۔

"تم ان خاص سانپوں کی ذہنیت سے واقف نہیں ہو۔ یہ بالکل انسانوں کی طرح جاسوسی کرتے ہیں۔ یہ جب اپنے دشمن کی کھوج میں نکلتے ہیں تو اکثر راتوں کو سفر کرتے ہیں کیونکہ ایک تو سانپ رات کے اندھیرے میں ہی راستہ دیکھ لیتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان سانپوں نے دشمن کا کوئی کھرا یعنی اس کے پاؤں کا نشان تو دیکھنا نہیں ہوتا کہ وہ اس طرف گیا ہے۔ کسی سے دشمن کے بارے میں پوچھنا بھی نہیں ہوتا یہ سانپ کو دشمن کی بو پر جا رہے ہوتے ہیں جو انہیں سینکڑوں میل سے بھی آجاتی ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ اسرائیلی انسٹرکٹر اس سانپ سے بچ نہیں سکے گا جو اس کے پیچھے لگ چکا ہے۔"

وزیر علی نے کہا۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارا یہ سانپ اسرائیلی انسٹرکٹر کی بو لیتا دلی پہنچ جائے تو اسرائیلی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کسی دوسرے شہر چلا جائے یا واپس بھوپال آ جائے اور وہاں سے گومل واڑی تحقیقات کرنے آ جائے پھر یہ سانپ کیا کرے گا؟"

قادر خان کہنے لگا۔

"بھائی! یہ سانپ ہوائی جہاز کی بلندی سے بھی دشمن کی بو پا لیتے ہیں۔ اگرچہ اسرائیلی دلی سے بھوپال یا بمبئی جائے گا تو سانپ بھی اسی طرف روانہ ہو جائے گا۔ یوں سمجھ لو کہ اس سانپ نے بھی اب اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے کہ اپنے اس دشمن کو ہر حالت میں ڈسنا ہے جس نے اسے دو دن بھوکا رکھا تھا اور جس کے کپڑوں سے اس نے اس کے جسم کی بو سونگھ لی تھی۔ ہاں اگر اس آنے جانے میں اگر سانپ کہیں مارا جاتا ہے تو الگ بات ہے۔ لیکن اگر وہ زندہ رہا تو سال گزر جائے چاہے دو سال گزر جائیں یہ اپنے دشمن اسرائیلی انسٹرکٹر کو ہلاک ضرور کرے گا۔"

وزیر علی بچ کر نکل جانے والے اسرائیلی انسٹرکٹر کے بارے میں زیادہ فکر مند تھا۔ وہ بار بار ہاتھوں کو مسلتے ہوئے کہتا۔

"اس کافر اور مسلمانوں کے ازلی دشمن کا بچ کر نکل جانا ہماری بہت بڑی ناکامی ہے۔ یہودی تو شروع ہی سے مسلمانوں کے دشمن رہے ہیں یہ یہودی تو خاص طور پر پاکستان کے خلاف بھارتی دہشت گردوں کو ٹریننگ دینے کے لیے اسرائیل سے منگوایا گیا تھا۔ یہ دہشت گرد مر گئے ہیں تو وہ کسی دوسرے ٹریننگ کیمپ میں ٹریننگ دینی شروع کر دے گا۔ اصل میں تو اس زہریلے درخت کی جڑ کاٹنا ضروری ہے۔"

قادر خان نے کہا۔

"وزیر بھائی! اس یہودی کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں بھی سوچ لیں

گے۔ ایک سانپ تو اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ پہلے ہمیں یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ اگر پولیس وغیرہ آ گئی تو ہم سے بھی ضرور پوچھ گچھ کرے گی اور ہمارے پاس پستول بھی ہیں اور کمانڈو چاقو بھی ہیں۔"

وزیر علی نے بے دلی سے کہا۔

"بھائی نکل چلو۔ میں کب کہتا ہوں کہ یہاں ڈیرا جما کر بیٹھے رہو۔"

لالچی بوڑھا اپنے مکان پر گیا ہوا تھا۔ ہم نے موقع غنیمت جانا اور بڑے اطمینان سے جھونپڑے سے نکل کر جنگل میں ایک طرف چل پڑے۔ اس یہودی انسٹرکٹر کا نام ہم نے گوالے سے معلوم کر لیا تھا۔ وہاں اسے جوزف صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

ہمارا گومل واڑی والے را کے پاکستان دشمن تربیتی کیمپ کا مشن ختم ہوگیا۔ صرف اس کے اسرائیلی ایجنٹ جوزف کو ختم کرنا باقی تھا۔ وہ ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا۔ قادر خان کا خیال تھا کہ اس کا سانپ اسے ایک نہ ایک دن ضرور ہلاک کر دے گا مگر میرا اور وزیر علی کا خیال تھا کہ بالشت بھر کا سانپ گومل واڑی سے دلی تک سینکڑوں میل کے جنگل میدان دلدلیں' دریا' ندی نالے اور شہر پار نہ کر سکے گا اور راستے میں ہی مارا جائے گا۔

ہم جنگل میں چلے جا رہے تھے۔ قادر خان ہمیں جنگل کے مختصر ترین راستوں پر لیے جا رہا تھا۔ جنگل کے یہ راستے اس کے خیال میں خطرناک نہیں تھے۔ اس کے باوجود ہم چوکنے ہو کر چل رہے تھے۔ کیونکہ اس جنگل میں خونخوار درندے اور زہریلے حشرات الارض کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ہم گومل واڑی کے ریلوے سٹیشن کو اپنی دائیں جانب چھوڑتے ہوئے آگے.نکل گئے اور وہاں سے دور پیچھے اسی ریلوے سٹیشن پر آ گئے جہاں سے ہم اتر کر گومل واڑی کے گاؤں میں آئے تھے۔ وہاں پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ یہاں سے ہمیں شام کے وقت بھوپال جانے والی گاڑی ملی جس نے ہمیں رات کے وقت بھوپال پہنچایا۔ بھوپال سے ہم دوسری گاڑی میں سوار ہو گئے اور دوسرے دن آدھی رات کو اس سٹیشن پر اتر پڑے جہاں سے ہماری حویلی والی پناہ گاہ کو جنگل اور پہاڑیوں میں سے راستہ جاتا تھا۔ یہاں ہماری گاڑی اسی جگہ پر موجود تھی جہاں ہم اسے چھپا کر گئے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور حویلی والی پناہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ باقی کی رات ہم صبح تک گہری نیند سوئے۔

اٹھے تو کافی دن نکل آیا تھا۔ اپنے سپیروں والے کپڑے ہم نے رات کو ہی بدل ڈالے تھے۔ چاند بائی ہمارے لیے چائے وغیرہ تیار کر کے لے آئی۔ وزیر علی کہنے لگا۔

"اس یہودی انسٹرکٹر کو ٹھکانے لگانا ہمارا فرض ہے جو بھارتی دہشت گردوں کو پاکستان میں جا کر تخریب کاری کی تربیت دیتا ہے۔ وہ ہمارے اور

پاکستان کے لیے دہشت گردوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس کو ٹھکانے لگانا بہت ضروری ہے۔"

جب قادر خان نے کہا کہ سانپ اسے اپنے آپ ہلاک کر دے گا تو وزیر علی نے جھنجلا کر کہا۔

"میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ خارج از امکان بات ہے۔ اگر وہ گومل واڑی کیمپ میں ہوتا تو سانپ اسے ضرور ہلاک کر دیتا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ دلی بیٹھا ہوا ہے بہت ممکن ہے سانپ ابھی مدھیہ پردیش کے جنگلوں میں ہی ہو اور یہودی انسٹرکٹر دلی سے بمبئی پہنچ جائے۔"

میں نے ان دونوں کی توجہ اس سے بھی اہم مسئلے کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہودی انسٹرکٹر کے مشن کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر کے مراد آباد کے جنوب میں سمبل کے فریسٹ ریسٹ ہاؤس میں جو را کا دوسرا تربیتی کیمپ ہے اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ کیونکہ اس تربیتی کیمپ میں بھارتی پنجاب اور اتر پردیش کی پیشہ ور لڑکیوں کو دہشت گردی کی تربیت دے کر پاکستان بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے اور یہ پیشہ ور لڑکیاں مسلمان بن کر پاکستان کی اونچی سوسائٹی میں گھس کر بہت زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔"

وزیر علی نے قادر خان سے کہا۔

"مراد آباد میں اپنا ایک آدمی تو موجود ہے۔ وہ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتا ہے اور ہمیں اس کیمپ کے بارے میں مکمل تفصیلات مہیا کر سکتا ہے۔"

قادر خان کہنے لگا۔

میرا خیال ہے ہمیں اب را کے اس دوسرے ٹریننگ سنٹر کی طرف توجہ دینی چاہیے۔"

وزیر علی بولا۔ "میری تجویز یہ ہے کہ تم اور حیدر علی یہاں سے مراد آباد

کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میں یہاں رہ کر یہودی انسٹرکٹر کے بارے میں سراغ لگانے کی کوشش کروں گا کہ وہ مرگیاہے کہ زندہ ہے۔ اگر زندہ ہے تو اس کی تازہ سرگرمیاں کیا ہیں۔"

میں نے اور قادر خان نے اس پر اتفاق کیا۔ طے یہ پایا کہ وزیر علی اسی جگہ رہ کر گومل واڑی اور بمبئی کا چکر لگاتا رہے گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ یہودی انسٹرکٹر جوزف کس حال میں ہے۔ اگر سانپ نے اسے ہلاک نہیں کیا تو کیا گومل واڑی کیمپ میں اس نے را کی مدد سے دہشت گردوں کو دوبارہ ٹریننگ دینی شروع تو نہیں کر دی۔ جبکہ میں اور قادر خان وہاں سے اپنے نئے مشن پر مراد آباد کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

میں نے قادر خان سے دریافت کیا کہ مراد آباد میں جو اپنا آدمی ہے وہ اس کیمپ کے سلسلے میں ہماری کہاں تک راہ نمائی کر سکے گا۔ قادر خان نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو وہاں پہنچ کر ہی معلوم ہو سکے گا پہلے تو یہ معلوم کرنا ہو گا کہ ان پیشہ ور عورتوں کو کس قسم کی دہشت گردی کی ٹریننگ دی جانے والی ہے۔"

میں نے کہا۔

"انہیں بم لگانے یا بازاروں اور چوراہوں میں سر عام فائرنگ کرنے کی ٹریننگ نہیں دی جائے گی۔ انہیں ایک تو پاکستانی جاسوسی کی تربیت دی جائے گی اور دوسرے پاکستان کے نو دولتیے طبقے میں گھل مل کر پاکستان منافرت اور بد امنی کی فضا پیدا کرنے اور پاکستان کے دفاعی راز معلوم کرنے کے سلسلے میں تیار کیا جائے گا۔"

وزیر علی بولا۔

"ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ان عورتوں کو اسی کیمپ میں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان تمام پیشہ ور عورتوں یا

لڑکیوں کی تصویریں اور مکمل تفصیلات پاکستان کی انٹیلی جینس کو پہنچا دی جائیں تاکہ جب یہ عورتیں ٹریننگ کے بعد پاکستان سمگل کی جائیں تو پاکستان انٹیلی جینس انہیں بارڈر کراس کرتے ہی گرفتار کر لے۔"

قادر خان نے اس کے جواب میں کہا۔

"اس میں اس بات کا امکان ہے کہ ساری کی ساری عورتیں ایک دم نہ پکڑی جا سکیں۔ کیونکہ ظاہر ہے انہیں ہجوم کی شکل میں کسی ایک جگہ سے بارڈر کراس نہیں کرایا جائے گا۔ اس میں خطرہ ہے کہ دو ایک تو گرفتار کر لی جائیں مگر باقی روپوش ہونے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ اس کے بعد انہیں تلاش کرنا مشکل ہوگا۔ اس کے علاوہ اپنی ایک دو ساتھیوں کی گرفتار کے بعد یہ لڑکیاں محتاط ہو جائیں گی اور ان کے ماسٹر سپاہی بھی انہیں کچھ دیر کے لیے انڈر گراؤنڈ کر دیں گے۔"

بات بڑی معقول تھی۔ میں نے کہا۔

"تو پھر کیا طریق کار اختیار ہمارے لیے بہتر ہوگا؟"

قادر خان نے کہا۔ "اس کا فیصلہ تو مراد آباد میں اپنے آدمی سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کیا جا سکے گا۔"

مراد آباد کے اس آدمی کے بارے میں میں تفصیل سے کچھ بیان نہیں کروں گا۔ اس کا حلیہ نہیں بتاؤں گا۔ یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ وہ کاروبار کیا کرتا تھا اور جہاں وہ رہتا تھا اس کا محل وقوع بھی بیان نہیں کروں گا۔ آپ اس کا کوئی فرضی نام رکھ لیں۔ چلیں اس کو نواب صاحب کہیں گے۔ یہ آدمی بہت امیر کبیر شخص تھا۔ مراد آباد خاص کا رہنے والا نہیں تھا۔ مگر میں نے اس لیے اس کی اصلی جائے رہائش کا نام نہیں لکھا کہ انڈین انٹیلی جینس کو معلوم نہ ہو جائے۔ یہ شخص پاکستان کا عاشق اور بھارت کے مسلمانوں کا سچا غم خوار اور ان کی ترقی اور فلاح کے لیے ہر لمحے ظاہری طور پر اور خفیہ طور پر کام کرنے والا

آدمی تھا۔ اب میں اسے نواب صاحب کے نام سے ہی یاد کروں گا۔ نواب صاحب کے ہاں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ کوٹھی کیا تھی' چھوٹا سا محل تھا۔ بھارت کے کونے کونے میں جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی فلاحی انجمن بھی تھی تو نواب صاحب کی طرف سے انہیں ہر ماہ ایک کثیر رقم باقاعدہ ملتی تھی۔

وزیر علی قادر خان اور رمضان بھائی کی خفیہ تنظیم کا بھی نواب صاحب سے رابطہ تھا اور نواب صاحب بھارت میں مسلمانوں کی تعمیر و ترقی کے لیے ان کی تنظیم کی بھرپور مدد کرتے تھے۔ قادر خان نے مجھے بتایا کہ نواب صاحب پاکستان کو اسلام کا حقیقی معنوں میں قلعہ کہتے ہیں۔ صرف پاکستان کے مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی وہ پاکستان کا قلعہ کہتے ہیں اور پاکستان کا نام آتے ہی ان کا چہرہ روشن ہو جاتا ہے اور کہا کرتے ہیں کہ پاکستان بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ ہے جو اسلام کی سربلندی کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے رونما ہوا ہے۔ یہ باتیں سن کر مجھے نواب صاحب سے ملنے کا بے حد شوق پیدا ہوگیا۔ میں انہیں پہلی فرصت میں ملنا چاہتا تھا۔

چنانچہ پروگرام کے مطابق وزیر علی تو وہیں جنگل والی پرانی حویلی میں اور قادر خان ایک روز مراد آباد کی طرف روانہ ہوگئے۔ مراد آباد کا شہر بھارت کے صوبہ اترپردیش یعنی پرانے یوپی میں واقع ہے۔ یہاں مسلمانوں کی بھی کافی آبادی ہے اور ہندو بھی بھاری تعداد میں رہتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی کئی تاریخی اور عالی شان مسجدیں بھی ہیں اور ہندوؤں کے مندروں کی تعداد تو بے شمار ہے۔ آزادی ملنے کے بعد سے یہاں بھی ہندوؤں نے اپنی مسلم دشمن دل آزار سرگرمیوں سے مسلمانوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کیا ہوا ہے۔ اگرچہ مراد آباد کے بہادر مسلمان متعصب ہندوؤں کا ہر موقع پر ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں لیکن چونکہ حکومت ہندوؤں کی ہے اس لیے وہ بے بس ہیں۔ یہاں بھی اعلیٰ سرکاری

ملازمتوں میں مسلمانوں کو کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ ہر کلیدی آسامی پر ہندو یا سکھ تعینات ہیں۔ مراد آباد کے برتن مشہور ہیں۔ ان تانبے کے برتنوں پر مسلمان کاریگر حیرت انگیز نقاشی کا کام کرتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان بھی ہندوؤں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میں اور قادر خان مراد آباد کے سٹیشن سے اتر کر سیدھے نواب صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے میں آپ کو یہ بالکل نہیں بتاؤں گا کہ نواب صاحب کی کوٹھی یا حویلی یا مکان مراد آباد میں کس مقام پر واقع تھا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ ہم مراد آباد شہر کے آس پاس کے علاقے میں تھے۔ نواب صاحب گھر پر ہی تھے۔ ہمیں بڑے تپاک سے ملے۔ جب قادر خان نے میرا ان سے تعارف کرایا اور بتایا کہ میں بھارت اور پاکستان کے مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے لیے کام کر رہا ہوں اور محب وطن پاکستانی ہوں اور اپنے طور پر پاکستان کی سلامتی کے مشن پر بھارت آیا ہوں تو وہ مجھ سے گلے لگ کر ملے۔

"جزاک اللہ! جزاک اللہ! بھائی تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ خدا پاکستان کو تاقیامت آباد رکھے اور دشمن اس سے منہ کی کھائیں۔ ایک بار پھر مجھ سے لگ لگے کر ملو۔"

انہوں نے دوبارہ مجھے گلے لگا لیا۔ حویلی کے ساتھ ہی نواب صاحب کا ایک چھوٹا سا مہمان خانہ تھا۔ ہمیں وہاں ٹھہرایا گیا۔ ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ اس کے بعد نواب صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ میں کس مشن پر آیا ہوں تو وہ ہماری باتیں بڑے غور سے سنتے رہے۔ پھر کہا۔

"میاں قادر خان اور حیدر علی! یہ ساری کارستانیاں اس ناپاک تنظیم را کی ہیں جس کی مدد سے بھارت کی سرکار پاکستان کے لوگوں اور حکومت کو سکھ کا سانس نہیں لینے دے رہی۔ پاکستان میں ساری دہشت گردی را کے آدمی ہی

بھارت کی شہ پا کر کر رہے ہیں۔ اب جو پاکستان میں تخریب کاری اور پاکستان کی فوجی دفاعی تنصیبات کی جاسوسی اور وہاں انتشار پھیلانے کے لیے اترپردیش اور پنجاب سے پیشہ ور عورتیں ٹرینڈ کر کے بھیجی جا رہی ہیں تو یہ را کے اس ناپاک منصوبے کا ایک شاخسانہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہم بھارت کے اس ناپاک منصوبے کو ہر حالت میں ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں خبر ملی ہے کہ یہ منصوبہ انتہائی خفیہ طور پر بنایا جا رہا ہے اور اس کے ذریعے پاکستان سمگل کی جانے والی پیشہ ور ہندو اور سکھ لڑکیوں کو پاکستان کی اونچی سوسائیٹی میں گھومنے پھرنے کی تربیت دی جائے گی۔ ابھی یہ منصوبہ ہماری اطلاع کے مطابق ابتدائی مرحلے میں ہے۔"

نواب صاحب بڑے غور سے میری گفتگو سن رہے تھے۔ جب میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکا تو انہوں نے کہا۔

"بھائی حیدر علی! آپ لوگ اطمینان رکھیں میں اس سلسلے میں ساری معلومات حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ احتیاط کے طور پر آپ کو اپنی حویلی کی بجائے اپنے جنگل والے مکان میں منتقل کر دوں۔"

قادر خان بولا۔ "آپ کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں ہر ممکن احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔"

نواب صاحب کہنے لگے۔

"اگرچہ میں ہندوؤں کی فلاحی تنظیموں کو بھی ہر سال چندہ دیتا ہوں لیکن چونکہ میں مسلمانوں کی فلاحی انجمنوں کی بھی سرپرستی کرتا ہوں اس لیے بھارت سرکار کی اور یہاں کی پولیس انٹیلی جنس کی نظروں میں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میری نگرانی ضروری ہوتی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری حویلی میں رہنے کی بجائے میرے جنگل والے کاٹج میں کچھ دن قیام کریں۔ قادر خان تم تو میرے جنگل والے کاٹج سے واقف ہی ہو۔"

قادر خان نے کہا۔

"کیوں نہیں نواب صاحب! میں وہاں کئی دفعہ جا چکا ہوں۔"

"بس آپ لوگ آج ہی وہاں چلے جائیں۔ وہاں میرا ملازم موجود ہے۔ کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ اتنی دیر میں میں را کے اس ناپاک منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیسے ہی مجھے کار آمد معلومات حاصل ہوئیں میں خود تمہارے پاس آ جاؤں گا۔"

ہم تیسرے پہر مراد آباد شہر سے نواب صاحب کے جنگل والے کاٹج کی طرف روانہ ہوگئے۔ مراد آباد شہر سے ایک مین لائن رام پور، بریلی، لکھنؤ سے ہوتی ہوئی بنارس اور کلکتے کو جاتی ہے۔ یہاں سے ایک برانچ لائن سمبل اور بدایوں کی طرف نکل جاتی ہے ہم نے مراد آباد پہنچ کر اسی برانچ لائن کی ایک گاڑی پکڑی اور سمبل کے سٹیشن پر اتر گئے۔ یہ چھوٹا سا برانچ لائن کا سٹیشن جنگل میں واقع تھا۔ قادر خان کو نواب صاحب کے کاٹج کا راستہ معلوم تھا۔ ہم ایک بیل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بیل گاڑی جنگل میں چل پڑی۔ چھ سات میل کے سفر کے بعد ایک نہر آ گئی۔ نہر کے کنارے کنارے آموں کے باغ تھے۔ آموں کا موسم نہیں تھا۔ اس لیے باغ ویران پڑے تھے۔ رکھوالے اور ٹھیکیداروں کے آدمیوں کی جھونپڑیاں خالی پڑی تھیں۔

ان باغوں کی دوسری طرف نہر کے کنارے ایک چھوٹے سے ٹیبے پر جنگل کے ریسٹ ہاؤس کی طرز کی ایک بوسیدہ سی کوارٹر نما عمارت کھڑی تھی جس کی کھپریل کی ڈھلواں چھت ایک طرف سے جنگل بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہمارے مخبر نے ہمیں پہلے جو معلومات فراہم کی تھیں ان کے مطابق را کے پیشہ ور لڑکیوں والا ٹریننگ سنٹر سمبل ہی کے جنگل میں کسی جگہ پر تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ٹریننگ کیمپ اسی جنگل کے شمال مشرق میں ہاپڑ برانچ کی بڑی نہر کے پاس کسی خفیہ مقام پر واقع ہے۔ یہ اطلاع ہمیں مراد آباد میں ہی مل گئی تھی۔ ہم

نے اس کا ذکر نواب صاحب سے نہیں کیا تھا۔ یہ نواب صاحب کا کاٹج تھا۔ جب کبھی وہ جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے آتے تو اسی کاٹج میں قیام کرتے تھے۔ یہاں ایک ملازم مستقل طور پر رہتا تھا جو نواب صاحب کا پرانا ملازم تھا۔ وہ ہمیں کاٹج میں مل گیا۔ بوڑھا آدمی تھا اس نے ہمارے لیے کمرہ کھول دیا۔ ہمیں چائے بنا کر دی اردگرد گھنا جنگل تھا۔ شمال کی طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو اوپر پیلی بھیت کے جنگلوں سے جا ملتا تھا۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

ہمیں یہاں رہتے ہوئے دو دن گزرے تھے کہ تیسرے دن دوپہر کے بعد نواب صاحب آ گئے۔ کہنے لگے۔

"را کا ٹریننگ کیمپ یہاں سے شمال کی طرف بدایوں ہاڑ برانچ نہر کے پاس جنگل میں کسی جگہ پر ہے۔ جالندھر امرتسر سے چار اور دو لڑکیاں انبالے سے کیمپ میں پہنچ گئی ہیں۔ ایک اسرائیلی انسٹرکٹر جس کا نام جوزف ہے ان لڑکیوں کو چھوٹے بڑے ہتھیار چلانے' بم بنانے' بم بلاسٹ کرنے کی ٹریننگ دیتا ہے۔ بمبئی کی ایک تجربہ کار' فیشن ایبل عورت ان لڑکیوں کو اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے اور مردوں کو اپنی اداؤں اور عشوہ طرازیوں سے رام کرنے کے گر سکھاتی ہے۔"

اسرائیلی انسٹرکٹر جوزف کا نام سن کر میں اور قادر خان چونک پڑے تھے۔ گویا یہ یہودی ابھی تک زندہ تھا اور قادر خان کے سانپ نے اسے کاٹا نہیں تھا۔ ہم نے اس بارے میں نواب صاحب سے نہ پہلے کوئی بات کی تھی نہ اس وقت ان پر کچھ ظاہر کیا تھا۔ خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ میں نے نواب صاحب سے پوچھا۔

"یہاں اسلحہ وغیرہ کی کیا پوزیشن ہے؟"

نواب صاحب بولے۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں میں ایسا کرتا ہوں کہ اپنے خاص آدمی کو تمہارے پاس بھیج دیتا ہوں میرا خیال ہے اسے ان ساری باتوں کی تفصیل معلوم ہوگی اگر

معلوم نہیں ہوگی تو وہ یہ تفصیلات معلوم کر لے گا۔"

اسی شام نواب صاحب واپس چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی میں نے قادر خان سے کہا۔

"قادر بھائی! تمہارے سانپ نے تو اپنا کام نہیں دکھایا۔ یہودی انسٹرکٹر ابھی تک زندہ ہے۔"

قادر خان بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ سانپ اس یہودی کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ وقت لگ جائے لیکن اگر سانپ ابھی تک زندہ ہے تو وہ اس یہودی کو چھوڑے گا نہیں۔"

دوسرے روز شام کے وقت نواب صاحب کا خاص آدمی آ گیا۔ درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ چائے تیار تھی۔ ہم کاٹج کے عقبی برآمدے میں بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ اس آدمی کا نام احمد میاں تھا۔ احمد میاں کہنے لگا۔

"ٹریننگ کیمپ میں اتنا ہی اسلحہ ہوتا ہے جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ ہفتے میں تین بار ایک فوجی ٹرک اسلحہ کی سپلائی لے کر آتا ہے۔ اس وقت وہاں سات لڑکیاں ہیں۔ چار لڑکیاں جالندھر امرتسر کی ہیں۔ تین لڑکیاں انبالے کی ہیں۔ یہ اونچی سوسائیٹی کی طوائفیں ہیں جن کا کام اعلیٰ سرکاری افسروں کا جی لبھا کر اپنے ایجنٹوں کو ٹھیکوں وغیرہ کا کام دلوانا ہوتا ہے۔ اس کے عوض وہ ٹھیکیداروں سے کمیشن وصول کرتی ہیں۔ یہ پڑھی لکھی فیشن ایبل لڑکیاں ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیمپ میں ان کی رہائش کا کیا انتظام ہے؟"

احمد میاں نے کہا۔

"یہ ٹریننگ کیمپ ان ضروریات کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔ جنگل کی پہاڑیوں میں گھرا ہوا یہ کیمپ آمنے سامنے تین بیرکوں پر مشتمل ہے۔ ایک بیرک

میں یہ ساری لڑکیاں رہتی ہیں۔ بھارت کی سرکار نے را کے پاکستان دشمن منصوبوں کی خاطر ان پیشہ ور طوائفوں کو بھاری رقم پیشگی دے کر ملازم رکھا ہے۔ جب انہیں پاکستان میں تخریب کاری اور جاسوسی کے لیے سمگل کیا جائے گا تو انہیں اسلام آباد کے بھارتی سفارت خانے سے بھی روزانہ کافی رقم ملا کرے گی اور انہیں اجازت ہوگی کہ اس کے علاوہ بھی وہ جتنا چاہیں خرچ کریں۔ انہیں اس بات کی بھی ضمانت دی گئی ہے کہ ان سے کوئی ایسا کام نہیں لیا جائے گا جس میں ان کی جان کو خطرہ ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو وہ کسی خاص جگہ پر صرف بم رکھ کر آ جائیں گی جو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ زیادہ تر ان کا کام اونچی سوسائٹی میں گھل مل کر پاکستان کے بعض فوجی راز معلوم کرنا ہوگا۔"

میں نے قادر خان سے کہا۔

"قادر بھائی! یہ عورتیں پاکستان کے لیے شدید خطرے کا باعث بن سکتی ہیں۔ انہیں پاکستان پہنچنے سے پہلے اسی جنگل میں ختم کرنا ہوگا۔"

قادر خان بولا۔ "ایسا ہی کریں گے تم فکر نہ کرو۔"

اس کے بعد قادر خان نے احمد میاں سے کچھ مزید ضروری معلومات حاصل کیں اور اسے واپس مراد آباد بھیج دیا۔ اب ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔ قادر خان کہنے لگا۔

"ہمارے پاس وہ خاص سانپ بھی نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو ہم ان کی مدد سے ان پاکستان دشمن عورتوں کو یہودی انسٹرکٹر سمیت ہمیشہ کی نیند سلا سکتے تھے۔ اب ہمیں کوئی دوسری سکیم سوچنی پڑے گی۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں یہ پوائینٹ پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ہمارا مشن صرف ان لڑکیوں کو ہلاک کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اصل مشن یہ ہے کہ ان کی ہلاکت سے اس قدر دہشت پیدا ہو جائے کہ آئندہ بھارت کی کوئی عورت تخریب کاری یا جاسوسی کے

مشن پر پاکستان جانے کے لیے تیار نہ ہو۔"

"یہی سب سے اہم بات ہے۔" قادر خان بولا۔ "یہی سوچنے کی بات ہے۔"

سورج غروب ہو رہا تھا ہم نہر کی طرف نکل گئے۔ نہر کنارے دور تک چلتے گئے۔ سوچ بھی رہے تھے کوئی سکیم ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ پیشہ ور لڑکیوں کی ٹریننگ شروع ہو چکی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ پندرہ بیس دن کی ٹریننگ کے بعد انہیں پاکستان سمگل کر دیا جائے گا۔ ایک بار وہ پاکستان سمگل ہوگئیں تو پھر ان کا پیچھا کرنا اور ایک ایک کو تلاش کر کے انہیں ہلاک کرنا مشکل کام تھا۔

دن کی روشنی آہستہ آہستہ پھیکی پڑ رہی تھی۔ ہم زیادہ تر خاموش تھے۔ دونوں گہری سوچ میں گم تھے نہر نہ چھوٹی تھی نہ زیادہ بڑی تھی۔ پانی مٹیالے رنگ کا تھا۔ جو بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم ایک پل پر پہنچ کر رک گئے۔ نہر اس پل کے نیچے سے گزرتی تھی۔ قادر خان بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ شام کا اندھیرا ہوگیا تو جنگل درندوں کا خطرہ ہوگا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم دونوں وہاں سے واپس مڑ گئے۔ ابھی ہم چند قدم پیچھے تھے کہ اچانک قادر خان رک گیا۔ وہ ادھر ادھر زمین پر دیکھنے لگا۔ میں بھی ٹھہر گیا۔ میں نے دیکھا کہ قادر خان جھک کر نہر کنارے جو گھاس اگی ہوئی تھی اس کو دیکھ رہا تھا اور سانس اوپر کھینچ کر کچھ سونگھنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"قادر بھائی! کیا بات ہے؟"

وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"اونچا مت بولو' مجھے سانپ کی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

"کون سا سانپ؟"

میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

"بولو مت۔ ابھی بتاتا ہوں۔ تم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

اس نے ایک درخت کی ٹہنی توڑ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ قادر خان ایک جھاڑی کی طرف دبے پاؤں بڑھا۔ یہ جھاڑی آدھی نہر کے پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ قادر خان جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں ماہر سپیرا بھی تھا۔ اس نے زندگی کے کچھ برس بنگال کے سپیروں کے ساتھ گزارے تھے۔ اس کا استاد بھی ایک بنگالی سپیرا ہی تھا۔ وہ جھاڑی کے قریب جا کر جھک گیا۔ اس نے درخت کی شاخ سے جھاڑی کی شاخوں کو ایک طرف ہٹایا تو سانپ کے پھنکارنے کی آواز آئی۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں ٹکٹکی باندھے جھاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ قادر خان نے چھڑی پیچھے کر لی۔ دوسری بار چھڑی یعنی درخت کی شاخ کو جھاڑی میں ڈالا تو جھاڑی میں سے ایک چھوٹا سا سانپ اچھل کر باہر آگیا اور منہ کھول کر قادر کی طرف دیکھتے ہوئے پھنکار مارنے لگا۔

قادر خان ذرا نہ گھبرایا۔ اس نے درخت کی شاخ کو سانپ کے منہ کے سامنے لے جا کر دائیں بائیں ہلانا شروع کیا تو سانپ بھی اپنی گردن کو دائیں بائیں ہلانے لگا۔ پھر اچانک قادر خان نے درخت کی شاخ سانپ کی گردن پر رکھ کر اسے وہیں دبوچ لیا۔ اب منظر یہ بن گیا تھا کہ قادر خان نے درخت کی شاخ سے سانپ کی گردن کو دبا رکھا تھا اور سانپ کے بدن کا نچلا حصہ شاخ کی چھڑی سے بے چین ہو کر بار بار پٹ رہا تھا۔ سانپ کے حلق سے عجیب عجیب قسم کی پھنکاریں نکل رہی تھیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے قادر خان نے سانپ کو گردن سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ سانپ کی گردن قادر خان کی گرفت میں تھی اور وہ جلیبی کی طرح قادر خان کی کلائی سے لپٹا ہوا تھا۔ قادر خان نے سانپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"حیدر علی! تم نے اس سانپ کو پہچانا نہیں۔ یہ وہی سانپ ہے جو یہودی

انسپکٹر جوزف کے جسم کی بو پر اس کی تلاش میں نکلا تھا۔ یہ خدا جانے کہاں کہاں سے ہوتا ہوا یہاں پہنچا ہے اور اب ٹریننگ کیمپ میں جا کر یہودی انسپکٹر کو ڈسنے کے لیے بے تاب ہے۔"

میں غور سے سانپ کو دیکھنے لگا۔ یاد آگیا یہ واقعی ان گیارہ بالشت بھر کے سانپوں میں سے ایک سانپ تھا جنہوں نے بمبئی والے ٹریننگ سنٹر میں تامل گوریلا دہشت گردوں کو ڈس کر ہلاک کیا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کو چھوڑ دو تاکہ یہ یہودی انسپکٹر کو جا کر ڈس آئے۔"

قادر خان بولا۔

"میرے ذہن میں ایک سکیم آگئی ہے۔ ابھی میں اس سانپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

کاٹیج میں آکر قادر خان نے بالشت بھر کے خطرناک زہریلے سانپ کو چائے کے خالی ڈبے میں بند کر کے اس کے ڈھکن میں چار پانچ چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیے اور ڈبے کو الماری کے اوپر رکھ لیا میں نے قادر خان سے پوچھا۔

"کیا ہمیں ایک بار پھر سپیرے بن کر ٹریننگ کیمپ جانا ہوگا؟"

قادر خان میرے ذہن کی بات کو سمجھ گیا تھا کہنے لگا۔

"نہیں اس دفعہ ہم ایک دوسرے روپ میں جائیں گے۔ سپیرے اس لیے نہیں بن سکتے کہ ہمارے پاس صرف ایک ہی سانپ ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ساتوں کی ساتوں لڑکیاں انگریزی پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں۔ ان پر سپیروں کا اتنا اثر نہیں ہوگا۔"

"تو پھر دوسرا کون سا بھیس بدل کر جائیں گے؟"

میرے سوال پر قادر خان بولا۔

"تم نے ایک بار بتایا تھا کہ تم ہندی زبان لکھ پڑھ لیتے ہو۔ تمہیں ہندوؤں کی مقدس کتابوں یعنی ویدوں اور پرانوں کے اشلوک بھی زبانی یاد ہیں اور تم

تھوڑی بہت سنسکرت بھی جانتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "ہاں میں نے ٹھیک بتایا تھا۔"

قادر خان کہنے لگا۔ "تو پھر اس بار ہم سادھو سنیاسی بن کر جائیں گے۔ ہندو لوگ اور خاص طور پر ہندو عورتیں خواہ وہ ان پڑھ ہوں یا پڑھی لکھی ہوں بہت ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ ہر ہندو کا عقیدہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد کسی نئے جسم میں جنم لیتا ہے۔ یہ جسم انسان کا بھی ہو سکتا ہے اور یہ جسم کتے بلی سانپ بچھو کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کو آواگون کہتے ہیں۔ سپیروں سے تو یہ لوگ اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ ان کے پیچھے کوئی سانپ نہ لگا دے۔ لیکن سادھو جوگی سے انہیں یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر کسی جوگی سنیاسی یا سادھو نے انہیں بد دعا دے دی تو ان کا گلا جنم کہیں سانپ' ناگن' کتے بلی یا بچھو کا نہ ہو جائے اور وہ مرنے کے بعد سانپ' کتیا' بلی کی شکل میں نہ پیدا ہو جائیں۔ ہم ان عورتوں کی سب سے کمزور رگ پر حملہ کریں گے اور اس اٹیک کے لئے ہمارا سادھو جوگی بننا ضروری ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن اس کے لیے سانپ کو پکڑ کر ڈبے میں بند کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

قادر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ وقت آنے پر تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ میں صبح مراد آباد جا رہا ہوں تم یہیں ٹھہرو گے میں مراد آباد سے وہ چیزیں خرید کر لاؤں گا جن کی ہمیں اس مشن میں ضرورت پڑے گی۔"

قادر خان کا منصوبہ کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا' کچھ نہیں آیا تھا۔ مجھے اس منصوبے کی کامیابی کا سو فیصد یقین نہیں تھا۔ لیکن میں نے اعتراض اس لیے نہ کیا کہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دوسرا کوئی طریق کار ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ قادر خان اگلے دن مراد آباد روانہ ہوگیا۔ وہ وہاں دو دن لگا کر واپس آیا تو اس

کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک اٹیچی کیس تھا۔ اس نے مجھے اٹیچی کیس کھول کر دکھایا۔ اس میں وہ تمام اشیاء موجود تھیں جن کی ہمیں اس مشن میں ضرورت تھی۔

کہنے لگا۔

"میں نے نواب صاحب کو ساری سکیم بتا دی ہے۔ انہوں نے مجھے صرف ایک ہی ہدایت کی ہے کہ اس بارے میں انتہائی رازداری سے کام لیا جائے۔ یہاں کاٹج میں جو ان کا پرانا بوڑھا ملازم کام کر رہا ہے وہ اسے بھی اپنا آدمی بھیج کر کچھ دنوں کے لیے واپس مراد آباد بلا رہے ہیں تاکہ ہم خفیہ رہ کر اپنے مشن پر کام کر سکیں۔"

قادر خان نے اٹیچی کیس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر کھولا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ اس پر پنسل کی آڑی ترچھی لکیروں سے ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ سمبل کے ٹریننگ کیمپ کا نقشہ ہے۔ نواب صاحب نے اپنی خاص جاسوس کی مدد سے یہ نقشہ خود تیار کیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کسی بھی آدمی کو بطور گائیڈ بھی نہیں بھیجنا چاہتے۔"

قادر خان نے مجھے نقشے کی مدد سے سب سمجھایا کہ نواب صاحب کے کاٹج سے ہمیں کس طرف جانا ہوگا اور پھر کہاں کہاں سے گزر کر رام گنج نام کے شیومندر میں جا کر قیام کرنا ہوگا۔

"سمبل کا ٹریننگ کیمپ اس مندر سے شمال کی جانب تین میل کے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ میرا خیال ہے سارا نقشہ تمہارے ذہن میں آ گیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "تم تو اچھی طرح سمجھ گئے ہو ناں؟"

"میں تو آنکھ بند کر کے اپنے ٹارگٹ پر پہنچ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر فکر کی کوئی بات ہی نہیں۔ ہمیں تمہارے خیال میں کب روانہ ہونا چاہیے۔
قادر خان کہنے لگا۔

"کیمپ میں پاکستان کے خلاف ٹریننگ شروع ہو چکی ہے۔ یہ جاسوس اور تخریب کار عورتیں دہشت گردی اور جاسوسی کے مشن پر کسی بھی دن پاکستان کی طرف روانہ ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ صرف اس بات کا انتظار ہے کہ نواب صاحب کا آدمی آ کر کاٹج کے بوڑھے نوکر کو اپنے ساتھ مراد آباد لے جائے۔"

نواب صاحب ہمارے مشن کو اپنے بااعتماد ملازم سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ حسب وعدہ ان کا ایک آدمی آیا اور دوسرے روز کاٹج کے بوڑھے ملازم کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اب ہم اپنے مشن پر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں میں نے اپنی داڑھی اور مونچھیں اس طرح ترشوا رکھی تھیں کہ نہ میں سکھ لگتا تھا نہ کوئی مجھے مسلمان سمجھ سکتا تھا۔ اس قسم کا حلیہ بنانا میری مجبوری بھی تھی اور وقت کی ضرورت بھی تھی۔ قادر خان کلین شیو آدمی تھا۔ صرف اس کے سر کے بال لمبے تھے ہم نے کاٹج کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر کپڑے تبدیل کیے۔ اپنا حلیہ بھارت کے جوگی سنیاسیوں والا بنایا۔ اپنے پاس لمبے چولے کے اندر چھپا کر ایک ایک سائی لینسر والا پستول اور ایک ایک کمانڈو چاقو رکھ لیا۔ ہم چلنے لگے تو میں نے قادر خان سے کہا کہ وہ سانپ کا ڈبہ ساتھ نہیں لے جا رہا۔ وہ بولا۔
"ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

ہم اپنے جنگل والے کاٹج سے دوپہر سے ذرا پہلے نکلے۔ کیلے کے پتوں میں ہم نے کھچڑی ڈال کر رکھ لی تھی۔ اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ دوپہر اور رات کو ہمیں وہاں کھانے کو کچھ نہ ملے ہم جنگل میں ایک تنگ سی پگ ڈنڈی پر

چلے جا رہے تھے۔ قادر خان راستے سے واقف تھا کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم بھورے رنگ کی ان چھوٹی پہاڑیوں میں پہنچ گئے جن کے درمیان ٹریننگ کیمپ تھا۔ ہم نے ایک جگہ کھڑے ہو کر نیچے وادی میں کیمپ کا جائزہ لیا۔ وہاں دو تین آدمی ادھر ادھر کام کاج میں مصروف نظر آئے۔ قادر خان بولا۔

"ہمیں سامنے کی جانب جو چھوٹی پہاڑی ہے وہاں سادھی لگا کر بیٹھنا چاہیے آؤ میرے ساتھ۔"

ہم ایک ٹیلے کا چکر کاٹ کر اس پہاڑی پر آگئے جو ٹریننگ کیمپ کے عقب میں تھی یہ چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ اس کی چوٹی پر گھنے درختوں کی چھاؤں تھی۔ ہم نے وہاں جگہ بنالی اور بیٹھ گئے۔ جب تھوڑا سانس لے چکے تو قادر خان نے کہا۔

"دیکھتے ہیں نیچے صورت حال کیا ہے؟"

پہاڑی کی درختوں میں ایک جگہ سے نیچے ٹریننگ کیمپ اور اس کی آمنے سامنے بنی ہوئی بیرکیں دن کی روشنی میں بڑی صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس وقت وہاں دو آدمی زمین صاف کر رہے تھے۔ لکڑی کے دو کھمبے زمین گڑے ہوئے تھے جن کے ساتھ رسے لٹک رہے تھے۔ اتنے میں سیٹی بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس آواز پر بیرکوں میں سے لڑکیاں دوڑتی ہوئی باہر نکلیں اور لکڑی کے کھمبے کے سامنے قطار بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ دوسری طرف سے ایک گورے رنگ کا آدمی نمودار ہوا۔ میں نے اسے دور سے ہی پہچان لیا یہ یہودی انسٹرکٹر جوزف تھا۔ قادر خان نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"حیدر علی! میں نے اسے پہچان لیا ہے کیا تم نے پہچانا؟ یہ اسرائیلی انسٹرکٹر جوزف ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں نے بھی پہچان لیا ہے۔ مجھے یقین ہے اس وقت کاٹج کی کوٹھڑی میں

ڈبے میں بند سانپ کی بری حالت ہو رہی ہوگی۔ وہ ڈبے سے باہر نکلنے اور اس یہودی کو ڈسنے کے لیے پھنکاریں مار رہا ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" قادر خان بولا۔ "مگر ابھی اس یہودی کی زندگی کے کچھ دن باقی ہیں۔"

لڑکیوں نے نیکریں اور بنیانیں پہنی ہوئی تھیں۔ سروں پر رومال باندھ رکھے تھے۔ یہودی جوزف نے انہیں کوئی حکم دیا۔ لڑکیوں نے دوڑ کر کھمبے کے ساتھ لٹکتے رسوں کو پکڑا اور اوپر چڑھنے کی پریکٹس شروع کر دی۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"یہ کل سات لڑکیاں ہیں۔ میرا خیال ہے ان کے علاوہ اور کوئی لڑکی یہاں ٹریننگ نہیں لے رہی۔"

"ہوں" قادر خان نے کہا۔

وہ بڑے غور سے نیچے لڑکیوں کو رسوں کی مدد سے کھمبے کے اوپر چڑھتے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ لڑکیاں شام کے وقت جنگل میں چلنے پھرنے کے لیے ضرور نکلتی ہوں گی۔ ہمیں اس وقت ان میں سے کسی لڑکی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اگر ہم نے ان میں سے کسی ایک لڑکی پر اپنا اثر ڈال لیا تو باقی کی لڑکیاں اپنے آپ ہمارے زیر اثر آ جائیں گی۔"

اب ہم دن غروب ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ دوپہر کو ہم نے تھوڑی تھوڑی کھچڑی کھائی تھی۔ تیسرے پہر کیمپ کی ٹریننگ دوبارہ شروع ہو گئی۔ اس کے بعد کیمپ پر خاموشی چھا گئی۔ شام ہونے سے پہلے ہم نے پہاڑی کے آس پاس چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ مگر ہمیں وہاں کوئی لڑکی دکھائی نہ دی۔ ہم واپس اپنی جگہ پر آ رہے تھے کہ ایک عورت خچر پر بیٹھ کر کیمپ سے نکلتی دکھائی دی۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"یہ عورت مجھے ان لڑکیوں کی نائیکہ انسٹرکٹر لگتی ہے۔"

قادر خان نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خچر پر بیٹھی ہماری طرف آ رہی تھی۔ ہم درختوں کی اوٹ میں ہوگئے۔ عورت قریب سے گزری تو ہم نے دیکھا کہ وہ ادھیڑ عمر کی تھی۔ اس نے پتلون اور آدھی آستینوں والی بنیان پہن رکھی تھی۔ جب اس کا خچر پہاڑی پگڈنڈی پر ذرا دور نکل گیا تو میں نے قادر خان سے کہا۔

"قادر بھائی! میرا خیال ہے ہمیں اس عورت کو قابو میں کرنا چاہیے۔ یہ ہمارے اثر میں آگئی تو باقی کی سات لڑکیوں کو قابو کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔"

قادر خان کو میری تجویز پسند آئی۔ کہنے لگا۔

"مگر یہ عورت کہاں جا رہی ہے۔ یہاں قریب تو کوئی گاؤں نہیں ہے۔"

ہم کچھ فاصلہ ڈال کر اس عورت کا تعاقب کرنے لگے۔ پہاڑی پگڈنڈی پر خچر بڑی سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ ایک پہاڑی سے اتر کر خچر دوسری پہاڑی کے پیچھے کی طرف گھوم گیا۔ ہم بھی اسی طرف گھوم گئے۔ پہاڑی کی دوسری طرف سامنے درختوں میں ایک کیبن دکھائی دیا۔ عورت اس کیبن کی طرف چلی گئی۔ کیبن ذرا چڑھائی چڑھ کر بنا ہوا تھا۔ ہم دوسری جانب سے ہو کر جھاڑیوں میں چھپ کر عورت کو دیکھنے لگے۔ کیبن کا چھوٹا سا صحن ہمیں صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں ایک آدمی پودوں کی گوڈی کر رہا تھا۔ عورت کو دیکھ کر وہ دوڑ کر خچر کی طرف گیا۔ عورت کو سہارا دے کر نیچے اتارا اور خچر لے کر دوسری طرف چلا گیا۔ عورت نے اپنی بنیان کو نیچے کیا اور بڑی بے نیازی سے چلتی ہوئی کیبن کے اندر چلی گئی۔ قادر خان بولا۔

"یہ وہی عورت ہے جس کے بارے میں نواب صاحب کے مخبر نے بتایا تھا کہ یہ بمبئی کی اونچی سوسائٹی کی طوائف ہے جو ان لڑکیوں کو اعلیٰ سرکاری

افسروں اور سرمایہ داروں کو رام کرنے کی ٹریننگ دیتی ہے۔"

میں نے قادر خان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"پھر کیا خیال ہے؟"

قادر خان بولا۔ "تمہارے کمال دکھانے کا وقت آ گیا ہے۔ نیچے چلو میدان صاف ہے۔ میں تمہارا چیلا ہوں۔ تم میرے گورو ہو۔"

قادر نے آہستہ سے اولکھ نرنجن کا نعرہ لگایا۔ میں سمجھ گیا قادر خان میرے سامنے کیا تجویز رکھی ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جے شیو شنکر۔ آ جاؤ۔"

میں نے شیو دیوتا کا ترشول جو قادر خان کے ہاتھ میں تھا اس سے لے کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میرے ایک ہاتھ میں پیتل کا لوٹا تھا جس میں پانی تھا اور رتن جوت کے کچھ پھول پڑے تھے۔ میں آگے آگے تھا۔ قادر خان میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم جوگیوں کے بھیس میں بڑے سکون سے چلتے پہاڑی پگ ڈنڈی سے اتر کر کیبن کے صحن میں آ گئے۔ اس دوران وہ ملازم خچر لے کر دوسری طرف گیا تھا۔ واپس آ رہا تھا وہ بھی ہندو تھا۔ اپنے سامنے باغیچے میں دو جوگیوں سنیاسیوں کو دیکھا تو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور سر جھکا کر ہمیں جے شیو شنکر کہا۔ میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ "تیرا کلیان ہو بچہ۔"

اس کے ساتھ ہی ہم اپنے پروگرام کے مطابق ہم وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ ملازم بولا۔

"مہاراج! میں آپ کے لیے بھوجن پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بچہ تمہاری مالکن کہاں ہے؟ اس کو جا کر کہو کہ شیو جی مہاراج نے اس کے نام ایک سندیس بھیجا ہے جو ہمیں خود اس کو دینا ہے۔"

ملازم یہ کہہ کر جلدی سے کیبن نما مکان کے اندر چلا گیا کہ ماراج میں ابھی مالکن کو خبر کرتا ہوں۔

قادر خان نے میری طرف جھک کر کہا۔

"تم صورت حال کو سنبھال لو گے نا؟ کہیں کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہو گی؟"

میں نے اسے تسلی دی۔

"تم بے فکر رہو قادر بھائی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔"

دوسرے لمحے کمرے میں سے وہی عورت باہر نکلی۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کا لباس ابھی تک وہی بنیان پتلون ہی تھا۔ اس نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر عورت نے ہمیں پرنام کیا اور پوچھا۔

"مہاراج! کیسے آنا ہوا؟"

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بڑے شہر کی رہنے والی ہے اور ہمارے ایسے سادھو سنیاسیوں کا اس پر زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ میں نے اپنا ترشول والا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو ساوتری ہے۔ تو ساوتری ہے۔ پچھلے جنم میں تو اپنے ستیہ وان سے بچھڑ گئی تھی۔ تیرا اگلا جنم آکاش کی اپسرا کا ہو گا۔ میں تیرے ماتھے پر لکھا ہوا پڑھ رہا ہوں۔ تو اگلے جنم میں آکاش کے دیوتاؤں کے دربار میں رقص کیا کرے گی۔"

عورت پر میرے جملوں کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش لگایا تو میں نے کہا۔

"ساوتری! یہ سگریٹ دوزخ کی آگ کا دھواں ہے۔ یہ تجھے تیرے ستیہ وان سے دس جنموں تک ملنے نہیں دے گا۔ اس کو پھینک دے۔ پھینک دے۔"

ایسا میں نے جان بوجھ کر یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ اس پر میری تقریر کا کتنا اثر ہوا ہے۔ عورت نے فوراً سگریٹ پھینک دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"مہاراج! پدھاریئے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتی ہوں۔"

وہ ہمیں کیبن کے اندر لے گئی۔ کمرا بڑا سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر رقص

کرتی ہوئی بمبئی کی فلم ایکٹرسوں کی تصویریں تھیں۔ میں نے اندر جاتے ہی اداکاری شروع کر دی۔ پیتل کے لوٹے میں سے چلو میں پانی لے کر ادھر ادھر چھڑکا۔ رتن جوت کے تین چار پھول پھینکے اور ترشول والا بازو بلند کر کے کہا۔

"ساوتری! تو دھن ہے' دھن ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرا اگلا جنم اپسراؤں کی ملک ہوگا۔ تو بھگوان شیو کے دربار میں رقص کیا کرے گی۔"

دوسرے جنم میں آکاش کی اپسرا یعنی آکاش کے سب سے بڑے دیوتا شیو مہاراج کے دربار میں بطور شاہی رقاصہ کے رقص کرنا ایک رقص کرنے والی طوائف کے لیے بہت بڑا اور بلند مقام تھا۔ وہ عورت خوش ہو کر بولی۔

مہاراج! مجھے آشیرباد دیجیے۔"

میں نے اپنے ماتھے پر لگے ہوئے تلک پر انگلی رکھ کر اس کا تھوڑا سا رنگ انگلی پر لگایا اور اسے عورت کے ماتھے پر لگا دیا۔ وہ تو میرے آگے بچھی جا رہی تھی۔ قادر خان میرے پیچھے ہاتھ باندھے ادب سے کھڑا تھا۔ عورت نے کہا۔

"ماراج! یہاں بیٹھیے میں آپ کے لیے حلوہ پوری لاتی ہوں۔"

میں صوفے پر اور قادر خان میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

"بالکہ! ہمیں کھانے پینے کی اس وقت حاجت نہیں ہے۔ ہم تیری جنم کنڈلی دیکھ کر تجھ کو بدھائی دینے آئے ہیں کہ تو جنم جنم کے بندھن سے آزاد ہو گئی ہے تو نے شکتی پا لی ہے۔ جو عورت شیو بھگوان کی نرتکی بن جاتی ہے اس کو آگے کوئی جنم نہیں ہوتا۔ وہ شکتی پا جاتی ہے اور سدا سورگ میں رہتی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے سنسکرت کے اشلوک گا کر پڑھنے شروع کر دیے۔ اتفاق سے اس عورت کا اصلی نام بھی ساوتری ہی تھا۔ اس نے اپنا دوسرا نام کامنی دیوی رکھا ہوا تھا۔ میں نے تو ستیہ دان ساوتری کی ہندو مائیتھالوجی کی کہانی کا سہارا لے کر اسے ساوتری کہہ کر پکارا تھا۔ اس دیومالائی کہانی کی ہیروئن کا نام ساوتری تھا جس نے اپنے خاوند ستیہ دان کی خاطر اپنی جان قربان کر دی

تھی لیکن حسن اتفاق سے اس عورت کا نام ساوتری نکل آیا۔ وہ ہماری آؤ بھگت میں لگ گئی۔ میں نے کہا۔

"نہیں بالکہ! ہمارے پاس اس وقت ٹائم نہیں ہے۔ ہمیں آکاش پر بھگوان شیو جی کے درشن کرنے جانا ہے۔ ہم کل اسی وقت تمہارے پاس آئیں گے اور تمہیں اپنا آشیرباد دیں گے۔ ہمارا آشیرباد ملنے کے بعد تیری قسمت کھل جائے گی۔ تو بمبئی کی سب سے مشہور اور مالدار نرتکی بن کر ابھرے گی۔ جے شیو شنکر! چل بالکے۔"

میں نے قادر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے تو ساوتری نائیکہ نے میرے قدم چھو کر کہا۔

مہاراج! اپنی بالکہ کو بھول نہ جائیے گا۔ کل میرے غریب بھون پر ضرور پدھاریے گا۔"

میں نے کہا۔ "ہم اوش آئیں گے۔ اوش آئیں گے۔"

اور میں جے شیو شنکر جے شیو شنکر بولتا وہاں سے چل پڑا۔ جب تک ہم ساوتری کے کیبن سے دور نہیں ہوگئے میں برابر جے شیو شنکر کا الاپ کرتا رہا۔ جب ہم وہاں سے کافی دور نکل آئے تو میں نے قادر خان سے پوچھا۔

"قادر بھائی! کیا خیال ہے؟"

وہ خوش ہو کر بولا۔

"بھائی! تم نے تو کمال کی اداکاری کی ہے۔ اب یہ عورت ہمارے ہاتھ سے نہیں جاتی۔"

ہم دوسرے دن پوری تیاری کر کے وہاں گئے۔

وہ بھی ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے طرح طرح کے پکوان پکا رکھے تھے۔ ہمارے پاؤں چھو کر سواگت کیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ٹیکہ لگایا۔ ہم کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنی گودڑی میں سے ایک پوتھی نکالی اور ساوتری سے کہا۔

"ساوتری! بالکہ! آج ہم تمہیں شیو بھگوان کے درشن کرانے آئے ہیں۔"

وہ نائیکہ تو خوشی سے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"اس پوتھی میں آکاش کی تمام اپسراؤں' نرتکیوں کی جنم کنڈلیاں ہیں اس میں تمہاری جنم کنڈلی بھی ہے۔ میرے سامنے آ کر بیٹھ جا۔ میں تمہیں بھگوان شیو کے درشن کرا دوں گا۔ تو بڑی بھاگوان ہے۔ اوم ہر تت ست' اوم ہری تت ست۔"

میں نے یونہی پوتھی کے ورق الٹنے شروع کر دیے۔ پھر ایک صفحے کو غور سے پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے میں نے اپنی آواز کو زیادہ گھمبیر بناتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔

"ساوتری! میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے اور بھگوان شیو کے درمیان سات عورتیں دیوار بن کر کھڑی ہیں۔"

ساوتری نائیکہ کا چہرہ اتر گیا۔ میں نے پوتھی بند کر دی اور اس سے سوال کیا۔

"ساوتری! کیا یہاں تمہارے ساتھ سات نرتکیاں بھی رہتی ہیں۔"
وہ فوراً بولی۔
"ہاں مہاراج! سات لڑکیاں ہیں۔ میں انہیں ڈانس وغیرہ سکھاتی ہوں۔"
میں نے جے شیو شنکر کا نعرہ لگا کر کہا۔
"میری پوتھی کبھی غلط نہیں کہتی۔ ساوتری! یہ سات لڑکیاں تجھے شیو شنکر بھگوان سے کبھی نہیں ملنے دیں گی۔ یہ تیری دشمن ہیں یہ چاہتی ہیں کہ اگلے جنم میں خود بھگوان شیو کے دربار میں نرتکیاں بن جائیں۔"
ساوتری پریشان ہو گئی تھی۔ کہنے لگی۔
"مہاراج! اس کا کوئی اپائے نہیں ہے۔"
میں نے کہا۔ "ہے اپائے ہے۔ ہم نے تمہاری خاطر اس کا اپائے تلاش کر ا ہے۔ یہ اپائے خود بھگوان شیو نے ہمارے دل میں ڈالا ہے۔"
ساوتری نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔
"مہاراج! مجھے بتائیے۔ ہمیں اپائے بتائیے۔ میں اس کے لیے ہر طرح کا ران دینے کو تیار ہوں۔"
میں نے کہا۔ "ساوتری! بلیدان دینے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔ تیری طرہم بلیدان دیں گے ہاں تجھے صرف ایک کام کرنا ہو گا۔"
"حکم کریں مہاراج!"
ساوتری نے عاجزی سے کہا۔ میں نے سب کچھ سوچ رکھا تھا۔ میں نے اس ہ پوچھا۔
"ساوتری! کیا یہ سات لڑکیاں انگیا پہنتی ہیں۔"
اس نے کہا۔ "ہاں مہاراج! ساتوں انگیا پہنتی ہیں۔"
میں نے بازو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔
"بس بس ساوتری سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔ فوراً" ان ساتوں لڑکیوں کی انگیا

لا کر مجھے دے۔ میں ان پر ایک منتر پڑھ کر پھونکوں گا پھر ایک رات کا ابھیاس کروں گا۔ پھر تمہیں ساتوں کی ساتوں انگیا واپس کر دوں گا اس کے بعد ان سات لڑکیوں کی دیوار تمہارے راستے سے ہٹ جائے گی اور تو شیو بھگوان کے درشن بھی کرے گی اور دوسرے جنم میں شیو بھگوان کی نرتکی بھی بن جائے گی۔"

ساوتری بولی۔ "مہاراج! میرے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں کل ہی ان لڑکیوں کی انگیا اتروا کر اپنے پاس رکھ لوں گی۔ یہ کام میں کر سکتی ہوں۔ وہ میرا ہر حکم مانتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "دھن ہے، تو دھن ہے بالکے۔ بس ہم کل اسی وقت تمہارے بھون پر آئیں گے اور ساتوں انگیا اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پھر تیرا کلیان ہو جائے گا۔ جے شیو شنکر! جے ماتا بھوانی! اب ہم چلتے ہیں کل آئیں گے۔"

ساوتری ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

"مہاراج بھوجن تو کرتے جائیں میں نے آپ کی خاطر اپنے ہاتھ سے کچوریاں بنائی ہیں۔

میں نے دل میں کہا کم بخت ہم مسلمان پلاؤ زردہ اور مرغ مسلم کھاتے ہیں۔ یہ کچوریاں تیرا باپ کھائے گا مگر ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے اور قادر خان نے کچوریوں سے ہی پیٹ بھر لیا اور واپس چل پڑے۔ ساوتری ہمیں پہاڑی پگ ڈنڈی تک چھوڑنے آئی۔ قادر خان پگ ڈنڈی کا موڑ مڑتے ہی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سب کام ٹھیک ہو گیا ہے! وہ بولا۔ "بالکل سو فیصد ٹھیک ہوا ہے۔"

قادر خان نے مجھے بتا دیا تھا کہ ہمارے پاس ان پاکستان دشمن عورتوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے صرف ایک ہی سانپ ہے۔ اگر ہم نے ان عورتوں کی

ساڑھیاں وغیرہ اسے سنگھائیں تو اس میں اتنا زہر پیدا نہیں ہو سکے گا کہ وہ ایک ہی وقت میں ان ساتوں لڑکیوں کو ڈس سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان لڑکیوں کی اتری ہوئی انگیا اسے سنگھائی جائیں۔ انگیا میں عورت کے جسم کی بڑی تیز بو ہوتی ہے یہ بو سونگھنے کے بعد سانپ میں اتنا زہر پیدا ہو جائے گا کہ وہ ایک ہی وقت میں دو درجن انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار سکے گا۔

دوسرے دن ہم شام کے بعد ساوتری کے پہاڑی کیبن میں پہنچ گئے۔ اس نے ہمارے پاؤں چھو کر ہمارا سواگت کیا۔ ہمیں کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ میں نے پوچھا۔

"ساوتری! کیا تو لڑکیوں کی انگیا لے آئی ہے؟"

وہ بولی۔ "ہاں مہاراج! میں ابھی لاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر ایک الماری کی طرف گئی اسے کھول کر اس میں سے ایک تھیلا نکال کر لے آئی۔ تھیلا میرے سامنے رکھ کر بولی۔

"مہاراج اس میں ساتوں لڑکیوں کی انگیا ہیں۔"

میں نے تھیلا الٹا دیا۔ اس کے اندر سے لال ہرے پیلے اور سیاہ رنگ کی زنانہ زیگ باہر نکل آئیں۔ میں نے پوچھا۔

"بالکہ! یہ نئی انگیا تو نہیں ہیں نا؟"

ساوتری نے فوراً" کہا۔

"نہیں نہیں مہاراج! میں نے خود ان کے جسموں سے اپنے سامنے اتروائی ہیں۔ مہاراج۔ سب ان لڑکیوں کی پہنی ہوئی انگیا ہیں۔"

"تب ٹھیک ہے تب ٹھیک ہے۔ اب تو فکر مت کر سمجھو تیرے اور بھگوان کے درمیان جو دیوار کھڑی تھی وہ ہٹ گئی۔ اب مجھے اس پر منتر پڑھ کر ابھیاس کرنے دے۔ جے سیا ساوتری! جے سیا ساوتری۔"

میں نے ساتوں لڑکیوں کی رنگ برنگی انگیاں تھیلے میں ڈال دیں اور تھیلا

قادر خان کی طرف اچھال کر کہا۔

"بچہ! اس کو اپنے پاس رکھ لے۔ آدھی رات میں جب یگیہ کر رہا ہوں گا تو مجھے دے دینا۔"

قادر خان نے تھیلا پکڑ لیا اور بولا۔

"جو آگیا مہاراج۔"

مجھے یہ فکر تھی کہ کہیں رات کو لڑکیاں ادھر ادھر نہ ہو جائیں۔ میں نے ساوتری سے پوچھا۔

"ساوتری! یہ تیری دشمن لڑکیاں کہیں چلی تو نہیں جائیں گی؟"

وہ بولی۔ "نہیں مہاراج! انہیں کہاں جانا ہے۔ وہ ابھی سات آٹھ دن اسی جنگل میں رہ کر مجھ سے ڈانس سیکھیں گی۔"

میں مطمئن ہوگیا۔ قادر خان کی طرف نگاہ ڈالی تو وہ مجھے آنکھوں سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غور کیا تو وہ ساوتری کے سینے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے غور کیا۔ کیا مجھے وہ کچھ کرنا چاہیے جو قادر خان کہہ رہا ہے؟ تھوڑی دیر ساوتری سے باتیں بھی کرتا رہا اور سوچتا بھی رہا۔ آخر میں نے قادر خان کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے سوچا کہ یہ عورت بھی فساد کی جڑ ہے۔ اگر یہ زندہ رہی تو دوسری طوائفوں کی تربیت کر کے انہیں بھی جاسوسی کے لیے پاکستان بھجوا سکتی ہے۔

میں نے ساوتری کی طرف جھک کر اس کو غور سے دیکھا۔ ساوتری کچھ گھبرا گئی۔ بولی۔

"مہاراج! کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں ساوتری! تجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی غلطی مجھ سے ہوگئی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں بھول گیا ہوں کہ ان انگیوں پر ابھیاس کرنے کے بعد تمہاری انگیا پر منتر پڑھ کر پھونکنا بھی ضروری ہے۔ اس لیے بالکہ! تو اپنی

انگیا بھی اتار کر مجھے دے دے۔"

ساوتری شرما گئی۔ اگرچہ وہ ایک تجربہ کار پیشہ ور طوائف تھی مگر آخر عورت تھی اور عورت کے اندر تھوڑا بہت شرم و حیا کا مادہ ضرور باقی رہتا ہے۔ میں نے کہا۔

"شرماؤ نہیں بالکہ! اپنے گورودیو سے مت شرماؤ۔ ہم تو سادھو سنیاسی لوگ ہیں ہم سے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "بہت اچھا مہاراج! میں ابھی اندر جا کر اپنی انگیا اتار کر لاتی ہوں۔"

مجھے خیال آیا کہیں یہ عورت کوئی دھوبی کی دھلی ہوئی انگیا نہ آئے محض اس خیال سے کہ کون انگیا اتارنے کی بک بک کرے۔ میں نے کہا۔

"نہیں نہیں ساوتری! اگر تجھے جنم جنم کے بندھن سے مکتی حاصل کرنی ہے۔ اگر تجھے بھگوان شیو کے درشن کرنے ہیں تو تجھے میرے سامنے اپنی انگیا اتار کر مجھے دینی ہوگی۔ اگر تو ایسا نہیں کرے تو میرا سارا ابھیاس بھنگ ہو کر رہ جائے گا۔"

یہ سن کر ساوتری طوائف کے پاس جو تھوڑی بہت شرم و حیا تھی اس نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ ریشمی مردانہ قمیض اور پتلون پہنے تھی کہنے لگی۔

"جو حکم مہاراج!"

اور اس نے فوراً اپنی ریشمی قمیض اتار دی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا جسم کافی صحت مند تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی انگیا پہنی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے آرام سے اپنی انگیا اپنے جسم سے الگ کی اور میرے پاؤں میں رکھتے ہوئے بولی۔

"یہ لیجئے مہاراج! آپ کی آگیا کا پالن کرنا آپ کی داسی کا فرض ہے۔"

ساوتری نے اپنی اتاری ہوئی ریشمی قمیض جو اتارتے وقت الٹی ہوگئی تھی کو سیدھا کیا اور بڑے آرام سے اسے دوبارہ پہن لیا۔ وہ ساتھ ساتھ میری طرف دیکھ کر مسکراتی بھی جا رہی تھی۔ اس پیشہ ور طوائف کی نیت بدل چکی تھی۔ مگر میری نیت نہیں بدلی تھی۔ میں نے اس کی انگیا قادر خان کے حوالے کی اور کہا۔

"بچہ ستی ساوتری کی انگیا بھی تھیلے میں سنبھال کر رکھ لے۔"

قادر خان نے فوراً" ساوتری کی انگیا بھی تھیلے میں ڈال لی۔ اب ہمارا وہاں سوائے پیٹ پوجا کرنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ ساوتری نے اس رات بھی ہمارے واسطے طرح طرح کے پکوان پکائے ہوئے تھے۔ اس نے ہمارے آگے کھانا لگوا دیا۔ ہم دونوں کھانا کھانے لگے۔ ساوتری میرے سامنے بیٹھی مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ میں اس کی نظروں کی زبان کو سمجھتا تھا۔ مگر میں ایک اعلیٰ مقصد لے کر دشمن کے علاقوں میں آیا ہوا تھا۔ اس اعلیٰ مقصد کا تقاضا تھا کہ میں ہر قسم کی لذت پرستیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھوں اور کوئی ایسی حرکت نہ کروں جو خدا کو ناپسند ہو۔ اور مجھ پر خدا کا عذاب نازل ہو جائے۔ کیونکہ میرا یہ ایمان بھی تھا اور میرا یہ تجربہ بھی تھا کہ آدمی اگر کوئی گناہ کرتا ہے تو اسے اس کی سزا مل کر رہتی ہے۔ میں نے ساوتری سے پوچھا۔

"ساوتری! یہاں لڑکیوں کو فوج کے لیے قواعد سکھائے جاتے ہیں۔"

"ہاں مہاراج! بھارت سرکار لڑکیوں کی فوج بھی تیار کر رہی ہے۔"

ساوتری مجھ سے اصل بات چھپا گئی تھی۔ میں نے پوچھا "لیکن ان عورتوں کو ڈانس کیوں سکھایا جاتا ہے بالکہ؟ کیا یہ لڑکیاں محاذ جنگ پر ڈانس کیا کریں گی۔"

ساوتری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں مہاراج! ایسی بات نہیں ہے۔ ہمیں بھی ان لوگوں نے کچھ نہیں

بتایا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان لڑکیوں کو بھارتی فوجی افسروں کا دل بہلانے کے لیے بھرتی کیا جائے گا۔"

"نارائن! نارائن۔" میں نے کانوں پر ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "کیا کل جگ آگیا ہے' کیا کل جگ آگیا ہے۔"

رات زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی کہ ہم ساوتری کے ہاں سے روانہ ہوگئے۔ راستے میں میں نے قادر خان سے پوچھا۔

"کیا اس عورت کو ہلاک کرنا ضروری ہے قادر بھائی؟"

وہ بولا۔ "زہر تیار کر کے دوسروں کو پلانے والا زہر سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ زہر تو صرف ایک آدمی کو مارتا ہے مگر زہر تیار کرنے والے کے ہاتھوں کوئی بھی محفوظ نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد میں نے قادر خان سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔ ہم ہاں سے سیدھے واپس نواب صاحب کے کاٹج میں آ گئے۔ اس وقت رات کے س بج چکے تھے۔ میں نے قادر خان سے پوچھا کہ اب اس کا کیا پروگرام ہے۔ ہ بولا۔

"توپوں کا رخ دشمن کی طرف کر دیا گیا ہے۔ ٹارگٹ رجسٹر ہوگئے ہیں۔ ب فائرنگ شروع ہو جانی چاہیے۔"

"اوکے۔"

قادر خان کوٹھڑی کے کونے میں جا کر سانپ کا ڈبہ اٹھا کر لے آیا۔ ڈبے ے اندر سانپ پھنکار رہا تھا۔ قادر خان بولا۔

"اس کو یہودی انسٹرکٹر کے جسم کی بو بڑے قریب سے آ رہی ہے۔ انپ اس وقت اپنے ٹارگٹ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اب یہ چاہتا ہے کہ اسے وڑ دیا جائے۔"

پھر وہ سانپ سے باتیں کرنے لگا۔

"گھبراتے کیوں ہو؟ دو چار اور دشمنوں کے کپڑے سونگھ لو۔ آج رات تمہیں کچھ اور پاکستان کے دشمنوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔ ذرا صبر کرو۔ ذرا صبر کرو۔"

میں نے کہا۔ "سانپ کو لڑکیوں کی انگیا کیسے سنگھاؤ گے؟"

قادر خان اس دوران تھیلے کو کھول کر لالٹین کی روشنی میں تھیلے اندر رنگ برنگی انگیوں کا معائنہ کر رہا تھا۔

"سانپ کو ڈبے سے نکالنا خطرناک ہوگا۔ ڈبہ چھوٹا ہے۔ یہ باہر آ کر ہمیں بھی ڈس سکتا ہے۔ اس کو ڈبے سمیت تھیلے میں ڈال دوں گا۔ ڈبے کے سوراخوں میں سے اس کو لڑکیوں کی انگیوں کی بو پہنچ جائے گی۔ کپڑے کے اس ٹکڑے میں عورت کے جسم کی بڑی تیز بو رچی ہوتی ہے۔ سانپ اسے بڑی جلدی سونگھ لیتا ہے۔"

قادر خان نے ڈبے کو کھولنے کی بجائے اسے بند کا بند انگیوں والے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا منہ بند کر دیا۔ منہ بند کرنے کی دیر تھی کہ تھیلے کے اندر سانپ کی پھنکاروں نے شور مچا دیا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ سانپ ابھی ڈبے کو توڑ کر تھیلے میں سے باہر نکل آئے گا۔ قادر خان تھیلے کے پاس ہی بیٹھا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کم از کم آدھا گھنٹہ ڈبہ تھیلے کے اندر ہی رہے گا۔"

میں نے کہا۔ "میں اتنی دیر میں ہندی میں مضمون کاغذوں پر لکھ لیتا ہوں۔"

قادر خان بولا۔

"ہاں الماری میں سے رجسٹر اور بال پوائنٹ نکال کر مضمون تیار کر کے اس کی نو کاپیاں تیار کر لو۔ سات کاغذ لڑکیوں کے لیے ایک یہودی انسٹرکٹر کی لاش اور ایک ساوتری کی لاش کے گلے میں باندھنے کے لیے۔"

میں نے الماری میں سے خالی صفحوں والا رجسٹر نکال لیا اور گہرے سیاہ بال پوائینٹ قلم سے ہندی کا ایک مضمون لکھ کر قادر خان کو دکھایا۔ وہ ہندی پڑھ لیتا تھا۔ یہ مضمون میں پہلے بھی بمبئی والے ٹریننگ سینٹر کے دہشت گردوں کی لاشوں کے گلے میں ڈالنے کے لیے لکھ چکا تھا۔ اس میں یہی لکھا تھا کہ ہم بھارت کی ایک مسلم تنظیم کی طرف سے خبردار کرتے ہیں کہ ہم بھارت سرکار کے اسلام دشمن منصوبوں کو خاک میں ملانے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ اگر آئندہ بھارت کی متعصب اور پاکستان دشمن سرکار کی طرف سے اس قسم کا کوئی ناپاک منصوبہ بنایا گیا تو ان عورتوں کا بھی یہی انجام ہوگا میں نے اس مختصر مضمون کی نو کاپیاں تیار کر کے ان میں نائیلون کے دھاگے پرو دیے۔

قادر خان بولا۔ "سانپ نے جتنی بو سونگھنی تھی سونگھ لی ہے۔ میں اسے اب چھوڑنے لگا ہوں۔ تمہارے خیال میں ساتوں لڑکیاں اور یہودی انسٹرکٹر کیمپ میں ہی ہوگا ناں؟"

میں نے کہا۔ "لگتا تو یہی ہے۔ آگے خدا بہتر جانتا ہے۔"

قادر خان نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر سانپ کا ڈبہ نکال لیا۔ کہنے لگا۔ "اب ہمیں اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔"

ہم نے کوٹھڑی کی لالٹین بجھا دی۔ باہر نکل کر کوٹھڑی کو تالا لگایا اور ٹریننگ کیمپ کی طرف روانہ ہوگئے ہم چاہتے تھے کہ سانپ کو ٹارگٹ کے زیادہ سے زیادہ قریب جا کر چھوڑا جائے۔ ہم اسی پہاڑی پر آ گئے جہاں سے ہمیں نیچے کیمپ کی بیرکیں اور ساوتری کے کیبن کے باہر جلتی لالٹین کی روشنی صاف نظر آ رہی تھی۔ یہاں بجلی نہیں تھی اور رات کو لالٹین اور لیمپ روشن کیے جاتے تھے۔ قادر خان نے کہا۔

"میں سانپ کو چھوڑنے لگا ہوں۔ تم پرے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ قادر خان نے تھیلے میں سے ڈبہ نکال لیا۔ پھر

بڑی احتیاط کے ساتھ اس کا ڈھکن الگ کیا اور جلدی سے سانپ کو نیچے ڈھلان کی طرف پھینک دیا۔ سانپ کی پھنکار کی آواز بلند ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

رات کی تاریکی میں سانپ کے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم درختوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے اور نیچے کیمپ کی طرف دیکھنے لگے۔ کیمپ کی بیرکوں کے کونوں پر لیمپ روشن تھے جن کی روشنی بہت دھندلی تھی۔ قادر خان کہنے لگا۔

"ہماری اطلاع کے مطابق ان بیرکوں میں سے ایک بیرک میں ساتوں لڑکیاں رات کو سوتی ہیں۔ ایک بیرک میں یہودی انسٹرکٹر ہوتا ہے اور دوسرے ملازم بھی وہیں سوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے سانپ ان نوکروں کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

قادر خان کہنے لگا۔

"سانپ کو ہم نے دو دن تک بھوکا پیاسا رکھا ہے۔ ویسے سانپ کئی کئی دن تک تھوڑی سی آکسیجن پر زندہ رہ سکتا ہے اور کھائے بغیر بھی کئی دن نکال لیتا ہے مگر یہ سانپ جو سب سے زیادہ زہریلا ہے اور چھوٹا ہے اس کے اندر زہر کی بہت سخت گرمی خشکی ہوتی ہے اس کو دن میں تین بار پیاس لگتی ہے۔ اسے پانی نہیں ملا۔ یہ پاگل ہو چکا ہے۔ جن کی بو پر یہ جا رہا ہے ان کو تو یہ ہر حالت میں مار ڈالے گا۔ لیکن اس کے راستے میں کوئی دوسرا آدمی بھی آیا تو یہ اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ اپنے ٹارگٹ کے خون سے اپنی پیاس بجھائے گا۔"

"اس کے بعد یہ ساوتری کے مکان پر آ جائے گا ناں؟"

میرے سوال کے جواب پر قادر خان نے کہا۔ "بہت ممکن ہے کہ یہ سب سے پہلے ساوتری کو ڈسے کیونکہ اس کا کیبن راستے میں ہی آتا ہے لیکن خیال یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی یہودی انسٹرکٹر کو نشانہ بنائے گا کیونکہ اس کی تلاش

میں یہ ایک مدت سے بھٹکتا پھر رہا ہے۔ بہرحال ہمیں کچھ دیر اسی جگہ بیٹھ کر انتظار کرنا ہوگا۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

رات گزرتی جا رہی تھی کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جنگل ایسے سنسان تھا جیسے اسے بھی سانپ سونگھ گیا ہو۔ بمشکل آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ نیچے کیمپ میں سے کچھ آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ آوازیں آدمیوں کی تھیں۔ قادر خان نے میری طرف دیکھا۔ کہنے لگا۔

"لگتا ہے نوکروں کی آنکھ کھل گئی ہے۔"

آوازیں جیسے ایک بار ہی بلند ہو کر جیسے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں۔ قادر خان مسکرایا کہنے لگا۔

"سانپ نے کیمپ کا ٹارگٹ مار لیا ہے۔ کیمپ کے سارے مردوں اور لڑکیوں کو اس نے ڈس کر ہلاک کر دیا ہے۔ چلو نیچے چل کر پتہ کرتے ہیں۔"

وہ تھیلا ہمارے پاس ہی تھا جس میں لڑکیوں اور ساوتری کی انگیاں تھیں۔ سانپ والا خالی ڈبہ بھی اور وہ چھوٹے کاغذ بھی تھے جنہیں ہم نے لاشوں کی گردنوں میں ڈالنا تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے اندھیرے میں پہاڑی کی ڈھلان اتر کر نیچے کیمپ میں آ گئے۔ یہ بالکل وہی منظر تھا جو اس سے پہلے میں بمبئی والے ٹریننگ سینٹر میں رات کو دیکھ چکا تھا۔ وہاں کوئی گارڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک بیرک کا دروازہ کھول کر اندر گئے تو دیکھا کہ لالٹین جل رہی تھی اور ایک چارپائی پر ایک گورے آدمی کی لاش پڑی تھی۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو اسے پہچان لیا۔ یہ یہودی انسٹرکٹر جوزف کی لاش تھی۔ لاش پتھر بن چکی تھی۔ سانپ نے سب سے پہلے شاید اسی دشمن کو ڈسا تھا۔ دوسرے بیرک میں گئے تو

وہاں تین ملازموں کی لاشیں زمین پر ادھر ادھر پڑی تھیں۔ ایک لاش کے ہاتھ میں ابھی تک لکڑی کا ڈنڈا تھا۔ لگتا تھا کہ انہوں نے سانپ کو مارنے کی کوشش کی تھی کہ سانپ نے انہیں بھی ڈس کر ہلاک کر دیا۔

ہم نے واپس جا کر یہودی جوزف کی گردن میں لکھا ہوا کاغذ نائیلون کی رسی سے لٹکا دیا۔ اس کے بعد ہم کونے والی بیرک میں گئے۔ یہاں بڑا دردانگیز منظر تھا۔ ساتوں کی ساتوں طوائف لڑکیاں اپنی اپنی چارپائیوں پر مردہ پڑی تھیں۔ ان کی لاشیں بھی سانپ کے ڈسنے سے پتھر بن چکی تھیں۔ ہم نے جلدی جلدی ان کی گردنوں میں بھی لکھے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے لٹکائے اور وہاں سے تیز تیز قدموں سے باہر نکل کر اوپر ساوتری کے کیبن کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ ساوتری کا صرف ایک ہی بوڑھا ملازم تھا۔ وہ کہیں نظر نہ آیا۔ کیبن میں اندھیرا تھا۔ باہر جو لیمپ جل رہا تھا اس کی کمزور روشنی میں صحن کا باغیچہ سنسان پڑا تھا۔

ہم نے دروازے کو کھولنا چاہا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہم دوسری طرف گئے جدھر کھڑکی تھی۔ کھڑکی بھی بند تھی۔ ہم بوڑھے ملازم کی کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ خدا جانے نوکر کہاں چلا گیا تھا۔ اس کی لاش بھی کہیں نہیں پڑی ہوئی تھی۔ ہم نے بڑی مشکل سے ساوتری کے کمرے کے دروازے کا تالہ اندر سلاخ ڈال کر توڑا اور اندر داخل ہوگئے۔ اندر چھوٹا سا لیمپ روشن تھا۔ اس کی روشنی میں ہم نے ساوتری کو دیکھا کہ پلنگ پر اس طرح مردہ پڑی تھی کہ اس کا آدھا دھڑ پلنگ کی پٹی سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ سانپ کی پھنکار سن کر اس نے پلنگ سے اٹھ کر دوڑنے کی کوشش کی ہوگی کہ سانپ نے اسے پلنگ سے نیچے اترنے کی مہلت نہ دی اور وہیں ڈس کر ہلاک کر دیا۔ ہم نے ساوتری کے گلے میں کاغذ کا ٹکڑا لٹکایا اور وہاں سے باہر نکل آئے۔ ابھی ہم ساوتری کے مکان کے صحن میں ہی تھے کہ ہمیں سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ قادر خان وہیں رک گیا اور اندھیرے میں دیکھنے لگا۔

"سانپ یہیں ہے۔ مگر وہ ہماری طرف کیوں آ رہا ہے؟ ایسی حالت میں سانپ واپس اپنے سپیرے کی طرف نہیں آیا کرتا۔ وہ پانی کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ کیونکہ اتنے آدمیوں کو ڈسنے سے اس کے بدن میں بہت زیادہ گرمی پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"اچھا ہے کہ سانپ یہیں ہے۔ تم اسے پکڑ کر ڈبے میں بند کر لو یہ آگے بھی ہمارے کام آئے گا۔"

قادر خان نے اندھیرے میں میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے تجربہ کار سپیروں کی چمک نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگا۔

"مجھے کچھ اور ہی شبہ ہے۔ یہاں سے نکل چلو۔ مگر احتیاط سے چلنا تم اناڑی ہو۔ میرے آگے آگے چلو۔"

ہمارا رخ ہمارے نہر والے کاٹج کی طرف تھا۔ رات کا اندھیرا جنگل میں پھیلا ہوا تھا۔ ہم ایک ایسے راستے سے جا رہے تھے جو ذرا کھلا کھلا راستہ تھا اور ادھر درخت بھی زیادہ نہیں تھے۔ ہم نہر کے کنارے نکل آئے۔ رات کے سناٹے میں نہر خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ یہاں سے ہمارا کاٹج چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔

چلتے چلتے قادر خان رک گیا۔ میں اس سے دو قدم آگے تھا۔ کہنے لگا۔

"حیدر علی! محتاط رہنا۔ مجھے لگتا ہے کہ سانپ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔"

میں ڈر گیا کم بخت یہ سانپ ہمارا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟ میں قادر خان کے قریب آ گیا۔ میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے سانپ نہر پر آیا ہو۔ تم نے کہا تھا ناں کہ اتنے آدمیوں کو ڈسنے کے بعد سانپ کے اندر گرمی اور خشکی بڑھ جاتی ہے اور وہ پانی کی تلاش

میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔"

قادر خان اندھیرے میں ادھر ادھر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میرے بازو کو پکڑ کر کاٹج کی طرف کھینچا اور کہا۔

"یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ آ جاؤ۔"

کاٹج والی کوٹھڑی کھول کر ہم اندر گئے۔ قادر خان نے جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ لالٹین جلائی اس کی روشنی میں فرش کے چاروں کونوں کو دیکھا پھر وہ تھیلا چارپائی پر رکھ دیا جس میں سات لڑکیوں اور ساوتری کی انگیاں تھیں اور سانپ کا خالی ڈبہ تھا۔ اس نے خالی ڈبہ نکال کر باہر رکھ لیا کہنے لگا۔

"سانپ کو میں صبح پکڑنے کی کوشش کروں گا۔ اس کا ہمارے پیچھے لگے رہنا میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

ہم نے اپنے سادھوؤں والے کپڑے اتار کر دوسرے عام کپڑے پہن لیے تھے۔ اپنی پستولیں اور کمانڈو چاقو کپڑے میں لپیٹ کر چارپائی کے نیچے رکھ دیے تھے۔ قادر خان کے چہرے پر تشویش کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ ماہر سپیرا تھا۔ اسے کوئی چیز' کوئی خیال پریشان کر رہا تھا۔

کہنے لگا۔ "سانپ کو ہمارا تعاقب نہیں کرنا چاہیے حیدر علی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ باہر سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ قادر خان چونک پڑا۔ "وہ یہاں بھی آ گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بھائی یہ اس کا اڈہ ہے۔ وہ اپنے ڈبے کی پٹاری میں واپس جانا چاہتا ہے۔"

قادر خان کسی ماہر سپیرے کی طرح بولا۔

"نہیں حیدر علی! تم نہیں جانتے مجھے اس میں کوئی اور ہی بات نظر آ رہی.

ہے۔ چارپائی پر سے پرانی چادر اٹھا کر لے آؤ۔"

میں نے پرانی چادر اٹھائی اور کوٹھڑی کے دروازے میں جہاں جہاں درزیں تھیں ان کو چادر سے بند کر دیا۔

"میں سانپ کو صبح تک باہر ہی رکھنا چاہتا ہوں۔"

کوٹھڑی کی کھڑکی میں بھی کچھ درزیں تھیں۔ قادر خان کہنے لگا۔

"تھیلا ادھر لاؤ۔ ہم ان درزوں میں لڑکیوں کی انگیاں پھنسا کر انہیں بھی بند کر دیتے ہیں۔"

تھیلا کھول کر قادر خان نے اس کے اندر جتنی انگیاں تھیں ساری باہر نکال لیں۔ تھیلے کی تہہ میں کھدر، کوئی کپڑا دیکھ کر قادر خان بولا۔

یہ کھدر کی انگیا کس کی ہے؟"

میں نے کھدر کا کپڑا باہر نکالا تو وہ میری ایک پرانی بش شرٹ تھی۔

میں نے کہا۔ "یہ تو میری پرانی بش شرٹ ہے۔"

یہ اسی تھیلے میں کہاں سے آ گئی؟"

قادر خان نے اپنا سر پکڑ لیا۔ بولا۔

"اب سمجھ میں آیا کہ سانپ اس کوٹھڑی کے گرد چکر کیوں لگا رہا ہے اور ہمارا پیچھا کیوں کر رہا ہے۔ اس نے لڑکیوں کی انگیوں کے ساتھ تمہاری قمیض کی بو بھی سونگھ لی ہے۔ اب وہ تمہیں ڈسنے کی فکر میں ہے۔"

میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس موذی اور خطرناک سانپ کی ہلاکت خیزی سے واقف تھا۔ میں قادر خان کا منہ تکنے لگا۔ میں نے کہا۔

"ہمیں اس سانپ کو مار ڈالنا چاہیے یہ تو مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔"

قادر خان کو بھی تشویش لگ گئی تھی۔ کہنے لگا۔

"بالشت بھر کے سانپ کو مارنا اتنا آسان نہیں ہے اور پھر یہ انتہائی چالاک سانپ بھی ہے۔ خطرہ محسوس ہو تو پلک جھپکنے میں جہاں چاہے چھپ جاتا ہے۔

اسے زمین جگہ دے دیتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں اس سانپ سے نہیں بچ سکتا۔"

قادر خان اٹھ کر کھڑکی اور دروازے کی جو درزیں باقی رہ گئی تھیں ان میں لڑکیوں کی انگیاں ٹھونسنے لگا۔

"تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہ سانپ عیار اور موذی ہے تو میں نے بھی زندگی کے پانچ سات سال بنگالی سپیروں کے ساتھ یونہی نہیں گزارے۔ میرے پاس اس کا ایک توڑ ہے۔"

کسی حد تک مجھے تسلی ہوئی اور ذرا خوف کم ہوا۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"قادر بھائی! ہماری زندگیاں اس لیے بڑی قیمتی ہیں کہ ہمارا مشن بڑا قیمتی ہے۔ یہ بڑا المیہ ہوگا کہ ایک بالشت بھر کا سانپ مجھے ڈس کر میری زندگی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دے۔ میں تو صبح ہوتے ہی اس کی تلاش میں نکل جاؤں گا اور اسے ڈھونڈھ کر ہلاک کر دوں گا۔"

قادر خان بولا۔

"میں تمہیں اس کوٹھڑی سے باہر نکلنے کی اس وقت تک اجازت نہیں دوں گا جب تک کہ میں اس مصیبت کا حل تلاش نہیں کر لیتا۔ تم سانپوں کی اور خاص طور پر اس سانپ کی نفسیات اور طاقت سے واقف نہیں ہو تم اسے آگے تلاش کر رہے ہوگے اور یہ پیچھے سے آ کر تم پر حملہ کر دے گا۔ اس کی ساتویں بلکہ آٹھویں حس بھی ہے جو نہ صرف اسے ایک میل سے دشمن دکھا دیتی ہے بلکہ یہ ایک میل کے دائرے کے اندر اندر یہ اپنے دشمن کی معمولی سے معمولی آہٹ کو بھی پہچان کر روپوش ہو جاتا ہے۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاس اس کا ایک توڑ موجود ہے۔ وہ کیا

ہے؟"

میرے سوال پر قادر خان کہنے لگا۔

"جنگل میں ایک بوٹی ہوتی ہے۔ میں اس بوٹی کو پہچانتا ہوں۔ یہ بوٹی بھارت کے سبھی جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے اتر پردیش کے اس جنگل میں بھی ضرور ہوگی۔ میں صبح جنگل میں جا کر اسے تلاش کروں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ بوٹی کیا کرے گی۔"

قادر خان نے کہا۔

"اس بوٹی کے دو تین پتے چبا کر کھاؤ گے تو تمہارے بدن سے تمہاری اپنی بو کے ساتھ ساتھ اس بوٹی کی بو بھی خارج ہونی شروع ہو جائے گی۔ تمہارے بدن کی بو سانپ کو تمہاری طرف لائے گی مگر اس بوٹی کی بو سانپ کو تمہارے قریب نہیں آنے دے گی۔ اس کے سوا اس موذی سانپ سے بچنے کی اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا کہ اس بوٹی کا اثر میرے جسم پر کتنی دیر تک رہے گا۔ قادر خان نے کہا۔

"زیادہ سے زیادہ تین دن تک بوٹی کی خاص بو تمہارے بدن سے خارج ہوتی رہے گی۔ چوتھے دن تمہیں دوبارہ بوٹی کے پتے چبا کر نگلنے پڑیں گے۔

"میں نے کہا۔ "یہ تو میرے واسطے ایک مصیبت ہوگی۔ بوٹی کے آخر کتنے پتے میں اپنے پاس رکھ سکوں گا؟ ایک دن بوٹی ختم ہو جائے گی اور میں جنگل میں اس کو تلاش بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں جان کی بازی لگا کر سانپ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کی کوشش کروں۔"

قادر خان بولا۔

"کیوں نہیں۔ بوٹی کے پتے کھانے کے بعد تم سانپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کر سکتے ہو لیکن اس کے باوجود یہ بڑا خطرناک کھیل ہوگا۔ ایک تو یہ

مشکل ہوگی کہ سانپ تم سے دور دور رہے گا۔ تم اس کے قریب جاؤ گے اور کسی جگہ پر اسے گھیر بھی لوگے تو وہ گھبرا کر تم پر وار کر دے گا۔ اگرچہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا مگر میں بھی وہاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ سانپ تمہیں اپنا دشمن سمجھنے لگا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تم بھی ان عورتوں میں شامل ہو جنھوں نے اسے تین دن تک بھوکا پیاسا ڈبے میں بند رکھا تھا۔"

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ قادر خان سورج نکلنے کے بعد جنگل میں جا کر بوٹی تلاش کر کے لائے گا جس کے پتے چبا کر میں نگل لوں گا اور یوں تین دن کے لیے موذی سانپ سے محفوظ ہو جاؤں گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ رات ہم نے کسی طرح کچھ سو کر کچھ جاگ کر گزار دی۔ ہمیں یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ ٹریننگ کیمپ میں پیشہ ور لڑکیوں اور یہودی انسٹرکٹر کی موت اور ان کے گلے میں جو ہم نے دوسری طوائفوں کو خبردار کرنے کے لیے رقعہ لکھ کر لٹکایا تھا۔ اس کی خبر پریس میں چھپی ہے یا نہیں۔ جہاں ہم رہ رہے تھے وہاں کسی اخبار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر موذی سانپ کی نئی مصیبت کھڑی نہ ہو جاتی تو قادر خان نے اخبار لینے مراد آباد جانا تھا۔ مگر اب وہ دن نکلتے ہی بوٹی کی تلاش میں چلا گیا۔ ساری رات کوٹھڑی کے اردگرد سانپ کی پھنکار کی آوازیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد آتی رہی تھیں۔

قادر خان کے جانے کے بعد میں نے کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے ساری درزوں کو ان میں کپڑا ٹھونس کر بند کر دیا تھا۔ قادر خان نے جنگل میں بڑی دیر لگا دی وہ کوئی دو گھنٹے کے بعد واپس آیا۔ اس دوران مجھے باہر سے کسی کسی وقت سانپ کی پھنکار کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ یہ پھنکاریں بڑی غصیلی تھیں۔ قادر خان کے ہاتھ میں جھاڑی کا مٹھا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم خوش قسمت ہو حیدر علی! مجھے بوٹی کے واسطے جنگل میں زیادہ دربدری نہیں کرنی پڑی۔"

ہم نے دروازہ اور کھڑکی بند کر رکھی تھی۔ صرف سانپ کے ڈر کی وجہ سے لالٹین جلا دی تھی۔ قادر خان نے بوٹی کی جھاڑی میں سے پتے الگ کرنے شروع کر دیے۔ کہنے لگا۔

"میں اسے نہر میں اچھی طرح سے دھو کر لایا ہوں۔"

کافی پتے نکل آئے تھے۔ اس نے چھ سات پتے مجھے دے کر کہا۔

"بسم اللہ کر کے انہیں چبا کر نگل جاؤ۔ باقی میں پوٹلی میں باندھ کر رکھ لیتا ہوں۔"

یہ پتے نیم کے پتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور کنگریوں والے تھے۔ میں نے ایک پتہ منہ میں ڈال کر چبایا تو اس کا ذائقہ ہلکا کڑوا تھا۔ قادر خان بولا۔

"اس کے ذائقے پر نہ جانا۔ بس چھ سات پتے چبا کر نگل جاؤ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تین دن تک یہ سانپ تمہارے قریب نہیں آئے گا۔ تم ابھی

اس کی تاثیر دیکھو گے باہر جو کسی وقت سانپ کی پھنکار سنائی دے جاتی ہے یہ دور بہت دور چلی جائے گی۔"

میں چھ سات پتے منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ پھر انہیں نگل لیا۔ میرا منہ کڑوا ہوگیا۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"بھائی تھوڑا پانی پی لوں۔"

قادر خان نے مجھے پانی پینے سے منع کر دیا۔ کہنے لگا۔

"ابھی تمہارا ذائقہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ایسے ہی ہوا۔ پتے کھانے کے کوئی ایک منٹ بعد میرے منہ کا ذائقہ میٹھا میٹھا سا ہوگیا۔ قادر خان نے بڑے اعتماد کے ساتھ اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ کپڑے جو درزوں میں ٹھونس رکھے تھے وہ بھی باہر نکال دیے۔ کہنے لگا۔

"بالکل فکر نہ کرو۔ تمہارے جسم سے بوٹی کی بو خارج ہونا شروع ہوگئی ہے۔ سانپ یہاں سے دور چلا گیا ہے۔"

اس کا کہنا واقعی درست ثابت ہوا۔ پہلے جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد سانپ کے پھنکارنے کی آواز آ جاتی تھی اب بالکل بند ہوگئی۔ بوٹی جس پوٹلی میں بند تھی قادر خان نے اسے تھیلے میں ڈال کر تھیلا دیوار کے ساتھ لٹکا دیا اور کہنے لگا۔

"اب بے شک تم میرے ساتھ مراد آباد چلو ہو سکتا ہے آج کے اخباروں میں ٹریننگ کیمپ والے واقعے کی خبر چھپ گئی ہو۔"

ہم نے کوٹھڑی کو تالا لگایا اور مراد آباد کی طرف روانہ ہوگئے۔ میں جنگل میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ مگر سانپ کی پھنکار بالکل غائب ہو چکی تھی۔ قادر خان واقعی بڑا زبردست سپیرا تھا۔ ہم مراد آباد پہنچنے کے بعد سیدھا نواب صاحب کے ہاں گئے۔ نواب صاحب نے ہم سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

قادر خان بولا۔ "نواب صاحب پہلے ناشتہ کرائیے۔ بڑی بھوک لگی ہے۔ پھر باتیں ہوں گی۔"

نواب صاحب مسکرانے لگے۔ انہوں نے ہمارے کھلے ہوئے چہروں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمارا مشن کامیاب رہا ہے۔ ناشتے پر ہم نے بلکہ قادر خان نے نواب صاحب کو سارا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا نواب صاحب بولے۔

"آج کے اخبار میں تو ایسی کوئی خبر نہیں چھپی۔ ہو سکتا ہے کل کے اخبار میں چھپ جائے۔ تم لوگوں نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ برائی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔"

ہم نے نواب صاحب کو موذی سانپ کے میرے پیچھے لگ جانے اور جڑی بوٹی کے پتے کھا کر تین دن کے واسطے سانپ سے محفوظ ہو جانے کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم نے وہ دن اور رات نواب صاحب کے مکان پر ہی گزاری۔ اس دوران ہم باقاعدگی سے ریڈیو اور بھارت کے ٹیلی ویژن پر خبروں کے بلٹن سنتے رہے۔ ٹریننگ کیمپ والے واقعے کی کوئی خبر نشر نہیں کی گئی تھی۔ نواب صاحب کہنے لگے۔

"حکومت نے جان بوجھ کر اس خبر کو دبا دیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ پریس میں بھی یہ خبر نہ آئے۔"

دوسرے دن نواب صاحب نے اپنے ملازم کو بھیج کر ہندی انگریزی اور اردو کے تقریباً" سارے اخبار منگوا لیے۔ حیرت کی بات ہے کہ کسی اخبار میں بھی یہ خبر نہیں چھپی تھی۔ اس سے پہلے جب ہم نے بمبئی والے ٹریننگ کیمپ میں واردات کی تھی تو اس کی خبر تقریباً" سبھی اخباروں میں چھپی تھی۔ اس بار بھارتی حکومت نے اس خبر کو دبا دیا تھا اور چھپنے یا نشر ہونے نہیں دیا تھا۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے بیٹھے تو نواب صاحب بھی آ گئے۔ کہنے لگے۔

"یہ خبر اخباروں میں تو نہیں آئی۔ دوردرشن پر بھی اسے نشر نہیں کیا گیا

لیکن مراد آباد شہر میں لوگ دبی زبان میں اس واقعے پر تبصرے کر رہے ہیں اور حیرانی سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ ایک دم سے دس بارہ آدمیوں کو کس نے قتل کر ڈالا۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ ڈاکوؤں کا کام ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ کشمیری کمانڈوز کی کارروائی تھی اور تم لوگوں نے جو لاشوں کی گردنوں میں اس مضمون کے کاغذ لٹکا دیے تھے کہ آئندہ اگر کسی عورت کو جاسوسی اور تخریب کاری کے لیے پاکستان بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا تو اسکا انجام بھی یہی ہوگا۔ عام لوگوں کا یہی خیال ہے کہ یہ کارروائی کشمیری کمانڈوز نے کی ہے۔"

ہمارا مشن کامیاب رہا تھا۔ ہمارا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ ہم بھارتی سرکار کی پاکستان دشمن ایجنسی کو خبردار کرنا چاہتے تھے کہ اگر ان کی طرف سے آئندہ اس قسم کا کوئی ناپاک منصوبہ بنایا گیا تو اس کا حشر بھی یہی ہوگا اور یہ انتباہ حکومت تک پہنچ گیا تھا۔ ہم یہی چاہتے تھے۔ اب ہمارا وہاں پر کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے نواب صاحب سے کہا کہ ہمارا مشن مکمل ہوگیا ہے اب ہم واپس جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بخوشی اجازت دے دی۔ دن کے وقت ہم مراد آباد سے ان کے نہر کنارے والے کاٹج میں گئے۔ وہاں سے وہ تھیلا اٹھایا جس میں ہمارے پستول دو چاقو اور سانپ سے محفوظ رکھنے والی بوٹی کے پتے تھے اور واپس مراد آباد جانے کی بجائے سنبل کے سٹیشن سے برانچ لائن والی ایک ٹرین میں سوار ہو کر علی گڑھ آ گئے۔ وہاں سے مین لائن شروع ہو جاتی تھی اور جی آئی پی سیکشن کی گاڑیاں آگرہ، گوالیار، جھانسی اور بھوپال سے ہوتی ہوئی بمبئی کو جاتی تھیں۔

میں دنوں کا حساب برابر رکھ رہا تھا۔ مجھے سانپ کے تریاق کی بوٹی کے پتے کھائے دو دن گزر گئے تھے۔ اگرچہ قادر خان نے مجھے یہ کہہ کر مطمئن کرنا چاہا کہ ہم ٹرین میں سفر کر رہے ہیں سانپ مجھ سے دور دور رہ کر میرے جسم کی بو

پر تعاقب کرتا بہت پیچھے رہ گیا ہوگا اور وہ ہمارے بمبئی کے جنگل والی حویلی میں پہنچنے کے دس بارہ دن بعد وہاں پہنچے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں سانپ سے ڈرا ہوا تھا۔ میں پتھر کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ ہمیں بمبئی پہنچتے پہنچتے مزید دو دن لگ گئے۔ میں نے تین دن گزرنے کے بعد چوتھے دن ٹرین میں سفر کرتے ہوئے تریاق بوٹی کے چھ پتے تھیلے میں سے نکال کر چبا کر نگل لیے۔

قادر خان مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ویسے اچھا کرتے ہو کہ احتیاط سے کام لیتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "بھائی میں یہ مصیبت زیادہ دیر تک اپنے اوپر مسلط نہیں کر سکتا۔ بمبئی والی حویلی میں پہنچنے کے بعد میں اس سانپ کو یقینی طور پر ہلاک کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد ہی میں سکون کے ساتھ اپنا کوئی اگلا مشن شروع کر سکوں گا۔"

قادر خان نے کوئی جواب نہ دیا اور سگریٹ پیتے ہوئے ڈبے کی کھڑکی میں سے ریل کے باہر کا منظر دیکھتا رہا۔

بمبئی کے قرب و جوار کے جنگل میں قادر خان اور وزیر علی بھائی کی جو خفیہ حویلی تھی وہاں پہنچے تو وزیر علی نے کہا۔

"سمبل والے ٹریننگ کیمپ کی دہشتناک خبر بمبئی تک پہنچ گئی ہے۔ تم لوگوں نے بہت بڑا معرکہ مارا ہے۔ مجھے اس کی تفصیل سناؤ۔"

ہم نے اسے سارے واقعات سنائے اور قادر خان نے اسے یہ بھی بتایا کہ موذی سانپ نے میرے کرتے کو سونگھ کر میرے جسم کی بو پالی ہے اور اب وہ مجھے ڈسنے کے لیے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ بھائی وزیر علی تو پریشان ہوگیا۔ کہنے لگا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ سانپ تو چھلاوہ سانپ ہے۔ کسی کے قابو میں نہیں آئے گا۔ وہ حیدر بھائی پر حملہ ضرور کرے گا۔ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔"

تب قادر خان نے اسے جنگل کی بوٹی کے بارے میں بتایا۔ وزیر علی بڑے غور سے سنتا رہا۔ وہ کچھ مطمئن نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"قادر خان! حیدر علی کی زندگی بڑی قیمتی ہے یہ زندگی اتنی سستی نہیں ہے کہ ایک بالشت بھر کا سانپ جھاڑیوں میں سے نکل کر اسے ڈس کر ختم کر دے۔ ہمیں اس سانپ کو ڈھونڈھ کر ہلاک کرنا ہوگا۔ اس مصیبت کا یہی ایک حل ہے۔"

قادر خان بولا۔ "ابھی تو سانپ بہت پیچھے رہ گیا ہوا ہے۔ وہ حیدر علی کی بو پر ضرور آئے گا۔ مگر یہاں تک پہنچتے پہنچتے اسے کچھ نہیں تو دس دن ضرور لگ جائیں گے۔ ہم ریل گاڑی سے یہاں پہنچے ہیں اور سانپ جنگلوں میں سے گزر کر دریاؤں، نہروں، کھڈوں اور نالوں کو پار کرتا ہوا آ رہا ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں"۔ وزیر علی بولا۔ "ہم سانپ کا انتظار کر لیں گے۔ جب تک ہم اس سانپ کا سر نہیں کچل دیتے یہاں سے کہیں آگے نہیں جائیں گے۔"

قادر خان نے وزیر علی سے پوچھا۔

"تم ہمیں پہلے تو یہ بتاؤ کہ ہمارے بعد یہاں کے حالات کیسے رہے؟ کیا بمبئی سے کوئی ایسی خبر تو نہیں ملی کہ بال ٹھاکرے پر یہ راز کھل گیا ہو کہ جس شخص کو اس نے زہر کا ٹیکہ لگا کر زمین میں دفن کیا تھا وہ مرا نہیں زندہ ہے؟"

قادر کا اشارہ میری طرف تھا۔ وزیر علی بولا۔

"قادر بھائی! تم کیسی بچوں والی باتیں کرتے ہو۔ یہ راز کیسے کھل سکتا ہے؟ ہم نے جس قبر میں سے اپنے دوست حیدر علی کو زندہ نکال لیا تھا اس قبر میں ہم نے ایک انسانی ڈھانچہ بھی رکھ دیا تھا۔ بال ٹھاکرے کے آدمیوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ حیدر علی زندہ بچ گیا تھا؟"

"بس میں یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ پتہ نہیں چلا۔"

قادر خان بولا۔ "بھائی! شیوسینا کے جاسوس زمین کے اندر بھی گھومتے پھرتے ہیں۔ ہمیں ان سے پوری طرح ہوشیار رہنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے جموں جا کر کشمیری کمانڈو شیر باز سے ملنا چاہیے۔ کشمیر میں حریت پسند زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں انہیں میری ضرورت ہے۔"

وزیر علی اور قادر خان سوچ میں پڑ گئے۔ وزیر علی کہنے لگا۔

"حیدر علی! ہم تمہیں جہاد پر جانے سے نہیں روک سکتے لیکن میں چاہتا ہوں کہ جب تک ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اس موذی سانپ کو ہلاک نہیں کر لیتے جو تیری جان کا دشمن بن گیا ہے تمہیں یہاں ہمارے پاس ہی رہنا چاہیے۔"

اس خیال کی قادر خان نے بھی تائید کی اور کہا۔

"وزیر علی ٹھیک کہتا ہے حیدر! کشمیر کے محاذ پر تم دشمن سے جنگ کر رہے ہو گے۔ تمہیں کہاں اتنی فرصت ملے گی کہ تین دن کے بعد تمہیں بوٹی کے پتے کھانے ہیں تاکہ سانپ تم سے دور رہے اور سانپ تو تمہارا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک تمہیں ڈس نہیں لیتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم ابھی اسی حویلی میں ہمارے ساتھ رہو۔ میں اور وزیر علی سب سے پہلا کام یہی کریں گے کہ تمہارے دشمن سانپ کو مار ڈالیں۔"

یہ تجویز میرے بھی دل کو لگی۔ دراصل میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اس مصیبت سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے اب ہمارا مشترکہ مشن اس سانپ کو ہلاک کرنا ہے۔"

"اور انشاء اللہ ہم اسے ہلاک کر کے چھوڑیں گے۔"

وزیر علی نے جوش میں آ کر کہا۔ قادر خان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی الجھن میں مبتلا ہے۔ جب وزیر علی نے اس سے اس کی الجھن کی وجہ دریافت کرنا چاہی تو وہ سر کو جھٹک کر بولا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

بعد میں قادر خان نے بتایا کہ اسے یقین تھا کہ ہم سانپ کو اتنی آسانی کے ساتھ ہلاک نہیں کر سکیں گے۔ وہ اسی لیے اندر سے پریشان تھا۔ مجھے سانپ کے تریاق کی بوٹی پیئے ہوئے پورے تین دن گزر گئے اور میرے جسم سے میرے بدن کی بو کے ساتھ جنگلی بوٹی کی خاص بو خارج ہونا بند ہوگئی تو وزیر علی اور قادر خان نے مجھے حویلی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ وہ خود کوٹھڑی کے باہر جھاڑیوں میں مورچہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ہمیں مراد آباد سے یہاں آئے سات آٹھ دن گزر گئے تھے۔ قادر خان کا خیال تھا کہ سانپ اتنی دیر میں ہمارے آس پاس کے جنگلوں میں پہنچ چکا ہوگا۔

پہلے دو تین دن تو میں دن کے وقت کوٹھڑی سے باہر نکل آتا تھا لیکن اس کے بعد مجھے دن کے وقت بھی کوٹھڑی سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ کوٹھڑی کی کھڑکی اور روشندان لکڑی کے تختے لگا کر بند کر دیے گئے تھے۔ صرف دروازہ دن کے وقت کھلا رہتا تھا جس کے آگے ایک جانب قادر بھائی اور دوسری جانب وزیر علی کارتوس سے بھری ہوئی بندوقیں لیے بیٹھے ہوتے۔ میں دروازے کے درمیان چارپائی پر لیٹا یا بیٹھا رہتا تاکہ میرے جسم کی بو تیزی سے سانپ تک پہنچ جائے۔ رات کے وقت دروازے کو بند کر کے میں اس کی درزوں میں کپڑے کی دھجیاں پھنسا کر انہیں بند کر دیتا تھا۔ دروازے کے آگے رات کو دو بڑے لیمپ روشن کر دیے جاتے۔ شام کے اندھیرا ہو جانے سے لے کر رات کے بارہ بجے تک قادر خان بندوق اور لوہے کی سلاخ پاس رکھ کر پہرہ دیتا۔ اس کے بعد وزیر علی آ جاتا۔ قادر خان سو جاتا اور وزیر علی میرے پہرے پر آن موجود ہوتا اور سورج نکلنے تک چل پھر کر پہرہ دیتا اور سانپ کو ادھر ادھر دیکھتا رہتا کہ کہیں کسی طرف سے نکل نہ آئے۔

مزید تین دن گزر گئے۔ سانپ نہ آیا۔ چوتھی رات کو میں کوٹھڑی میں

جاگ رہا تھا اور باہر وزیر علی پہرہ دے رہا تھا۔ رات کے تین بجے ہوں گے کہ مجھے سانپ کے پھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وزیر علی نے بھی سانپ کی پھنکار سن لی تھی۔ باہر سے اس نے مجھے آواز دی۔

"حیدر علی! جاگ رہے ہو؟ میں نے سانپ کی پھنکار سنی ہے۔ وہ آگیا ہے۔"

"میں نے کہا۔ "ہاں میں نے بھی آواز سنی ہے۔ ہوشیار رہنا۔ سانپ بچ کر نہ جائے۔"

"فکر نہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "تم اپنا بھی خیال رکھنا۔ یہ کہیں تم پر بھی حملہ نہ کردے۔"
وزیر علی نے جواب دیا۔

"میں اسے اتنی مہلت نہیں دوں گا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ جیسے ہی وہ تمہاری کوٹھڑی کی طرف بڑھا میں اسے وہیں ختم کردوں گا۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ سانپ کی پھنکار سنائی نہ دی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد پھنکار بڑی قریب سے سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی بندوق کے فائر کا دھماکہ ہوا۔ وزیر علی نے اونچی آواز میں کہا۔

"مار ڈالا' مار ڈالا۔"

فائر کے دھماکے کی آواز سن کر قادر خان بھی باہر آگیا تھا۔ اس نے وزیر علی سے پوچھا۔ کیا ہوا؟ وزیر علی بولا۔

"سانپ کوٹھڑی کی طرف آرہا تھا میں نے اس پر فائر کردیا۔ وہ ضرور مر گیا ہوگا۔ میں نے اندر سے کہا۔

"میں باہر آرہا ہوں۔"

قادر خان کی غصے والی آواز بلند ہوئی۔

"حیدر علی! خبردار باہر مت نکلنا۔"

میں کوٹھڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ وزیر علی اور قادر خان کی آوازیں کبھی قریب سے آئیں اور کبھی کچھ دور چلی جاتیں۔ شاید وہ سانپ کی لاش کو تلاش کر رہے تھے۔ دونوں سانپ کی لاش کو تلاش کرتے ہوئے واپس کوٹھڑی کے پاس آ گئے۔ وزیر علی نے کہا۔ "میں نے سانپ کو دیکھ کر نشانہ لگایا تھا۔"

قادر خان بولا۔

"اگر نشانہ ٹھیک لگا تھا تو پھر سانپ کی لاش کے ٹکڑے یہیں ہونے چاہیں تھے مگر یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ سانپ بچ کر نکل گیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد دن کا اجالا پھیلنے لگا تو قادر خان نے میری کوٹھڑی کے بند دروازے کو کھٹکھٹا کر کہا۔

"حیدر بھائی! باہر آ جاؤ۔"

میں پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باہر بھی ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ مجھے چارپائی پر بٹھا دیا گیا معلوم ہوا کہ سانپ کی لاش کے ٹکڑے کہیں نہیں ملے اور سانپ بچ کر نکل گیا ہے۔ وزیر علی نہیں مان رہا تھا۔ چاند بائی نے ہمیں وہیں ناشتہ لا کر دیا۔ ہم تینوں چارپائی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ اس دوران ہم تھوڑی دیر کے بعد گردن پھیر کر چارپائی کے چاروں طرف اور نیچے جھانک کر دیکھ لیتے تھے کہ کہیں سانپ آ تو نہیں گیا۔ قادر خان مجھے کسی گہری سوچ میں لگتا تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا ہم سانپ کو ہلاک کر سکیں گے یا نہیں؟ تو اس نے پیالی میں چینک سے چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"مثلاً" تم کیا سوچ رہے ہو؟" وزیر علی نے پوچھا۔

قادر خان کہنے لگا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے سانپ کو مارنے کا پورا پورا بندوبست کر رکھا تھا مگر وہ بچ بھی سکتا ہے جیسے آج رات بچ کر نکل گیا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہم میں سے کسی کو غافل پا کر یا اپنے اوپر حملہ ہوتے دیکھ کر حیدر علی پر حملہ کر دے اور اسے ڈس لے۔ اسے تو حیدر بھائی کے جسم کے ساتھ صرف منہ ہی لگانا ہوگا اور اس کا سارا زہر حیدر بھائی کے خون میں شامل ہو کر اسے پتھر کر دے گا۔"

میں اور وزیر علی کچھ نہ بولے۔ قادر خان نے کہا۔

"ہمیں اس کا بھی کچھ بندوبست پہلے سے کر رکھنا چاہیے کہ اگر خدانخواستہ سانپ حیدر بھائی کو ڈس لیتا ہے تو اسے کس طرح بچایا جا سکتا ہے؟

میں نے کہا۔ "اس طرف تو میرا خیال بھی نہیں گیا تھا۔ کیونکہ تم نے خود ہی ہمیں بتایا تھا کہ اس سانپ کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہے۔"

قادر خان بولا۔

"دنیا میں کوئی سانپ ایسا نہیں ہے جس کے کاٹے کا علاج قدرت نے پیدا نہ کیا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ سانپ ڈسنے کے بعد آدمی کو اتنی مہلت ہی نہ دے کہ وہ اپنا علاج کر سکے۔"

وزیر علی نے کہا۔ "تو تمہارے دماغ میں اس موذی سانپ کے کاٹے کا کیا علاج ہے؟"

قادر خان نے سگریٹ لگا لیا تھا۔ سگریٹ پیتے ہوئے اس نے آنکھیں سکیڑ لیں اور آہستہ آہستہ بولا۔

"قدرت نے ہر زہر کا [illegible]ق پیدا کر رکھا ہے۔ جو بچھو آدمی کو کاٹ کر مار ڈالتا ہے یا موت کے قریب پہنچا دیتا ہے اس کے زہر کا توڑ اسی بچھو کے جسم میں موجود ہے۔ اگر آدمی اسی بچھو کو مار کر اس کو جلا دے اور اس کی راکھ اس جگہ لگا دے جہاں بچھو نے کاٹا تھا تو زہر کا اثر ختم ہو جائے گا۔ سوچنے کی بات ہے کہ

سانپ اس قدر مہلک زہر اپنے منہ میں رکھتا ہے کہ اگر آدمی کے جسم میں ذرا سا داخل ہو جائے تو آدمی مر کر پتھر کا ہو جاتا ہے مگر خود اس سانپ کو زہر کچھ نہیں کہتا۔ سانپ پھر نہیں مرتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ سانپ کے اندر اس زہر کا تریاق ضرور موجود ہو گا۔"

وزیر علی نے کہا۔ "کہتے تو تم بالکل ٹھیک ہو۔ مگر سانپ کے منہ میں زہر کہاں ٹھہر سکتا ہے۔"

قادر خان کہنے لگا۔

"سانپ کے تالو کے ساتھ ایک نرم جھلی کی تھیلی بنی ہوتی ہے۔ سانپ کا زہر اس تھیلی میں ہوتا ہے۔ اس تھیلی کو قدرت نے اس قدر طاقتور بنایا ہے کہ زہریلے سے زہریلے سانپ کے زہر کا اثر اس تھیلی پر نہیں ہوتا۔ جو زہر انسان کے خون میں داخل ہو کر اس کے جسم کو موم کی طرح پگھلا دیتا ہے وہی زہر سانپ کے منہ کی تھیلی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

وزیر علی نے کہا۔

"لیکن ہمارے دوست حیدر بھائی کے پاس تو ایسی کوئی تھیلی نہیں ہے۔ اس کو سانپ کے زہر سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ سوچنے کی تو یہ بات ہے۔"

قادر خان غور و فکر کرنے کے انداز میں بولا۔

"جنگل میں اور خاص طور پر بمبئی اور مدھیہ پردیش کے جنگلوں یں ہر قسم کے زہریلے سانپ پائے جاتے ہیں اور سینکڑوں' آدمی ان سانپوں کے ڈسنے سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بہت کم سپیروں کو یہ راز معلوم ہے کہ ان جنگلوں میں ہی قدرت نے ایک ایسی جڑی بوٹی بھی اگائی ہوئی ہے جس پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کھلتے ہیں۔ ان پھولوں کی شکل سانپ کی شکل جیسی ہوتی ہے۔ یہ پھول اس بوٹی کو بارہ مہینے لگتے ہیں۔ اگر ان پھولوں کو کوٹ کر اس کا سفوف آدمی کو کھلا دیا جائے تو اس پر زہریلے سے زہریلے سانپ کے زہر کا بھی اثر نہیں

ہوتا۔"

وزیر علی خوش ہو کر بولا۔

"قادر بھائی! تم نے تو سارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ آج ہی جنگل میں جا کر یہ پھول لے آتے ہیں اور حیدر بھائی کو ان کا سفوف کھلا دیتے ہیں۔ ساری مشکل حل ہو جائے گی۔"

قادر خان کہنے لگا۔

"مشکل یہ ہے کہ یہ بوٹی آسانی سے نہیں ملتی۔ اس کو تلاش کرنا بڑا جان جوکھوں کا کام ہے لیکن میں نے اسے تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ حیدر بھائی کی مصیبت کا یہی ایک حل ہے۔"

میں نے اپنی تسلی کے لیے اس سے پوچھا۔

"کیا یہ بوٹی ہمارے آس پاس کے جنگل میں مل جائے گی؟"

قادر خان کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر تلاش کی جائے تو ضرور مل جائے گی۔ بنگال کے سندر بن والے جنگل میں تو یہ بوٹی عام مل جاتی ہے۔ پہلے میں یہاں دیکھتا ہوں۔ اگر یہاں نہ ملی تو میں سندر بن جا کر اسے لے آؤں گا۔ تم لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ سانپ کے کاٹے سے کبھی کوئی سپیرا نہیں مرتا۔ اس لیے نہیں مرتا کہ اس کے پاس سانپ کا منکا ہوتا ہے۔ نہیں۔ منکا محض لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے سپیرے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر سپیرے نے قرنگ پھنی بوٹی کا سفوف پی رکھا ہوتا ہے اور ساری زندگی کے لیے وہ سانپ کے زہر سے محفوظ ہوگیا ہوتا ہے۔ اس بوٹی کو سپیرے اپنی زبان میں قرنگ پھنی کہتے ہیں۔"

اب قادر خان نے اس پرانی حویلی کے اردگرد کے جنگل میں قرنگ پھنی بوٹی کی تلاش شروع کر دی تھی۔ وہ دن کے وقت نکل جاتا اور سورج غروب ہونے کے بعد واپس آ جاتا۔ اس دوران ہم لوگ چوکس اور پوری طرح ہوشیار

ہو کر بیٹھے رہتے۔ میں کوٹھڑی کے دروازے میں چارپائی پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھا رہتا اور وزیر علی بھری ہوئی بندوق لیے کوٹھڑی کے باہر چارپائی پر بیٹھا پہرہ دیتا۔

اس طرح تین دن گزر گئے۔ اس دوران رات کے وقت ہم نے سانپ کی پھنکار کی آواز بھی سنی۔ یہ آواز سن کر ہمیں یقین ہو گیا کہ سانپ ابھی زندہ ہے اور میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ہم زیادہ چوکس ہو گئے۔ چوتھے روز قادر خان نے فرنگ چھنی کی بوٹی جنگل میں ڈھونڈ نکالی۔ بوٹی کی پوری جھاڑی وہ اکھیڑ کر لے آیا۔ بوٹی کی شاخوں پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کھلے ہوئے تھے جن کی شکل چھوٹے سانپ کی سری سے ملتی جلتی تھی۔ اس وقت ان پھولوں کو کوٹ کر پیسا گیا۔ پھر ان کا سفوف بنایا گیا۔ آدھا سفوف پانی میں گھول کر قادر خان نے مجھے پلا دیا۔ باقی جو آدھا بچا اسے گھول کر قادر خان اور وزیر علی نے پی لیا۔

وزیر علی سفوف پینے کے بعد بولا۔

"لو بھائی، ساری عمر کے لیے ایک دشمن سانپ سے تو نجات مل گئی۔"

سفوف کا ذائقہ پھیکا پھیکا تھا اور اس میں سے سونف کی طرح کی خوشبو آ رہی تھی۔ جب میں سفوف پی چکا تو قادر خان نے کہا۔

"حیدر بھائی! اب اگر اس سانپ نے تمہیں کاٹ بھی لیا تو اللہ کے فضل سے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے تمہیں کاٹنے سے اس بوٹی کے اثر کی وجہ سے سانپ خود مر جائے یا بے ہوش ہو جائے۔"

میں نے کہا۔

"اب تو مجھے کوٹھڑی کی قید سے بھی نجات مل جانی چاہیے۔ میں یہاں پڑے پڑے پتھر ہو گیا ہوں۔"

قادر خان بولا۔

"نہیں بھائی! جب تک ہم سانپ کو کچل نہیں ڈالتے میں تمہیں یہاں سے

باہر نکلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیونکہ بوٹی آخر بوٹی ہوتی ہے۔ اس کا اثر کم بھی ہو سکتا ہے۔"

اب ہم کچھ بے فکرے ہو کر سانپ کی کھوج میں رہتے۔ کبھی میں چارپائی سے نیچے اتر کر کوٹھڑی کے آگے ٹہلنے لگتا۔ کبھی وزیر علی یا قادر خان بندوق مجھے دے کر حویلی کی دوسری طرف نکل جاتے۔ انہیں اپنی خفیہ کمین گاہ کی پہرے داری بھی کرنی ہوتی تھی۔ کیونکہ مہاراشٹر کی خفیہ پولیس ان کے پیچھے لگی تھی۔ خفیہ پولیس کا مجھے بھی ہر لمحہ خطرہ لگا رہتا تھا۔ کیونکہ میں بھارتی شہری نہیں تھا۔ میں پاکستان سے آیا ہوا تھا اور میرے پاس ضروری کاغذات وغیرہ بھی نہیں تھے سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ میں شیو سینا کے مشہور دہشت گرد دھرم چند کا ہم شکل تھا۔ اگرچہ میں نے اپنی ناک کی ہڈی اوپر کروا لی تھی اور داڑھی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں پھر بھی شیو سینا کا کوئی آدمی مجھے غور سے دیکھے تو دھرم چند کہہ کر بلا سکتا تھا اور یہ بات میرا راز فاش کر سکتی تھی کہ جو پاکستانی کمانڈو دھرم چند کا ہم شکل بن کر شیو سینا میں گھسا ہوا تھا اور جسے بال ٹھاکرے نے اپنے سامنے زہر کا ٹیکہ لگوایا اور زمین میں اس کی لاش کو دفن کیا تھا وہ شخص زندہ ہے۔ چنانچہ مجھے اس طرف سے بھی ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرنگ بھنی کا سفوف پینے کے بعد ہم تینوں موذی سانپ کی طرف سے کچھ غافل ہوگئے تھے۔ دوسری طرف سانپ میری گھات میں لگا ہوا تھا مگر وہ بھی محتاط ہوگیا تھا۔ خدا جانے اس کی چھٹی ساتویں یا آٹھویں حس نے بتا دیا تھا کہ تین آدمی اس کی جان لینے حویلی میں بندوقیں لیے تیار بیٹھے ہیں اور ایک بار تو اس پر فائر بھی کر دیا گیا تھا۔ ایک دن میں ناشتے کے بعد کوٹھڑی کے دروازے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وزیر علی میرے سامنے والی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ قادر خان حویلی کی طرف گیا ہوا تھا کہ اچانک سانپ کی بڑے زور سے پھنکار سنائی دی۔ وزیر علی چارپائی پر سے اچھل پڑا۔ میں چارپائی پر گھبرا کر

کھڑا ہو گیا۔

وزیر علی نے بندوق سیدھی کر لی۔ پھنکار کی آواز پر چارپائی کی پائینتی کی طرف سے آئی تھی۔ زیر علی نے ادھر بغیر دیکھے بھالے فائر کر دیا۔ میں اپنی چارپائی سے چھلانگ لگا کر وزیر علی کی چارپائی پر آ گیا۔ وزیر علی نیچے اتر کر دیکھنے لگا کہ سانپ مر گیا ہے کہ نہیں میں چھلانگ لگانے کے بعد ابھی چارپائی پر سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اچانک کوئی چیز زور سے میری گردن کے ساتھ آ کر لگی اور چمٹ گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے ہاتھ سے جھٹک دیا۔ یہ وہی موذی سانپ تھا میں نے چیخ مار کر کہا۔

"وزیر بھائی! یہ سانپ ہے۔ اس نے مجھے کاٹ لیا ہے۔"

وزیر علی نے پلٹ کر دیکھا۔ بالشت بھر کا سانپ ایک طرف جاتا مجھے بھی نظر آیا۔ وزیر علی نے فائر جھونک دیا۔ میں گردن کو پکڑ کر چارپائی پر گر پڑا۔ یہ خوف اور دہشت کا اثر تھا۔ وزیر علی نے بندوق میں دو کارتوس بھرے اور جدھر اسے سانپ نظر آیا تھا اس طرف اوپر تلے دو فائر کر دیے۔ فائرنگ کی آواز سن کر قادر خان دوڑتا ہوا آ گیا۔

"کیا ہوا' کیا ہوا؟"

وہ چلایا۔ میں چارپائی پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا مگر مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ میرا جسم سانپ کے زہر سے پتھر نہیں ہوا۔ سانپ نے مجھے گردن پر کاٹا تھا۔ وزیر علی اور قادر خان دوڑ کر میری طرف آئے۔ قادر خان نے میری گردن کو غور سے دیکھا۔ میں نے دہشت بھری آواز میں کہا۔

"سانپ نے ڈس لیا ہے۔"

قادر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خدا کا شکر بجا لاؤ۔ سانپ نے تمہیں ڈسا ضرور ہے مگر تم پر اس کے زہر کا اثر نہیں ہوا۔ اگر اثر ہونا ہوتا تو تم یہ کہنے کے لیے زندہ نہ رہتے کہ مجھے

سانپ نے ڈسا ہے۔"

اس نے وزیر علی سے کہا۔

"وزیر علی! قرنگ بوٹی نے اپنا کام دکھا دیا ہے۔ حیدر علی اللہ کے فضل سے زندہ سلامت ہے۔ سانپ کو تم نے مار ڈالا ہے ناں؟"

وزیر علی نے جھاڑیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تین فائر کیے ہیں میں نے وہ زندہ نہیں بچا ہو گا۔"

مجھے چارپائی پر ویسے ہی چھوڑ کر قادر خان اور وزیر علی سانپ کی لاش کے ٹکڑے تلاش کرنے جھاڑیوں کی طرف گئے مگر انہیں کچھ نہ ملا۔ قادر خان مایوس ہو کر بولا۔

"وزیر علی! سانپ ایک بار پھر بچ کر نکل گیا ہے۔ تمہیں نشانے پر فائر کرنے کی مشق کی ضرورت ہے۔"

قادر خان نے میری گردن پر جہاں سانپ نے کاٹا تھا انگلی لگا کر دیکھا اس کی انگلی پر میری گردن سے نکلا ہوا خون کا قطرہ لگا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ کہنے لگا۔

"تمہارے خون پر زہر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ سارا زہر تمہارے جسم میں پھیلے ہوئے تریاقی سفوف نے چوس کر بے اثر کر دیا ہے۔"

اس نے انگلی پر لگے ہوئے خون کو سونگھا۔

"اس میں زہر کی ذرا سی بھی بو نہیں ہے۔ خدا نے تمہیں نئی زندگی دی ہے حیدر بھائی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھ پر صرف سانپ کی دہشت کا تھوڑا سا اثر تھا۔ مجھے اپنے اندر کوئی کمزوری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ قادر خان کہنے لگا۔

"آج کے بعد تمہیں چھوت کی کوئی بیماری نہیں لگ سکے گی۔ سانپ کے زہر نے تمہارے جسم کو ایک نئی توانائی دے دی ہے۔"

وزیر علی بولا۔ "لیکن سانپ بچ کر نکل گیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تھوڑی دیر میں اس کی تلاش میں جاتا ہوں۔"

قادر خان بولا۔

"اب سانپ کو ہلاک کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔"

"کیوں؟ وہ حیدر بھائی کو دوبارہ آکر کاٹ سکتا ہے۔ کیا جانے تریاقی سفوف کا اثر دو تین دن بعد کمزور پڑ جائے۔"

قادر خان کسی تجربہ کار گورو سپیرے کے انداز میں بولا۔

"وزیر بھائی! اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہر انسان کو سانپوں کا تھوڑا بہت علم ضرور ہونا چاہیے۔"

پھر قادر خان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"حیدر بھائی اب میں تمہیں ایک ایسی بات بتانے لگا ہوں جس پر تمہیں مشکل ہی سے یقین آئے گا۔ سنو چونکہ تم اس موذی سانپ کے کاٹے سے مرے نہیں اس لیے یہ سانپ تمہیں مہاناگ کا انسانی روپ سمجھنے لگا ہے۔"

میں نے کہا۔

"سانپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں مرا نہیں زندہ ہوں۔"

قادر خان نے جواب دیا۔ "اگر تم اس کے ڈسنے سے مر جاتے تو تمہارے جسم سے وہ بو نکلنی بند ہو جاتی جس کو سونگھنے کے بعد سانپ تمہارے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اب چونکہ اسے تمہارے جسم کی بو برابر محسوس ہو رہی ہوگی تو اسے یقین ہو جائے گا کہ تم زندہ ہو اور اس کے زہر کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سانپ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ان کے زہر کا اثر صرف اس شخص پر نہیں ہوتا جس نے مہاناگ کا انسانی روپ اختیار کر رکھا ہو اور مہاناگ کو سارے سانپ اپنا دیوتا مانتے ہیں۔ پس اب سانپ تمہیں اپنا دیوتا سمجھنے لگا ہے۔ وہ تمہارا ادب کرے گا۔ تمہاری خدمت کرے گا۔ تمہارے قریب آنے کی کوشش کرے گا۔

تمہارے پاؤں پر سر رکھنے کی کوشش کرے گا۔ پس اگر وہ ایسا کرے تو تم نہ
ڈرنا اور نہ اسے مارنے کی کوشش کرنا۔ یاد رکھو سانپ اگر دوست بن جائے تو
وہ انسان کا بہترین اور نہایت عقل مند دوست ثابت ہوتا ہے۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

وزیر علی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"قادر بھائی! پھر تو مجھے سانپ سے ڈسوا لینا چاہیے۔ یہ سانپ تو میرے بڑے کام آسکتا ہے۔"

قادر خان نے کہا۔

اسے تمہارے جسم کی وہ خاص دشمنی کی بو نہیں آ رہی جس پر یہ سانپ بپھر کر حملہ کرتا ہے۔ لیکن جان بوجھ کر کسی سانپ کے ساتھ ایسا کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ اس میں آگے چل کر کئی خرابیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی بات ہے کہ سانپ آدمی کا دوست بن جائے۔"

قادر خان نے میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

"ایسی پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ آدمی کی نیت نیک ہو تو خدا ہر مرحلے پر اپنے فرشتوں کے ذریعے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات پیدا ہوگئی تو تم خدا کے فضل سے محفوظ رہو گے۔ چلو اب باورچی خانے میں چل کر چائے پیتے ہیں۔ آؤ وزیر بھائی! چلو بھائی۔"

اور ہم حویلی کے کچن کی طرف چل پڑے۔

پہلے میرا ارادہ بمبئی مہاراشٹر اور گجرات کاٹھیاواڑ کی طرف جانے کا تھا تاکہ وہاں کے پس ماندہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کام کروں لیکن مراد آباد سے جو اخبار آئے تھے ان میں پڑھا کہ کشمیر میں حریت پسندوں نے اپنی

سرگرمیاں تیز کر دی ہیں اور وہ ہر محاذ پر بھارتی مقبوضہ فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انڈین آرمی نے بھی کشمیری مسلمانوں کے خلاف اپنی وحشیانہ کاروائیاں تیز کر دی تھیں۔ چنانچہ میں نے کشمیر کے محاذ پر جا کر اپنے حریت پسند کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

موذی سانپ کا خطرہ بقول قادر خان ٹل گیا تھا۔ ویسے بھی اس کے کاٹنے سے میں ہلاک نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ قادر خان نے کہا تھا کہ قرنگ پھنی کے پتوں کا سفوف ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن میں نے احتیاط کے طور پر باقی بچا ہوا سفوف ایک ڈبی میں بند کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میرے کشمیر کے محاذ پر جانے کی قادر خان اور وزیر علی نے بھی دل سے تائید کی۔ چنانچہ میں ایک روز ان سے رخصت ہو کر مراد آباد کے سٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوا اور جموں توی کی طرف روانہ ہو گیا۔

جموں توی کے کیلاش ہوٹل میں مجھے بوڑھے کشمیری سے مل کر کمانڈو شیر باز کو اپنی آمد کی اطلاع دینی تھی۔ بوڑھا کشمیری مجاہد مجھے ہوٹل میں ہی مل گیا۔ اس نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے اسے ایک خاص اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ مجھے کمانڈو شیر باز سے ملنا ہے۔ مجاہد کشمیری نے جواب میں مجھے خاص اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ میں تمہیں کمرے میں آ کر ملوں گا۔ کیلاش ہوٹل جموں کے اعلیٰ قسم کے ہوٹلوں میں سے تھا۔ میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ میں چھ سات روز تک اس مہنگے ہوٹل میں رہ سکتا تھا۔ مہنگے ہوٹل کا انتخاب میں اس لیے کرتا تھا کہ وہاں سی آئی ڈی کا خطرہ کم ہوتا تھا۔ خفیہ پولیس والے وہاں موجود ضرور ہوتے تھے مگر ہوٹل میں رہائش پذیر افراد کی با اثر شخصیت کے پیش نظر ان پر ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ صرف نگرانی کرتے تھے۔ جبکہ چھوٹے ہوٹلوں میں ذرا کسی مسافر پر شک پڑتا تھا تو اسے پکڑ کر تھانے لے جاتے تھے۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ میں کھانا کھا کر اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹ کر

جموں سے چھپنے والا ایک انگریزی کا اخبار پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے تین بار خاص انداز میں دستک دی۔ میں سمجھ گیا کہ کون آیا ہے میں نے آواز دی۔ "آ جاؤ۔" دروازہ کھول کر بوڑھا کشمیری مجاہد اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ تھا جس پر شیشے کا ڈھکن چڑھا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"سر! آپ کے لیے پانی لایا ہوں۔ یہ معدنیاتی پانی ہے سر!"

میں نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور مجاہد کشمیر سے کہا۔

"شیر باز خان مجھے کہاں مل سکتا ہے؟"

کشمیری مجاہد دروازے سے ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ کہنے لگا۔ "وہ جموں میں نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے۔ میں اسے آج رات کو پیغام بھجوا دوں گا کہ تم آئے ہوئے ہو اور اس سے ملنا چاہتے ہو۔"

یہ کہہ کر کشمیری مجاہد چلا گیا۔

"دوسرے دن میں دوپہر تک ہوٹل کے کمرے میں ہی رہا۔ اس دوران مجھے سانپ کا دو ایک بار خیال آیا۔ مگر چونکہ اب مجھے اس کی طرف سے جان کا خطرہ نہیں تھا اس لیے قدرتی طور پر میرے ذہن سے اس کا خیال محو ہونا شروع ہوگیا تھا۔ ویسے بھی میں سانپ کے علاقے سے بہت دور بھارت کے شمال میں آ چکا تھا۔ اتنی دور سانپ کو میرے پیچھے آنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ اس نے مجھے ڈسنا بھی نہیں تھا۔ میں ایک طرح سے میدان جنگ میں آگیا تھا اور میدان جنگ میں آنے کے بعد مجھے سانپ کے بارے میں قادر خان کی باتیں بے حقیقت اور بے سروپا محسوس ہونے لگی تھیں۔

مجھے جموں کے کیلاش ہوٹل میں ٹھہرے تین دن گزر گئے۔ کشمیری مجاہد میرے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ ظاہر ہے اسے کمانڈو شیر باز خان کی طرف سے کوئی پیغام نہیں ملا تھا۔ میں زیادہ وقت ہوٹل کے کمرے میں ہی گزارتا۔ اس خیال سے کہ خوامخواہ باہر نکلنے سے خفیہ پولیس والوں کی نظر میں آ جاؤں گا۔

تیسرے دن شام کے وقت میں کمرے میں لیٹا لیٹا تنگ آگیا اور جیکٹ اور اونی ٹوپی پہن کر باہر نکل گیا۔ جموں میں سخت سردی پڑ رہی تھی۔ کشمیر میں برفباری بھی ہو رہی تھی۔ جموں شہر میرا جانا پہچانا شہر تھا۔ میں ٹہلتے ٹہلتے دریائے توی کی طرف آگیا۔ ہوٹل سے نکلنے کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ میں نگاہوں میں آگیا ہوں اور میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ ہوٹل کے گیٹ سے نکلتے وقت میں نے ایک آدمی کو دیکھا تھا جو ایک طرف بنچ پر سویٹر کوٹ اور اونی ٹوپی پہنے گیٹ کے چوکیدار کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو اس نے مجھ پر گہری نگاہ ڈالی تھی۔ میں ایسی نگاہوں کو خوب پہچانتا تھا۔ میں خاموشی سے آگے نکل گیا۔ سامنے سڑک کی دونوں جانب بتیاں روشن تھیں۔ ساٹھ ستر قدم آگے جا کر سڑک دریا کے پل کی طرف مڑ جاتی تھی۔ سڑک مڑتے ہوئے میں نے گردن کو کھجانے کے بہانے پیچھے دیکھا تو مجھ سے بیس پچیس قدم پیچھے وہی گیٹ والا آدمی چلا آ رہا تھا۔ میں سڑک کا موڑ گھوم گیا۔ سمجھ گیا کہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے اور میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں اپنے ساتھ مراد آباد سے چلتے وقت کمانڈو چاقو یا پستول وغیرہ نہیں لایا تھا۔

"اس کی وجہ یہ تھی کہ جموں کا علاقہ حساس ترین علاقہ تھا اور یہاں داخل ہوتے وقت مسافروں کی تلاشی لی جاتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں جنگ کے محاذ پر جا رہا تھا اور محاذ پر مجھے ہر قسم کا اسلحہ مل سکتا تھا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ یہ جو خفیہ پولیس کا آدمی میرے پیچھے لگا ہے اس کے خیال میں میں ہوٹل میں اجنبی ہوں۔ پنجاب ہریانہ وغیرہ سے آیا ہوں اور وہ معمول کی ڈیوٹی پوری کر رہا ہے۔ اسے میرے بارے میں پوری تفصیل اور میرے پورے ریکارڈ کا علم نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ فوراً پولیس کو اطلاع کر دیتا کہ گجرات مہاراشٹر کا خطرناک پاکستانی جاسوس اس وقت ہوٹل میں موجود ہے اور پولیس اسی وقت آکر مجھے گرفتار کر لیتی۔ وہ محض اپنی نوکری اور اپنی ڈائری کے لیے میرا

پیچھا کر رہا تھا۔ کم از کم میں یہی سمجھ رہا تھا۔

چنانچہ میں اس سے بہت حد تک بے نیاز ہو کر چل رہا تھا۔ سامنے دریائے توی کا پل تھا جس میں اوپر پہاڑ کی ڈھلان پر بنی ہوئی عمارتوں کی روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ دریا کے پل پر آ کر میں کچھ دیر ٹہلتا رہا۔ پل پر ٹریفک آ جا رہی تھی۔ جنگلے کے ساتھ چھوٹا سا فٹ پاتھ بنا ہوا تھا۔ سردی کی وجہ سے پیدل چلنے والے کم ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے دو ایک بار دیکھا کہ خفیہ پولیس کا آدمی مجھ سے کچھ فاصلے پر میری برابر نگرانی کر رہا تھا۔ کچھ تھوڑی سی تشویش مجھے ضروری ہوئی۔ میں نے سوچا کہ واپس ہی چلے جانا بہتر ہے۔ خوامخواہ کی مشکل میں نہ پھنس جاؤں۔ مقبوضہ جموں کشمیر کا سارا علاقہ بڑا حساس علاقہ تھا۔ یہاں پولیس کو بھی کافی اختیارات حاصل تھے۔ اگرچہ میرے ذہن میں سنٹرل انٹیلی جینس کا خفیہ نمبر تھا لیکن میں اسے ظاہر کرتے ہوئے اس لیے گھبراتا تھا کہ ایک بار اس خفیہ نمبر کا راز فاش ہو چکا تھا اور بھارت کی سنٹرل انٹیلی جینس کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ نمبر ایک پاکستانی یا کشمیری کمانڈو کے پاس بھی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حکومت کی طرف سے اس نمبر کو نہ صرف منسوخ کر دیا گیا ہو بلکہ یہ بھی ہدایات جاری کر دی گئی ہوں کہ اس نمبر کے دکھانے والے کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہوا ہو۔ مگر مجھے بہرحال ایسا ہی سمجھنا چاہیے تھا اور بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

میں نے ہوٹل واپس آنے کے لیے ایک خالی ٹیکسی لے لی۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے کمرے کی بتی بجھا دی اور کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا پیچھے ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ میری کھڑکی سے نیچے ہوٹل کا گیٹ نظر آ رہا تھا اس وقت تک خفیہ پولیس والا وہاں نہیں پہنچا تھا میں ٹیکسی میں پہلے آ گیا تھا۔ کوئی بیس منٹ کے بعد میں نے پردے کے پیچھے سے دیکھا تو گیٹ کے پاس خفیہ پولیس والا اس طرح بنچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا۔ اب

مجھے احتیاط کی ضرورت تھی۔ کیونکہ دو ایک دن میں مجھے کمانڈو شیر باز خان سے ملنے اس کی خفیہ کمین گاہ میں بھی جانا تھا اور ظاہر ہے یہ خفیہ پولیس والا میرا پیچھا ضرور کرے گا۔

میں دوسرے دن بھی ہوٹل میں ہی رہا۔ شام کے وقت اپنا کشمیری مجاہد آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کمانڈو شیر باز خان جموں پہنچ گیا ہے اور اپنی خفیہ کمین گاہ میں آج آدھی رات کے بعد میرا انتظار کرے گا۔ میں نے بوڑھے کشمیری مجاہد سے ہوٹل کے گیٹ پر بیٹھے ہوئے سی آئی ڈی کے آدمی کی بات کی اور اسے بتایا کہ وہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔ بوڑھا کشمیری مجاہد بولا۔

"یہ تو اس کی ڈیوٹی ہے۔ ہوٹل میں جو کوئی نیا مسافر آتا ہے یہ اس کی دو ایک دن ضرور نگرانی کرتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ یہ خطرناک آدمی نہیں ہے دو ایک دن پیچھا کرتا ہے اور اپنی ڈائری میں لکھ کر رپورٹ کر دیتا ہے کہ مسافر مشکوک نہیں ہے۔"

لیکن مجھے اس خفیہ پولیس والے کے پیچھا کرنے کے انداز میں ایک غیر معمولی بات نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی تشویش کا کشمیری مجاہد کے آگے اظہار نہ کیا۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ رات کو مجھے کمانڈو شیر باز خان سے ملنے خفیہ کمین گاہ میں جانا ہے۔ اس آدمی کا پیچھا کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس پر کشمیری مجاہد نے کہا۔

"اس کی ڈیوٹی رات کے دس بجے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ پر بھی کوئی نہیں آتا مجھے معلوم ہے اس لیے تم آدھی رات کے بعد بے فکر ہو کر نکل جانا۔ صرف اتنی احتیاط کرنا کہ گیٹ کی طرف سے نکلنے کی بجائے ہوٹل کے پچھلے کوارٹروں والے دروازے میں سے نکل جانا۔ اب میں جاتا ہوں۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دو۔"

میرا دل چاہا کہ اسے کہوں کہ مجھے ایک بڑا کمانڈو چاقو لا دو۔ پھر خیال آیا

کہ یہاں چاقو کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا۔
"بہتر ہے اس وقت مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"
بوڑھا کشمیری مجاہد چلا گیا۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

میں آدھی رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے کمرے کی بتی بجھا دی تھی تاکہ باہر سے دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہو کہ میں سو گیا ہوں۔ صرف غسل خانے کی بتی روشن تھی جب رات کے پورے بارہ بج گئے تو میں نے کمرے کو تالا لگایا اور ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر لابی کی دوسری طرف سے گزر کر ہوٹل کے عقبی دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ رات بڑی سرد تھی۔ سڑک پر ہلکی ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر کو اونی ٹوپی سے ڈھانپ رکھا تھا میں دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دیے خاموشی سے سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ مجھے وہ راستہ معلوم نہ تھا جہاں سے ہو کر مجھے کمانڈو شیر باز خان کی خفیہ کمین گاہ تک جانا تھا۔ میں نے شہر کی طرف جانے والی سڑک کو چھوڑ کر وہ پگ ڈنڈی پکڑ لی جو شہر کے باہر سے ہوتی ہوئی جموں کی شمالی پہاڑیوں کی طرف نکل جاتی تھی اس پگ ڈنڈی پر اندھیرا تھا۔ شہر پیچھے رہ گیا تو میں پہاڑیوں میں گھرے ہوئے میدان میں آ گیا۔ یہ چھوٹے بڑے پہاڑی ٹیلے تھے مجھے اس میدان کے شمال مشرقی ٹیلے کی طرف جانا تھا۔ رات سرد اور کہر آلود تھی۔ میدان کہیں سنگلاخ تھا اور کہیں اونچا نیچا تھا اور خشک جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

خاموشی بڑی گہری تھی۔ شہر کی جانب سے کبھی کبھی کسی موٹر گاڑی کے انجن کی آواز آ جاتی تھی۔ یہ آواز تھوڑی دیر کے لیے سنائی دیتی اور پھر وہی سناٹا چھا جاتا۔ میرے چاروں طرف تاریکی تھی مگر اس تاریکی میں بھی جھاڑیاں اور موڑ

کی پہاڑیوں کے خاکے نظر آ رہے تھے۔ میں ایک جگہ جھاڑیوں میں سے ہو کر دوسری طرف کو مڑا تو مجھے اپنے پیچھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی خشک جھاڑیوں میں سے گزرا ہے۔ میں رک گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عین اسی لمحے مجھے ایک انسانی سایہ دوڑ کر ایک طرف کو اندھیرے میں گم ہوتا نظر آیا۔ میرا پیچھا کیا جا رہا تھا۔ میں ایک دم چوکس ہوگیا۔ یہ خفیہ پولیس والے آدمی کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا تھا اور اس وقت اس کا میرا تعاقب کرنا انتہائی خطرناک تھا۔ کیونکہ میں وادی کشمیر کے ایک اہم ترین کمانڈو کی خفیہ کمین گاہ کی طرف جا رہا تھا جس کا علم جموں پولیس کو کسی طرح بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

میں نے وہیں سے اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ شمال مشرقی ٹیلے کی طرف جانے کی بجائے میں بائیں جانب ہوگیا اور اس پگڈنڈی پر آگیا جو واپس شہر کی طرف جاتی تھی میں نے کمانڈو شیر باز خان سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اب میں واپس اپنے ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔ اب میں تیز تیز چلنے لگا تھا۔ میں جلدی ہوٹل پہنچنا چاہتا تھا میں نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کیونکہ یہ بات یقینی تھی کہ میرا پیچھا کیا جا رہا تھا۔ میں کشمیر بانہال روڈ پر آگیا۔ سڑک خالی پڑی تھی میں نے اپنا رخ شہر کی طرف کر لیا اور سڑک کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ سڑک پر کہیں کہیں بجلی کے کھمبے لگے تھے جن پر بلب روشن تھے۔ چلتے چلتے جیسے ہی میں ایک کھمبے کے پاس پہنچا۔ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا دو آدمی میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ بالکل میرے قریب آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ دوسرے نے گرم کوٹ اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ دونوں میں سے کوئی بھی بوڑھا نہیں تھا۔ کوٹ پتلون والا آدمی میرے پاس آکر رک گیا۔ اس نے ڈوگری زبان میں مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر نے مجھے رات کو سیر کرنے کے لیے کہا ہوا ہے۔ مجھے معدے کی تکلیف رہتی ہے۔ بات میں نے غلط کہہ دی

تھی مگر اس وقت مجھے اور کچھ سوجھا بھی نہیں تھا۔ وہ آدمی بولا۔
"ڈاکٹر نے تمہیں آدھی رات کو سیر کرنے کے لیے کیوں کہا ہے؟"
میں نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ دس بجے میں نے کھانا کھایا کچھ مہمان آ گئے۔ گیارہ بج تک وہ بیٹھے رہے جب وہ گئے تو میں نے سوچا کہ تھوڑی سیر ضرور کرلینی چاہیے۔"
میں ڈوگری پنجابی لہجے میں بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ میں ڈوگری زبان کو بھول چکا تھا۔ کافی عرصے سے بمبئی سورت کے علاقے میں رہ رہا تھا۔ دوسرے کمبل والے آدمی نے مجھ سے پوچھا میرا نام کیا ہے اور میں کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے یونہی اپنا ایک ہندوانہ نام بتا دیا اور کہا کہ میں جالندھر سے آیا ہوں۔ سنگر مشینوں کا ایجنٹ ہوں جموں میں مارکیٹ کا جائزہ لینے کمپنی کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ کوٹ پتلون والے آدمی نے آگے بڑھ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔
"چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے کہ تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے تھے۔ تمہیں ہمارے ساتھ پولیس سٹیشن تک چلنا ہوگا۔"
میں نے ان پر رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"آپ لوگ کون ہوتے ہیں مجھے پولیس سٹیشن لے جانے والے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟ آپ کا انسپکٹر جنرل پولیس میرے پتا جی کا دوست ہے میں نے ایک فون کر دیا آپ سب کو لائن حاضر کر دیا جائے گا۔"
کھمبے پر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں میں ان دونوں خفیہ پولیس والوں کے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ میری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو کمبل

والے آدمی نے اپنا ہاتھ کمبل سے باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے کہا۔

"خاموشی سے آگے چلو۔ بھاگنے کی کوشش کی تو میں یہیں ڈھیر کر دوں گا۔ تھانے جا کر تمہیں سب معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے تمہیں جس جرم میں پکڑا ہے۔ چلو۔"

میں ایک لمحے کے لیے چپ چاپ کھڑا رہا۔ سوچتا رہا کہ پھنس گیا ہوں۔ یہاں اونچ نیچ نہیں کرنی چاہیے ذرا آگے جا کر سڑک پر اندھیرا ہے۔ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ جیسے ہی میں ان کے آگے لگ کر چلا۔ کوٹ پتلون والے آدمی نے بلند آواز میں کسی کو پکار کر کہا۔

"آ جاؤ' اوئے آ جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی سڑک کے آگے جہاں اندھیرا تھا اس اندھیرے میں کسی موٹر گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر پولیس کی گاڑی اندھیرے میں سے نکل کر تیزی سے ہمارے پاس آ کر رک گئی۔ گاڑی میں سے تین وردی پوش کانسٹیبل چھلانگیں لگا کر باہر آ گئے۔

"پکڑ لیا اس پاکستانی جاسوس کو؟"

کمبل والے آدمی نے کہا۔

"ملکھی راما ہمارے ہاتھ سے کبھی کوئی پاکستانی جاسوس بچ کر نکلا ہے؟ چل اوئے بیٹھ جا گاڑی میں۔"

انہوں نے مجھے پولیس کی گاڑی میں اپنے درمیان بٹھا لیا۔ کوٹ پتلون والے آدمی نے کہا۔

"اس نے اپنا نام پرکاش چند بتایا ہے۔ کہتا ہے میں جالندھر سے آیا ہوں۔ سنگر مشینوں کا ایجنٹ ہوں۔"

ملکھی رام کانسٹیبل نے مجھے گالی دی اور کہا۔

"ابھی اس کی پتلون اتر واتے ہیں۔ معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہندو ہے کہ مسلا ہے۔"

اور وہ مجھے گالیاں دینے لگے۔ گاڑی سڑک پر روانہ ہو گئی۔ رات کے وقت سڑک خالی پڑی تھی۔ پولیس کی گاڑی فل سپیڈ سے جا رہی تھی میں مسلح پولیس کانسٹیبلوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دماغ میں طرح طرح کی ترکیبیں آ رہی تھیں کہ تھانے جا کر مجھے کیا موقف اختیار کرنا ہوگا۔ یہ امر طے شدہ تھا کہ تھانے پہنچنے کے بعد میرے مسلمان ہونے کا راز ان پر کھل جائے گا۔ میں نے سوچ لیا کہ میں یہ موقف اختیار کروں گا کہ میں مالیر کوٹلہ کا مسلمان پنجابی ہوں اور کشمیر کے جہاد میں حصہ لینے کے لیے جموں آیا تھا۔ میرے پاس کچھ روپے تھے میں کیلاش ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ اب اس انتظار میں تھا کہ یہاں کوئی کشمیری حریت پسند مل جائے تو اس کی مدد سے کشمیر میں جا کر اسلام کے جہاد میں حصہ لوں۔

پولیس کی گاڑی جموں شہر کی دھند میں ڈوبی ہوئی سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد ایک پولیس سٹیشن میں داخل ہو گئی۔ سپاہی مجھے پکڑ کر ایک کمرے میں لے گئے۔ یہاں گاندھی اور اندرا گاندھی کی تصویریں دیوار پر لگی تھیں۔ مجھے زمین پر بٹھا دیا گیا۔ ایک بڑی بڑی مونچھوں والا پولیس افسر اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بید کا ڈنڈا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"یہاں تمہارے پاکستانی ساتھ کہاں کہاں ہیں صاف صاف بتا دو گے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا اس کا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"میں پاکستانی نہیں ہوں۔ میں مالیر کوٹلے کا مسلمان ہوں"

اور اس کے ساتھ ہی میں نے ذہن میں جو کچھ سوچ رکھا تھا وہ دہرا دیا۔

پولیس افسر نے ایک کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر کہا۔
"اس نے کیا نام بتایا تھا۔"
اس نے کہا۔ "پرکاش چند بتایا تھا جناب۔"
"اس کی پتلون اتروا کر دیکھو۔"
میں نے کہا۔ "میری پتلون اتروانے کی کیا ضرورت ہے میں نے کہہ دیا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔"
پولیس افسر نے کہا۔
"اگر یہ سچ بتا دیا ہے تو یہ بھی بتا دو کہ تمہارے پاکستانی جاسوس ساتھی جموں میں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"
میں نے کہا۔
"جناب میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔"
"تو پھر تم آدھی رات کو پہاڑی ٹیلوں پر کیا کرنے جا رہے تھے؟"
میں نے کہا۔ "میں بیمار رہتا ہوں جناب۔ میرے پیٹ میں کھانا کھانے کے بعد درد ہوتا ہے۔ مالیر کوٹلے کے ایک ڈاکٹر نے مجھے کہا تھا کہ میں رات کو کھانا کھانے کے بعد تھوڑی سی سیر کر لیا کروں۔"
پولیس افسر نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"اچھا تو تم آدھی رات کی سردی میں پہاڑی ٹیلوں کی طرف سیر کرنے جا رہے تھے؟"
میں نے کہا۔ "ہاں جناب!"
پولیس افسر نے اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ میں پیچھے کو گر پڑا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ اس کے ساتھ پولیس افسر نے مجھے گالیاں دیتے ہوئے مجھ پر مکوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ جب وہ مجھے مار مار کر تھک گیا اور ہانپنے لگا تو اٹھ کر کھڑا ہوا اور بولا۔

"اس کو پچھلی حوالات میں بند کر دو۔ صبح اس کو تھرڈ ڈگری کی خوراک دیں گے اس کا باپ بھی سب کچھ بتا دے گا۔"

میرا سارا بدن پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ ہر جگہ درد ہو رہا تھا۔ مجھے دو سپاہی گھسیٹتے ہوئے کمرے میں سے نکال کر راہداری میں سے لے جاتے ہوئے تھانے کے پچھلے برآمدے کی تنگ کوٹھڑی میں دھکا دے کر پھینک دیا اور کوٹھڑی پر تالا ڈال دیا۔ اس کوٹھڑی کا دروازہ لوہے کی سلاخوں والا تھا۔ یہ تھانے کی چھوٹی حوالات تھی۔ فرش مٹی کا تھا۔ وہاں کوئی چٹائی بھی نہیں بچھی ہوئی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے کوئی میلا کچیلا کمبل بھی نہیں تھا۔ میں کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا اور خدا کو یاد کرنے لگا۔ باقی کی ساری رات اسی طرح بیٹھے بیٹھے درد کی ٹیسیں برداشت کرتے گزر گئی۔ دن کا اجالا پھیلا تو میں نے دیکھا کہ سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں پودوں کی کیاریاں تھیں۔ کونے میں نلکہ لگا تھا۔ ایک پرانی گاڑی کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ صحن کی دیوار دس بارہ فٹ اونچی تھی۔

کوئی میرے پاس نہ آیا۔ آخر ایک خاکروب قسم کا آدمی مجھے چائے کا ایک گلاس اور سوکھی روٹی دے کر چلا گیا۔ میں خاموشی سے چائے میں ڈبو کر سوکھی روٹی کھانے لگا۔

سوچ رہا تھا کہ یہ اچانک منظر کیسے تبدیل ہوگیا۔ میں کس مزے سے ہوٹل کے کمرے میں ناشتہ منگوا کر کیا کرتا تھا۔ اور اب اسی ہوٹل سے تھوڑی دور حوالات میں بیٹھا بدمزا چائے کے ساتھ سوکھی روٹی کھا رہا ہوں۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں کمانڈو شیر باز خان کی خفیہ کمین گاہ میں نہیں پہنچا تھا۔ اگر میرے پیچھے پیچھے چلتا خفیہ پولیس کا آدمی وہاں تک آ جاتا تو میرے ساتھ کمانڈو شیر باز کا پکڑا جانا بھی یقینی تھا۔ اگرچہ مجھے خیال ضرور تھا کہ پولیس نے ان پہاڑیوں کی چھان بین ضرور کی ہوگی مگر کمانڈو شیر باز کی خفیہ کمین گاہ ایسی جگہ پر ہے کہ پولیس وہاں تک نہیں پہنچی ہوگی۔ یہ بھی سوچتا کہ کمانڈو شیر باز میرا انتظار کرتا

رہا ہو گا۔ میرے نہ پہنچنے پر وہ کشمیری مجاہد سے ضرور رابطہ کرے گا۔ میں واپس اپنے ہوٹل میں بھی نہیں گیا۔ بوڑھا کشمیری مجاہد جب اسے بتائے گا کہ کمانڈر حیدر علی رات ہوٹل میں بھی نہیں آیا تو وہ میرا سراغ لگانے کی کوشش کرے گا لیکن وہ خود پولیس کو مطلوب ہے اور اس سے روپوش ہو کر پھرتا ہے۔ اسے میرا سراغ کیسے مل سکے گا۔ ہوٹل میں میرا صرف ایک چمڑے کا تھیلا ہی تھا جس میں میرے کچھ ضروری سفری سامان کے علاوہ موذی سانپ کا تریاق یعنی قرنگ پھنی کے سفوف والی ڈبی بھی تھی۔

مجاہد کشمیری کو جب پتہ چلے گا کہ دو دن گزر جانے کے بعد بھی میں ہوٹل میں نہیں آیا تو سمجھ جائے گا کہ میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ اور وہ میرا چمڑے کا تھیلا اٹھا کر لے جائے گا۔ بہرحال میری جان ضرور مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ اس روز بھی سارا دن مجھ پر تشدد ہوتا رہا۔ کیسی کیسی اذیت نہیں تھی جس کا مجھے نشانہ نہیں بنایا گیا۔ شام کا اندھیرا ہونے کے بعد مجھے پچھلی حوالات میں لا کر پھینک دیا گیا۔ خدا کا شکر ہے ابھی انہیں میرے پورے ریکارڈ کا علم نہیں ہوا تھا۔ انہیں صرف پیچھے سے یہی اطلاع ملی تھی کہ ایک مشکوک آدمی جالندھر سے جموں میں داخل ہوا ہے اور کیلاش ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میرا حلیہ بھی بتا دیا گیا تھا۔ میں نے بھی اپنی زبان بند رکھی تھی۔ ہر طرح کا وحشیانہ تشدد برداشت کیا مگر یہی کہتا رہا کہ میں مالیر کوٹلے کا مسلمان ہوں اور کشمیر کے جہاد میں حصہ لینے کے لیے آیا تھا۔

اب رات کو میری کوٹھڑی کے باہر ایک حوالدار بندوق لے کر پہرے پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ مجھے اس ٹارچر سیل میں تین دن گزر گئے۔ نہ میں نے زبان کھولی نہ انہوں نے تشدد کرنا اور اذیت دینی بند کی۔

چوتھی رات کو میں حوالات کے ٹھنڈے فرش پر ادموا ہو کر پڑا تھا کہ مجھے ایک مانوس آواز سنائی دی۔ یہ سانپ کی پھنکار کی آواز تھی جسے میں بڑی اچھی

طرح سے پہچانتا تھا۔ یہ اسی بالشت بھر کے سانپ کی آواز تھی جس کے زہر
تریاق میں نے پی لیا ہوا تھا اور جو بقول قادر خان کے اب مجھے اپنا دیوتا سمجھنے ا
تھا اور میری خدمت کرنا چاہتا تھا۔ مجھ سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ میں سانپ کی
پھنکار سن کر ایک دم چونک سا گیا۔ اتنے دنوں کے بعد مجھے اس کی آواز سنائی
دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ سانپ میری تلاش میں تھا اور مجھے تلاش کرتے
کرتے مراد آباد سے جموں پہنچ گیا تھا۔ اسے میرے جسم کی بو کھینچ کر یہاں تک
لے آئی تھی۔ ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ یہ سانپ میری مدد کر سکتا ہے۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ باہر برآمدے میں بلب روشن تھا۔ اس کی کچھ روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے باہر برآمدے میں نظر دوڑائی سانپ کی آواز قریب سے آئی تھی مگر برآمدہ خالی پڑا تھا۔ حوالدار جو پہرہ دے رہا تھا وہ برآمدے میں ٹہلتے ٹہلتے چار قدم دور چلا گیا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے سانپ کی پھنکار نہیں سنی تھی۔ دوسری بار سانپ کی پھنکار کی آواز آئی تو حوالدار نے بھی یہ آواز سن لی۔ اس نے اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔

"پوپٹ چند ڈانگ سوٹا لے کر آؤ۔ ادھر سانپ ہے۔"

حوالدار دوڑ کر پیچھے ہو گیا اور بندوق کی نالی آگے کر کے اس نے پوزیشن لے لی۔ اتنے میں ایک طرف سے رات کا چوکیدار ڈانگ زمین پر زور زور سے مارتا آ گیا۔

"کہاں ہے سانپ حوالدار جی؟"

"اس کی آواز سامنے والی جھاڑی سے آئی تھی۔"

چوکیدار پوپٹ چند نے جھاڑی پر اندھا دھند لاٹھی برسانی شروع کر دی۔ میں یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا اور خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ سانپ جھاڑی میں نہ ہو۔ جب چوکیدار لاٹھیاں برساتے تھک گیا تو برآمدے میں آ کر حوالدار سے کہنے لگا۔

"حوالدار جی! اگر سانپ جھاڑی میں تھا تو اب تک اس کا کچومر نکل گیا

ہو گا۔ اب تم بے فکر ہو کر پہرہ دو۔"

چوکیدار چلا گیا۔ اس کے بعد حوالدار بڑا محتاط ہو کر پہرہ دینے لگا۔ دوسرے قدم پر رک کر دائیں بائیں برآمدے کے فرش کو دیکھ لیتا تھا۔ حوالات کے فرش پر خاموش پڑا رہا۔ مجھے دو پرانے کمبل دے دیے گئے تھے نے کمبل اوپر کرلیے تھے میرے جسم کی حالت ایسی تھی جیسے کسی نے اسے اد کر رکھ دیا ہو۔ سارا جسم درد کرتا رہتا تھا۔ اس کے بعد سانپ کی آواز آئی شاید اسے بھی معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے دشمن اسے مارنے کے لیے وہاں موج ہیں۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا ایک دوست اور مہاناگ کا اوتار بھ اسی جگہ پر ہے یعنی میں حوالات میں موجود تھا اور سانپ ہر حالت میں مجھ تک پہنچنا چاہتا تھا اسے میرے بدن کی بو آ رہی تھی۔

نہ جانے رات کے کس لمحے مجھے نیند آ گئی۔ دوسرے دن مجھے ایک گاڑی میں بٹھا کر ایک ایسی جگہ پر لایا گیا جہاں چاروں طرف بھورے رنگ کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں۔ یہاں چھ سات کوارٹر بنے ہوئے تھے کواٹروں کے سامنے ایک فوجی جیپ کھڑی تھی میں سمجھ گیا کہ اب مجھے ملٹری انٹیلی جینس کے سامنے پیش کیا جائے گا اور تشدد اور اذیت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مجھے ایک کواٹر کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس وقت دن کا پہلا پہر تھا۔ میری یہ حالت تھی کہ جسم مسلسل اذیتیں سہتے سہتے اور نیم فاقہ کشی سے نڈھال ہو چکا تھا۔ سر چکراتا رہتا تھا مگر میری ہمت نے جواب نہیں دیا تھا۔ میں اللہ کے بھروسے پر زندہ تھا۔

کوارٹر کے کمرے میں مجھے دوپہر کو ایک ڈانگری والا فوجی آیا اور دو روٹیاں دے گیا جن پر دال رکھی ہوئی تھی۔ میں نے صبر شکر کر کے روٹی کھا لی۔ رات کو بھی دو روٹیاں اور دال دی گئی۔ ابھی رات کا پہلا پہر ہی تھا کہ دو فوجی اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک کیپٹن کے رینک کا تھا۔ دوسرا حوالدار تھا۔ دونوں فوجی

وردیوں میں تھے۔ فوجی کیپٹن نے اپنے ماتھے پر تلک لگایا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی بڑا متعصب قسم کا ڈوگرہ ہندو ہے۔ عام طور پر فوج میں اس قسم کے تلک لگانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ میرے سامنے سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا اور مجھ سے بڑی پیار محبت کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ پھر بولا۔

"ہم بھی کشمیری مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں ہم خود انہیں آزادی دینا چاہتے ہیں مگر وہ ہمارے آدمیوں کو گولیوں سے اڑا رہے ہیں گھات لگا کر ہمارے فوجی ٹرکوں پر حملے کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"تم لوگ جو کشمیری مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے ہو اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ تم نے کشمیر پر زبردستی قبضہ اور کشمیریوں کی مرضی کے خلاف قبضہ کیا ہوا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ تشدد تو انہوں نے مجھ پر کرنا ہی ہے کیوں نہ حق بات ان کے منہ پر کہہ دوں۔ ہندو کیپٹن اندر ہی اندر ضرور غصے سے پیچ و تاب کھا رہا ہو گا مگر اوپر سے وہ مسکراتا رہا کہنے لگا۔

"مگر تم مالیر کوٹلہ کے پنجابی مسلمان ہو۔ تمہیں کشمیریوں کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے۔"

میں نے کہا۔

"مسلمان خواہ کسی صوبے کسی ملک کا ہو دوسرے مسلمان کا بھائی ہوتا ہے۔ کشمیری مسلمان بھی ہمارے بھائی ہیں۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر دوسرے مسلمان پر کافر لوگ ظلم کر رہے ہوں تو اس کی مدد کرے۔"

اب ہندو کیپٹن سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے میرے سامنے بیٹھے ہوئے میرے سینے پر اتنی زور سے ٹھڈا مارا کہ میں پیچھے کو الٹ گیا۔ اس نے مجھے بے

طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے چیخ چیخ کر اللہ اکبر یا علی کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ دونوں فوجی مجھے لکڑی کے فرش پر نیم جان چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھ پر اس قدر شدید تشدد کیا جا رہا تھا کہ اب میری ہمت بھی جواب دینے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ میں اب زندہ نہیں رہوں گا۔

اس رات میرا جسم اس قدر درد کرتا رہا کہ تھوڑی دیر بعد میرے منہ سے بے اختیار ہائے نکل جاتی تھی۔ نیند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فرش پر کمبل اوپر ڈال کر پڑا کراہ رہا تھا کہ میرے کانوں میں پھر وہی سانپ کی پھنکار کی آواز آئی۔ اب یہ آواز میرے قریب سے آ رہی تھی جس کوارٹر میں مجھے بند کیا گیا تھا اس کا دروازہ سلاخوں والا نہیں تھا۔ دروازہ لکڑی کا تھا اور اسے باہر سے قفل لگا دیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی قفل لگا ہوا تھا۔ رات کو باہر پہرہ دینے والے فوجی کے قدموں کی آواز نہیں آتی تھی۔ کوارٹر میں چھت کے ساتھ صرف ایک بتی روشن تھی میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اچانک پھنکار کی آواز پھر آئی۔ یہ آواز کونے کی طرف سے آئی تھی۔

میں نے کونے کی طرف دیکھا۔ کونے میں ایک نالی بنی ہوئی تھی میں نے دیکھا کہ وہی بالشت بھر کے بھورے رنگ کا سانپ نالی کے آگے کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ اس کا رخ میری طرف تھا اور مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں سے تکے جا رہا تھا۔ مجھ کو خوف محسوس ہوا پھر خیال آیا کہ میں نے تریاق والا سفوف پی رکھا ہے اس کے زہر کا مجھ پر اثر نہیں ہوگا۔ پہلے بھی اس نے مجھے ڈسا تھا تو مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ بھی خیال آگیا کہ بقول قادر خان یہ سانپ اب میرا مطیع ہوگیا ہے۔ سانپ نے میرے دیکھتے دیکھتے اپنی گردن نیچے جھکائی اور جھکاتے ہی اپنا چھوٹا سا سر فرش کے ساتھ لگا دیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ واقعی مجھے اپنا مالک سمجھتا ہے۔ اس کی اس حرکت سے میرا بھی حوصلہ بڑھ

گیا۔ میں نے سانپ کو اسی طرح پچکارا جس طرح پالتو کتے بلی کو پچکارا جاتا ہے۔
سانپ آہستہ آہستہ میری طرف رینگنے لگا۔
رینگتے رینگتے وہ مجھ سے کوئی دو تین فٹ کے فاصلے پر آکر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اب وہ بار بار اپنی گردن کو میرے آگے جھکا رہا تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا اس وقت وہ سانپ ہی اپنا دوست تھا۔ میں نے اسے کہا۔
"دوست! میں ظالموں میں پھنس گیا ہوں کسی طرح مجھے ان لوگوں سے نجات دلا تجھے خدا نے میری مدد کے لیے بھیج دیا ہے۔ اب میری مدد کر۔"
میں یونہی بولے جا رہا تھا۔ بھلا سانپ کہاں انسان کی زبان سمجھتا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی تسلی کے لیے کہہ رہا تھا۔ اچانک باہر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی سانپ نے فوراً گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور تیزی سے رینگتا ہوا نالی میں جا گھسا۔ فوجی بوٹوں کی آواز دروازے کے باہر آکر رک گئی۔ تالا کھلنے کی آواز آئی اور وہی ہندو کیپٹن اپنے ساتھ حوالدار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ خدا جانے اس نے ٹارچر کے لیے رات کا پچھلا پہر کیوں منتخب کیا تھا۔ دیوار کے ساتھ دو سٹول پڑے رہتے تھے۔ ان پر بیٹھ کر ملٹری انٹیلی جینس والے مجھ سے پوچھ گچھ کرتے تھے۔ حوالدار نے جلدی سے ایک سٹول کھینچ کر میرے آگے رکھ دیا۔ کیپٹن اس پر بیٹھ گیا۔ حوالدار کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ دونوں اس وقت بھی فوجی وردیوں میں تھے۔ یہ وردیاں ہرے رنگ کی تھیں جو انڈین آرمی کی وردیوں کا رنگ تھا۔
"میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ صبح تمہیں فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا لیکن اگر اب بھی تم ہمیں اپنے ساتھی پاکستانی اور کشمیری کمانڈوز کے خفیہ ٹھکانوں کا پتہ بتا دو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔ میں تمہیں اس کا وچن دیتا ہوں۔ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا اور جہاں تم چاہو گے تمہیں وہاں پہنچا دیا جائے

گا۔ کہو کیا کہتے ہو؟ موت چاہتے ہو یا زندگی؟

میں نے کہا۔ "جب میرا کوئی پاکستانی ساتھی ہی نہیں ہے تو میں آپ لوگوں کو کیسے بتا دوں کہ اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟"

ڈوگرہ کیپٹن طیش میں آ گیا اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر فرش پر لٹا دیا اور مجھے ٹھڈے مارنے شروع کر دیے۔ جانے اس وقت میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے بے اختیار ہو کر سانپ کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔

"میرے دوست! ظالم مجھے مار ڈالیں گے۔ مجھے ان سے بچا سکتا ہے تو بچا۔ دوست! میری مدد کر۔ دوست میری مدد کر۔"

"کس کو بلا رہا ہے؟" ڈوگرہ کیپٹن نے مجھے گالی دے کر کہا۔ "یہاں تمہارا کوئی دوست نہیں ہے۔"

خدا جانے کیا بات ہوئی سانپ میری آواز پر نالی میں سے بجلی کی طرح نکل کر ڈوگرہ پر جھپٹا اس نے کوئی پھنکار نہ ماری۔ میں نے کوارٹر کی روشنی میں صرف نالی میں سے سانپ کو بجلی ایسی تیزی کے ساتھ نکل کر آتے دیکھا۔ دوسرے لمحے ڈوگرہ کیپٹن کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے گر پڑا اور اس کا سر اس کے دھڑ سے الگ ہو گیا۔ حوالدار جو سٹین گن لیے کھڑا تھا۔ سکتے میں آ گیا۔ وہ باہر کو دوڑا مگر سانپ نے اسے دروازے تک جانے کی بھی مہلت نہ دی اور اسے بھی ڈس لیا۔ ڈوگرہ حوالدار بھی دھڑ سے نیچے گر پڑا۔ وہ بازو کے بل پر گرا اور اس کا بازو اس کے جسم سے الگ ہو گیا۔

میں ان دونوں لاشوں کو دیکھتا کبھی سانپ کو دیکھتا جو میرے سامنے فرش پر کنڈلی مارے بڑے ادب سے بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جب اس سانپ نے ٹریننگ کیمپ میں یہودی انسٹرکٹر کو ڈسا تھا اور اس کا جسم پتھر بن گیا تھا تو میں نے یہودی انسٹرکٹر کی سخت لاش کے انگوٹھے کو ذرا زور سے دبایا تھا تو وہ اس طرح بھربھرا تھا جیسے ابھی الگ ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے ڈوگرہ

کیپٹن اور حوالدار کے جسم سانپ کے زہر سے پتھر بن جانے کے بعد جب دھڑام سے فرش پر گرے تھے تو ڈوگرہ کیپٹن کا سر اور حوالدار کا بازو اس کے جسم سے الگ ہوگیا تھا۔

پہلے تو میں کچھ دیر دہشت کی حالت میں رہا۔ پھر مجھے صورت حال کا احساس ہوا۔ میں نے اٹھ کر دروازے کے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر صحن خالی پڑا تھا۔ کونے میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ شاید یہ دونوں ڈوگرہ فوجی اس جیپ پر آئے تھے۔ میں نے سانپ کو دیکھا۔ سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا گردن گھما گھما کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اسے اٹھا کر اپنی پھٹی ہوئی جیکٹ کی جیب میں رکھ لوں۔ پھر میں ڈر گیا۔ سانپ اگرچہ میرا دوست تھا مگر اسے پکڑتے ہوئے مجھے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دوست! میں یہاں سے بھاگ رہا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟ آ جاؤ۔"

میں دروازے میں سے دوڑتا ہوا دیوار کی طرف گیا۔ دیوار اونچی تھی مگر خدا جانے اس وقت مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی میں دوڑ کر اچھلا اور دیوار کے اوپر میرے ہاتھ پڑ گئے۔ میں دوسری طرف جھاڑیوں میں کود گیا۔ میرے کپڑے میلے کچیلے تھے پاؤں میں پرانا جوتا تھا جیکٹ پھٹ چکی تھی۔ میں نے اندازہ لگا کر جموں شہر کی شمال مشرقی پہاڑیوں کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ فرار ہونے کی گرمجوشی میں دوڑ ضرور پڑا تھا مگر تھوڑی دور دوڑنے کے بعد ہی میرے جسم میں ٹیسیں پڑنی شروع ہوگئیں۔ میں دوڑنے کی بجائے چلنے لگا۔ کچھ معلوم نہیں تھا رات کتنی گزر چکی ہے دوڑنے اور تیز چلنے سے سردی کا احساس ختم ہوگیا تھا۔ جموں شہر کی یہ پہاڑیاں میرے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ اگرچہ رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور کہیں کہیں پہاڑی ٹیلوں پر سردی کا کہر بھی پھیلا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میں صحیح سمت کو جا رہا ہوں۔ شہر کی آبادی جب ذرا

پیچھے رہ گئی اور اس کی روشنیاں مدھم پڑنے لگیں تو میں دم لینے کے لیے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں شیر باز خان کی خفیہ کمیں گاہ میں جانا چاہتا تھا۔ اس وقت وہی میرے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔

میں نے اندھیرے میں آنکھیں کھول کر اپنے دائیں بائیں دیکھا کہ شاید میرا دوست سانپ بھی میرے ساتھ رینگتا ہوا آ گیا ہو۔ اندھیرے اور دھند میں وہ مجھے دکھائی تو نہیں دے سکتا تھا مگر اس کی پھنکار بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دو منٹ تک سانس لینے کے بعد میں دوبارہ چل پڑا۔ سنگلاخ زمینوں' اونچی نیچی پہاڑی گھاٹیوں میں ہوتا ہوا آخر میں اس چھوٹے میدان میں آ گیا جس کے سامنے کی طرف والی پہاڑیوں اور ٹیلوں کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ انہی پہاڑی ٹیلوں میں ایک جگہ کمانڈو شیر باز خان کا خفیہ ٹھکانہ تھا۔ میں پیچھے کسی ڈوگرہ رجمنٹ کے ایک کیپٹن اور حوالدار کی لاش چھوڑ کر فرار ہوا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پتہ چل جانے کے بعد اس سارے علاقے کو ملٹری نے گھیرے میں لے لینا تھا کیونکہ پولیس نے مجھے انہی پہاڑیوں میں مشکوک حالت میں رات کو پھرتے ہوئے گرفتار کیا تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ شیر باز خان کی خفیہ کمیں گاہ تک انڈین ملٹری کے دو آدمی نہیں پہنچ سکیں گے۔ آخر میں نے دو ٹیلوں کے درمیان اس چھوٹے سے تنگ راستے کو اندھیرے میں دیکھ لیا جو خفیہ کمین گاہ کو جاتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں ان اونچی اونچی جھاڑیوں کے سامنے کھڑا تھا جن کے پیچھے ٹیلے کے اندر والے قدرتی غار کو راستہ جاتا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں جھاڑیوں میں گھس گیا۔ میرا خیال تھا کہ کمانڈو شیر باز غار میں ہی ہو گا۔ وہ اتنی دور کشمیر کے محاذ سے آیا تھا۔ اتنی جلدی شاید واپس نہ جائے لیکن کمانڈو شیر باز وہاں نہیں تھا میں غار کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے وہاں میرے لیے زیادہ دن ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے پانی

وغیرہ کی تلاش میں باہر نکلنا تھا اور باہر خطرہ تھا۔ وہاں کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ کوٹھڑی کی فضا گرم تھی اس گرم فضا نے میرے جسم کو بڑا سکون عطا کیا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے بوریئے پر لیٹ گیا۔ مجھ پر نیند اور بیدار کی حالت طاری ہو گئی۔ کبھی لگتا کہ میں گہری نیند سو رہا ہوں۔ کبھی لگتا کہ جاگ رہا ہوں یہ حالت نہ جانے کب تک مجھ پر طاری رہی۔

غار والی کوٹھڑی میں کوئی دروازہ وغیرہ نہیں تھا۔ دیوار میں ایک تنگ شگاف تھا جس میں سے جھک کر گزرنا پڑتا تھا۔ کوٹھڑی کی قدرتی چھت کافی اونچی تھی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کمانڈو شیر باز نے یہاں موم بتیاں اور ماچس کہاں رکھی ہوتی ہے۔ میں نے ٹٹول ٹٹول کر موم بتی اور ماچس تلاش کر لی۔ موم بتی روشن ہوئی تو کوٹھڑی میں روشنی پھیل گئی۔ دیوار کے ساتھ کمانڈو شیر باز کی پرانی پتلون اور گرم اونی جیکٹ لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا پھٹا ہوا پاجامہ اور جیکٹ اتار کر کمانڈو شیر باز کی جیکٹ اور پتلون پہن لی۔ میرے جسم پر کوئی گہرا یا تشویش ناک زخم نہیں تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اس طرح کی اذیتیں دی تھیں کہ جسم پر زخم نہ آئے مگر اندر سے میرا انجر پنجر تباہ ہو جائے لیکن سارا بدن دکھ رہا تھا۔ لیٹنے سے مجھے آرام پہنچ رہا تھا۔ چنانچہ میں دوبارہ لیٹ گیا۔ اس کے بعد واقعی مجھے نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو کوٹھڑی کے شگاف میں سے ہلکی ہلکی سفید روشنی اندر آ رہی تھی۔ غار میں اس کوٹھڑی کے باہر چھت پر بہت اوپر کر کے ایک قدرتی شگاف بنا ہوا تھا۔ یہ روشنی دن کی روشنی تھی اور اسی شگاف میں سے اندر آ رہی تھی۔

گہری نیند سونے سے میرے جسم کو کافی آرام مل گیا تھا۔ جسم پر جو ٹیسیں پڑتی تھیں وہ بھی گم ہوگئی تھیں۔ میں اٹھ کر شگاف میں سے باہر آگیا اوپر دیکھا تو گول سوراخ میں سے دن کی روشنی ایک سفید ستون کی طرح غار میں آ رہی تھی۔ مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی میں نے سوچا باہر چل کر دیکھنا چاہیے شاید کہیں سے پانی مل جائے۔ میں غار کی دہانے سے نکل کر جھاڑیوں میں آکر ٹیلوں کے درمیان جو تنگ راستہ بنا ہوا تھا اس طرف دیکھنے لگا۔ دھوپ اوپر اوپر تھی۔ پھر معلوم ہو رہا تھا کہ کافی دن چڑھ آیا ہے۔ اس وقت تک میرے فرار کا علم سب کو ہو چکا ہوگا اور دونوں فوجی عہدیداروں کی پتھرئی لاشیں بھی مل چکی ہوں گی جن میں سے ایک لاش کا سر الگ ہو چکا تھا اور دوسری لاش کا بازو الگ ہوگیا ہوا تھا۔ سول پولیس اور ملٹری پولیس شہر میں میری تلاش میں سرگرداں ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس پہاڑی علاقے میں بھی مجھے تلاش کیا جا رہا ہو۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ میں نے سوچا اس پہاڑی درے سے ذرا باہر نکل کر دیکھنا چاہیے۔ شاید کسی جگہ کوئی چشمہ بہہ رہا ہو۔ مجھے واقعی بڑی شدید پیاس لگ رہی تھی۔ حلق خشک ہونے لگا تھا۔ عام حالت میں میں پیاس بہت دیر تک برداشت کر لیتا تھا مگر مجھ پر اتنا ٹارچر کیا گیا تھا کہ جسم کی قوت مدافعت بے حد کمزور پڑ چکی تھی۔ میں جھاڑیوں میں سے باہر نکل آیا۔

پہاڑی ٹیلوں کا درمیانی تنگ راستہ سنسان پڑا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں سوکھی گھاس اور سرکنڈوں میں سے آہستہ

آہستہ گزرتا تنگ درے کے باہر آ گیا۔ سامنے سنگلاخ اونچی نیچی زمین تھی۔ آگے پھر ٹیلے شروع ہو جاتے تھے۔ اچانک مجھے ایک طرف سے آدمیوں کی آواز آئی۔ دو آدمی باتیں کرتے چلے رہے تھے یا چلے جا رہے تھے۔ میں دوڑ کر غار میں آ گیا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں غار کے دہانے کے پاس بیٹھ کر ان آواز کو غور سے سننے لگا۔ آوازیں دو آدمیوں کی تھیں۔ مجھ تک صرف آواز آ رہی تھی کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ پھر یہ آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ میں وہیں کان لگائے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر تک کوئی آواز نہ آئی۔ اس کے بعد مجھے اپنے دوست سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ میں اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ سانپ کا خوف ایک قدرتی بات ہے۔ اگرچہ یہ سانپ میرا دوست تھا پھر بھی سانپ سانپ ہی ہوتا ہے۔ ابھی میں اس کے ساتھ اتنا بے تکلف نہیں ہوا تھا مجھے سانپ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے یونہی اپنی تسلی کے لیے کہا۔

"سامنے آؤ"

مجھے معلوم تھا کہ سانپ کو صرف میری آواز ہی آئے گی۔ وہ میرے الفاظ بالکل نہیں سمجھ سکے گا۔ سانپ کے کان نہیں ہوتے۔ وہ آواز کو اپنی زبان اور جسم کی مدد سے محسوس کرتا ہے۔ سانپ جو بار بار زبان نکالتا ہے اس سے وہ ایک تو فضا کو سونگھتا ہے دوسرے باہر کی آوازوں کو بھی اسی زبان اور اپنے جسم کی مدد سے سنتا ہے۔ آواز کی لہریں اس کے جسم اور زبان سے ٹکرا کر اسے خبردار کرتی رہتی ہیں۔ میری آواز کی لہروں کو بھی سانپ نے اپنے جسم پر محسوس کر لیا تھا۔ میری بو تو وہ پہلے ہی سے محسوس کر رہا تھا۔ میری آواز کی لہروں کو محسوس کرنے کے بعد وہ جھاڑیوں میں سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ غار کے اندر آ کر وہ کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور میری طرف دیکھ کر اپنا سر آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہلانے لگا۔ مجھے ابھی تک ان آدمیوں کی آوازوں کا خیال لگا ہوا تھا۔ جو مجھے

تنگ راستے کے باہر سنائی دی تھیں اور اب غائب ہو چکی تھیں۔ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ پہاڑیے بھی ہو سکتے ہیں اور خفیہ پولیس والے بھی ہو سکتے ہیں۔

غار کے دہانے پر بیٹھے رہنا خطرناک تھا۔

میں نے سانپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دوست میں اندر کوٹھڑی میں جا رہا ہوں تم بے شک باہر جا کر سیر کرو۔ پھر کسی وقت آ جانا۔

میں سانپ کے ساتھ کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے بچپن ہی سے سانپ سے ڈر لگتا تھا۔ یہ کہہ کر میں غار کے اندر چلا آیا۔ سانپ نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ جب میں کوٹھڑی میں آ گیا تو ایک منٹ بعد سانپ بھی اندر آ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دوست اب ایک طرف ہو کر بیٹھے رہنا۔ اگر تم میرے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ مگر میرے قریب آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

سانپ نے خدا جانے کیا سنا اور کیا سمجھا۔ بہرحال وہ کوٹھڑی کے شگاف کے باہر ایک طرف کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اسے اٹھ کر دیکھا تو وہ بالکل جلیبی کی طرح بنا ہوا تھا۔ مجھے پیاس نے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب زبان بھی سوکھنے لگی تھی۔ یا اللہ! پانی کہاں سے ملے گا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ اندر ہی بیٹھا رہوں کہ باہر نکل کر پانی کی تلاش کروں۔ آدمیوں کی آوازوں نے مجھے خبردار کر دیا تھا۔ اب میں باہر جاتے ہوئے بھی گھبرا رہا تھا۔

بیٹھے بیٹھے جب کافی وقت گزر گیا اور باہر سے بھی کسی کی دوبارہ آواز نہ آئی تو میں نے سوچا ایک بار پھر نکل کر دیکھنا چاہیے شاید کہیں سے پانی مل جائے۔ میں شگاف سے باہر آیا تو سانپ نے گردن اونچی کر کے مجھے دیکھا اور پھر سر جھکا دیا۔ میں نے کہا۔

"دوست! مجھے سخت پیاس لگی ہے۔ میں پانی کی تلاش میں جاتا ہوں تم اسی جگہ بیٹھے رہنا۔"

میں غار میں سے گزرتا اس کے دہانے پر آ کر رک گیا۔ ہمہ تن گوش ہو کر باہر کی فضا کو غور سے سنا۔ باہر سناٹا تھا۔ کوئی پہاڑی کوا دور کسی جگہ کائیں کائیں کر رہا تھا۔ میں نے خدا کا نام لیا اور غار کے منہ کے آگے جھاڑیوں کی جو دیوار کھڑی تھی اس میں سے ہو کر پہاڑی درے میں چلنے لگا۔ یہ تنگ راستہ ختم ہوا تو میں نے سر آگے نکال کر دیکھا۔ سامنے چھوٹا سا پہاڑی میدان بالکل خالی پڑا تھا۔ مجھے اپنے پیچھے سانپ کی ہلکی سی بھنکار کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ سانپ میرا پیچھا کرتا آ رہا تھا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ سانپ میرے قریب سے ہو کر رینگتا ہوا تیزی سے آگے نکل گیا۔ میں سمجھ گیا کہ سانپ نے سیر کرنے کا پروگرام بنا لیا ہے

سامنے میدان میں سوائے سوکھی گھاس اور خشک جھاڑیوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دائیں جانب دوسرے پہاڑی ٹیلے کی دیوار شروع ہو جاتی تھی۔ بائیں جانب ڈھلان تھی۔ سانپ اسی ڈھلان کی طرف گیا تھا۔ عجیب بات ہے اس نے ڈھلان کی طرف مڑتے ہوئے میری طرف گردن اٹھا کر دیکھا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میں غیر ارادی طور پر ڈھلان کی طرف چلا آیا۔ یہ ڈھلان زیادہ گہری نہیں تھی۔ نیچے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ سانپ اس جھنڈ کی طرف جا رہا تھا۔ تھوڑی دور تک وہ مجھے نظر آیا پھر پتھروں اور گھاس میں گم ہو گیا۔ میں نے اردگرد غور سے دیکھا جب مجھے تسلی ہو گئی کہ وہاں کوئی آدمی نہیں ہے تو میں ڈھلان اتر کر درختوں کے جھنڈ میں آ گیا۔ یہاں آتے ہی مجھے ترل ترل پانی کے گرنے کی مدھم آواز آئی۔ پانی کی آواز سن کر میری جان میں جان آ گئی۔ یہ پانی درختوں کے نیچے ٹیلے کی دیوار میں سے نالے کی شکل میں نیچے گر رہا تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور ہاتھوں کی

اوک بنا کر خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ پانی پی کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں سانپ کو بھول گیا تھا۔ وہیں بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی اگرچہ بہت ٹھنڈا تھا مگر اس وقت وہ بہت بڑی نعمت تھا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو دیکھا کہ میرا دوست سانپ جہاں پانی کے گرنے سے چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا وہاں ایک پتھر پر کنڈلی مارے بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا کہ سانپ کو کیسے پتہ چل گیا کہ مجھے پیاس لگی ہے۔ ظاہر ہے وہی مجھے پانی کے اس چشمے تک لایا تھا۔ یہ خدائی راز تھے جن کو سمجھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ انسان اتنا عقلمند ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھتا اور جانور بے عقل ہوتے ہوئے بھی کیا کچھ نہیں سمجھ لیتے؟ یہ راز میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس خیال سے بلکہ اسی ڈر سے کہ وہاں خفیہ پولیس ضرور موجود ہوگی میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا چڑھائی چڑھ کر اپنے غار میں آگیا۔

پانی پینے سے میرے جسم کی توانائی کافی حد تک بحال ہوگئی تھی۔ میں نے دیوار کے شگاف کی طرف دیکھا۔ سانپ وہاں نہیں تھا۔ شاید وہ باہر پہاڑیوں میں سیر کرنے نکل گیا تھا۔ دن گزرتا چلا گیا غار کی چھت کے سوراخ میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی وہ مدھم پڑنے لگی۔ لگتا تھا کہ سورج غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اب مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا سانپ بھی وہاں نہیں ہے اگر وہ میرے پاس ہوتا تو اس سے کہتا کہ دوست اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میرے کھانے پینے کا کوئی انتظام کر سکتے ہو تو کر دو۔ مجھے اپنے اس خیال سے ہنسی آ گئی۔ پھر میں ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ کیونکہ میں اپنے دوست سانپ کی عقلمندی کا مظاہرہ دیکھ چکا تھا۔ ممکن ہے اگر وہ میرے پاس ہوتا تو مجھے کسی ایسی جگہ لے جاتا جہاں جنگلی سیبوں کے درخت ہوتے اور میں سیب کھا کر ہی پیٹ کی آگ بجھا لیتا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرا دوست سانپ اندر آ گیا۔

اندر آ کر وہ حسب عادت کونے میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور میری طرف دیکھ کر دو تین بار گردن کو جھکایا اور پھر سر نیچے کر کے بالکل جلیبی کی طرح بن کر سمٹ گیا۔ میں نے بھی اس کی طرف سے توجہ ہٹا لی۔ بھوک کی وجہ سے میرے جسم میں کمزوری آنے لگی تھی۔ صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ غار کی چھت کے سوراخ میں سے جو دن کی روشنی سارا دن آتی رہی تھی وہ اب بہت مدھم ہو گئی تھی۔ باہر شام کا وقت ہو گیا تھا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا ہونے لگا تھا۔ میں نے موم بتی روشن کر لی اور سوچنے لگا کہ اگر شیر باز خان نہ آیا تو میں یہاں کب تک بھوکا بیٹھا رہوں گا۔ میں نے وہاں سے رات کی تاریکی میں نکل کر سری نگر کی طرف جانے کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ اگرچہ یہ بڑا مشکل کام تھا کیونکہ میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ ویسے بھی بھوکا تھا اور وہاں سے سری نگر بانہال کو جانے والی سڑک بھی کافی دور تھی۔ پھر یہ بھی خطرہ تھا کہ لاقے میں ملٹری پولیس اور انٹیلی جنس کے آدمی پھیلے ہوئے ہوں گے۔ سڑک پر ناکے لگے ہوں گے۔ جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی ہو گی۔ سڑک سے ہٹ کر پہاڑوں ا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ یہ پہاڑی سلسلہ اتنا وسیع تھا اور درمیان اتنے ے بڑے سنگلاخ میدان تھے کہ میں انہیں پیدل چل کر عبور نہیں کر سکتا تھا۔

میں اسی سوچ میں الجھا پریشان بیٹھا تھا کہ مجھے اچانک باہر سے کوئل کی واز سنائی دی۔ میں ایک دم چونک پڑا۔ اس موسم میں جموں کے علاقے میں

کوئل نہیں بولا کرتی۔ یہ شیر باز خان کا سگنل تھا۔ جب ہماری کوئی کمانڈو پارٹی کسی مشن پر جاتی تھی تو ٹارگٹ کے پاس پہنچ کر ہم کوئل کی آواز نکال کر ایک دوسرے کی موجودگی سے باخبر رہا کرتے تھے۔ کوئل کی آواز دوسری بار آئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اپنے منہ سے کوئل کی آواز نکالی۔ میرے آواز نکالنے پر باہر سے کوئل کی آواز تین بار آکر خاموش ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ کمانڈو شیر باز خان کو معلوم ہوگیا ہے کہ میں کیمپ گاہ میں ہی ہوں۔ اس نے میری موجودگی معلوم کرنے کے لیے ہی غار کے باہر سے کوئل کی آواز میں مجھے سگنل دیا تھا۔ میں اٹھا تو سانپ نے بھی ایک دم اپنی گردن اونچی کر لی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ سانپ کمانڈو شیر باز کو ڈس نہ لے۔ پہلے میں نے سوچا کہ سانپ کو پکڑ کر برتن میں بند کر لوں مگر وہاں کوئی ایسا برتن نہیں تھا۔ سانپ برابر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی وقت وہ کوٹھڑی کے باہر کی طرف گردن پھیر لیتا تھا۔ اس نے کسی اجنبی انسان کی بو کو سونگھ لیا تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ میں نے پرانی ترکیب پر عمل کرتے ہوئے سانپ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”دوست! جو آدمی اندر آ رہا ہے وہ میرا دوست ہے۔ میرا بھائی ہے اس کو ہرگز ہرگز نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرنا۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟ میرا دوست کمانڈو شیر باز آ رہا ہے۔ اسے کچھ نہ کہنا۔ ٹھیک ہے؟ تم سمجھ گئے ہو؟“

سانپ گردن اٹھائے میری طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے تین بار گردن جھکائی اور جیسے پہلے بیٹھا تھا ویسے ہی جلیبی بن کر بیٹھ گیا۔ یقین کریں اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ سانپ اصل میں کوئی انسان ہے جو بھیس بدل کر سانپ کے روپ میں ظاہر ہوگیا ہے۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ میری بات کو اچھی طرح سے سمجھ گیا ہے۔ مجھے غار میں کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے کوٹھڑی سے باہر آگیا۔

غار میں اندھیرا تھا۔ قدموں کی آواز رک گئی۔ پھر کوئل کی ہلکی سی آواز بلند ہوئی۔ میں نے بھی جواب میں کوئل کی آواز نکالی تو کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے ہو۔"

وہ آگے بڑھ کر میرے سامنے آیا تو ہم ایک دوسرے کے گلے لگ کر ملے۔ کوٹھری میں داخل ہونے لگے تو میں نے کمانڈو شیر باز کو ہاتھ سے پہلے روک لیا۔ وہ بولا۔

"کیا بات ہے حیدر علی! اندر کوئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "اندر ایک سانپ ہے مگر فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے یرا خیال ہے کہ وہ تمہیں بھی کچھ نہیں کہے گا۔"

"کیا مطلب؟" شیر باز نے تعجب سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "مطلب میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا۔ مگر یہ سانپ میرا ست بن گیا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ اندر آ جاؤ۔"

کمانڈو شیر باز خان کے ہاتھ میں کپڑے کا تھیلا تھا۔ میں نے تھیلا اس کے ھ سے پکڑ لیا اور خود اندر کوٹھڑی میں داخل ہوگیا۔ شیر باز نے سر آگے کر ، دیکھا۔ میں نے کہا۔

"وہ دیکھو سانپ کونے میں اسی طرح بیٹھا ہے جیسے میں اسے چھوڑ کر گیا ۔"

واقعی سانپ اسی طرح جلیبی بن کر سمٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ کمانڈو شیر باز ٹھڑی میں آگیا۔ وہ سانپ کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ بولا۔

"حیدر علی! یہ تو بڑا خطرناک جلیبی سانپ ہے یہ تمہارا دوست کہاں سے بن کیا اس نے ابھی تمہیں نہیں ڈسا؟"

میں نے کہا۔ "دیکھ لو میں تمہارے سامنے زندہ موجود ہوں۔ باقی ساری بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم میرے لیے کچھ کھانے کو لائے ہو؟"

کمانڈو شیر باز بوریئے پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"جو تھیلا تمہارے ہاتھ میں ہے اس میں تمہارے کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ڈوگرہ کیمپ سے فرار ہو کر اسی جگہ آئے ہو گے ا ابھی تک بھوکے ہو گے۔ مجھے تو آج صبح معلوم ہوا کہ تم پکڑے بھی گئے تھے ا فرار بھی ہوگئے ہو۔ اس رات میں نے صبح تک تمہارا انتظار کیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "پہلے کچھ کھا لوں۔ پھر تمہیں ساری کہانی سناؤں گا۔"

وہ حیرانی کے ساتھ پوچھنے لگا۔

"یہ بتاؤ کہ تم نے ڈوگرہ کیپٹن اور حوالدار کو کیسے ہلاک کیا؟ ان کے بدن تو لوگ کہتے ہیں پتھر بن گئے تھے۔ ایک کی گردن اور دوسرے کا بازو ٹوٹ کر الگ ہوچکا تھا۔ یہ سب کیا معمہ ہے حیدر علی؟"

میں تھیلا کھول کر اس میں سے نان تلی ہوئی مچھلی اور پانی کی بند دو بوتلیں باہر نکال چکا تھا۔ میں نے نان مچھلی کھانی شروع کر دی۔ دو تین نوالے نگلنے کے بعد شیر باز سے کہا۔

"یہ سارا کرشمہ میرے اس دوست سانپ کا ہے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ کام اسی سانپ نے دکھایا ہے۔ اگر یہ سانپ میری مدد نہ کرتا تو میں اس وقت تمہارے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔"

کمانڈو شیر باز ایک باعمل مرد میدان آدمی تھا۔ یہ دیو مالائی کہانی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ تعجب سے کبھی مجھے اور کبھی سانپ کی طرف دیکھتا۔ میں نے کہا۔

"عین وقت پر یہ سانپ کہیں سے نکل آیا اس وقت ڈوگرہ کیپٹن مجھ پر شدید تشدد کر رہا تھا۔ میری چیخیں نکل رہی تھیں۔ خدا جانے یہ سانپ کہاں سے آ گیا۔ اس نے پلک جھپکتے میں ڈوگرہ کیپٹن اور ڈوگرہ حوالدار کو ڈس دیا۔ دونوں دھڑام سے گرے۔ گرنے سے ایک کی گردن اور دوسرے کا بازو الگ

پاکستان ورچوئل لائبریری

ہوگیا۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا دونوں کے جسم پتھر کی طرح سخت ہوگئے ہوئے تھے۔"

"اس سانپ نے تمہیں کیوں نہیں ڈسا؟"

کمانڈو شیر باز کے اس سوال کا جواب میرے پاس تھا۔ مگر میں س سانپ کی ہسٹری اور کہانی کمانڈو شیر باز کو نہیں سنانا چاہتا تھا۔ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"بس یہی بات میری سمجھ میں ابھی نہیں آئی کہ اس نے مجھے کیوں نہیں ڈسا۔"

کمانڈو شیر باز خاموش ہوگیا۔ میں نے سانپ کو دیکھا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کھاتے ہوئے ڈیڑھ دو نان ختم کر دیے تھے۔ بوتل میں سے پانی پیا اور شیر باز سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ سانپ میری بات سمجھتا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" شیر باز نے کہا۔

میں نے جواب دیا۔

"اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب تم نے مجھے کوئل کی آواز کا سگنل دیا تھا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ تم آگئے ہو۔ سانپ نے بھی گردن اٹھا کر باہر کی طرف دیکھا۔ میں نے اسے کہا کہ میرا دوست آ رہا ہے۔ اسے کچھ نہ کہنا۔ وہ میرا دوست بھی ہے اور بھائی بھی ہے۔ دیکھ لو اس نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"بھائی ان سانپوں وغیرہ کے چکر میں نہ پڑو۔ اس کو باہر لے جا کر پہاڑیوں میں چھوڑ دو۔ سانپ آخر سانپ ہوتا ہے۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے صبح اسے پہاڑیوں میں چھوڑیں گے۔"

کمانڈو شیر باز مجھ سے میری داستان پوچھنے لگا کہ میں کیسے پکڑا گیا اور مجھ پر

کیا گزری؟ جب میں نے اسے اپنی ساری روداد سنائی تو اسے میری ہر بات یقین آگیا لیکن جب میں نے اپنے دوست سانپ کی کارکردگی بیان کی وہ تو ! شک کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ ایک سانپ ڈوگرہ کیمپ کی حوالات میں اچانک ک کر تمہارے دشمنوں کو ڈس کر ہلاک کر دیا۔"

میں نے کہا۔ "تم دیکھ لو۔ سانپ تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ اس نے مجھے کچھ کہا ہے نہ تمہیں کچھ کہا ہے۔ یہ میری دشمنوں کا دشمن اور دوستوں دوست ہے۔"

"بہرحال!" شیر باز بولا۔ "تم اس سے جتنی جلدی پیچھا چھڑا لو بہتر ہے سانپ کبھی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔"

پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ تمہارا ایک تھیلا کیلاش ہوٹل کے کشمیری مجا کے پاس ہے جو اس نے تمہارے ہوٹل کے کمرے سے اٹھایا تھا۔ اس میں ایک ٹین کی ڈبی میں سبز رنگ کا سفوف سا کیا ہے۔"

وہ سبز رنگ کا سفوف فرنگ پھلی کا تریاق تھا۔ میں نے شیر باز کو چونک اپنے دوست سانپ کی ہسٹری بالکل نہیں بتائی تھی اس لیے کہا۔

یہ میرے بمبئی کے دوست وزیر علی نے مجھے حکیم صاحب سے لا کر دیا تھا. یہ پیٹ درد کی دوا ہے وہ بھی ساتھ لے آتے تو اچھا تھا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"یہاں سے کس طرف جانے کا پروگرام ہے۔ میں تو کشمیر کے محاذ پر اپنے حریت پسند بھائیوں کے شانہ بشانہ ڈوگرہ فوج سے لڑنا چاہتا ہوں۔"

کمانڈو شیر باز بات کرتے ہوئے رک گیا۔ پھر بولا۔

"ایک بڑے اہم مشن کے بارے میں تم سے بات کرنی ہے لیکن پہلے یہاں سے نکل جائیں تو بات کروں گا۔"

میں نے دوبارہ سوال کیا۔

"کیا اس اہم مشن کے بارے میں تھوڑا بہت بھی نہیں بتاؤ گے۔"

کمانڈو شیر باز نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔

"سرینگر والے اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد بات کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فوج اور پولیس تو میری تلاش میں جگہ جگہ موجود ہو گی۔"

کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"اس کا میں نے کچھ انتظام کر لیا ہے جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم ڈوگرہ کیمپ سے فرار ہو گئے ہو تو میں اسی بندوبست میں لگ گیا تھا۔ کیونکہ مجھے تمہیں اپنے ساتھ کشمیر لے جانا تھا۔"

"تو پھر کیوں نہ آج رات ہی یہاں سے نکل چلیں؟"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"تمہیں کل تک انتظار کرنا ہو گا۔ میں ابھی یہاں سے واپس چلا جاؤں گا۔ کل رات کا اندھیرا ہوتے ہی تمہارے پاس آؤں گا پھر ہم دونوں یہاں سے نکل کھڑے ہوں گے لیکن اس سانپ کو یہیں چھوڑ کر جانا ہو گا۔ ہمارے ساتھ اس سانپ کا کوئی کام نہیں ہے۔ تم کمانڈو ہو کوئی سپیرے نہیں ہو۔"

اب میں شیر باز کو کیسے بتاتا کہ کبھی کبھی کمانڈو کو سپیرے کا روپ بھی بدلنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا۔

"او کے شیر باز خان۔ میں سانپ کو یہیں پہاڑیوں میں چھوڑ دوں گا۔ ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کل اندھیرا ہوتے ہی یہاں پہنچ جانا اور اپنے کشمیری مجاہد سے میرے پیٹ درد کی دوائی یعنی سفوف والی ڈبی ضرور لیتے آنا۔ کبھی کبھی میرے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔"

"لیتا آؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تھیلے میں تمہارے کل تک کے لیے

کھانا موجود ہے اور پانی کی ایک فالتو بوتل بھی ہے۔"

اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے دوست سانپ نے کئی روز سے دودھ نہیں پیا۔ اسے دودھ پلانا چاہیے۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"اگر ہو سکے تو تھوڑا سا دودھ بھی بوتل میں ڈال کر لے آنا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دوست سانپ کو تھوڑا دودھ پلا کر رخصت کروں۔"

کمانڈو شیر باز نے کسی قدر جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"حیدر علی! کیا بچوں ایسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا اب تم سانپ پالو گے؟ دفع کرو اس سانپ کو۔ یہ سانپ جنگل میں سب کچھ کھا پی لیتے ہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں کل اندھیرا ہوتے ہی آ جاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔"

کمانڈو شیر باز کے جانے کے بعد میں نے کونے میں بیٹھے ہوئے سانپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرے دوست! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں جو کچھ تمہیں کہتا ہوں وہ تم سمجھ لیتے ہو۔ سب سے پہلے تو میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے میری بات کی عزت رکھی اور میرے دوست کمانڈو شیر باز کو کچھ نہیں کہا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم نے یہ بھی سن لیا ہو گا کہ کمانڈو شیر باز تمہیں مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ میں تمہیں یہاں جموں کی پہاڑیوں میں چھوڑ جاؤں۔ لیکن میں تم سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔ میں تمہیں جب تک میری اور تمہاری زندگی ہے' اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔"

سانپ جلیبی کی طرح زمین پر پڑا تھا۔ جب میں نے اسے کہا کہ میں تمہیں ساری زندگی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں تو میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی گردن اوپر اٹھا لی اور میری طرف دیکھ کر سر کو دوبارہ جھکا دیا۔ جیسے میرا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ میں دل میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا کہ یہ کس زمین کا سانپ ہے کہ میری ایک ایک بات کا مطلب سمجھ رہا ہے۔ میں نے کہا۔

"تم نے مجھے ڈوگروں کی اذیت ناک قید سے رہائی دلا کر مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں اسے کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ویسے بھی مجھے تم سے انس ہو گیا ہے۔ میں اس دوستی کو ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے کمانڈو شیر باز کی دوستی بھی بڑی عزیز ہے۔ ہم اسلام کی سربلندی' کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے مشن پر نکلے ہوئے ہیں اور اپنی جان کی بازی لگا کر اس مشن کی تکمیل کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنا یہ مشن اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اب میں ایسا کروں گا کہ کل رات جب ہم یہاں سے نکلیں گے تو میں تمہیں اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ تم مجھے کاٹو گے تو نہیں نا؟ ویسے کاٹ بھی لو گے تو مجھ پر تمہارے زہر کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔"

میں ہنسنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ سانپ نے دو تین بار اپنی گردن کو میرے سامنے جھکایا اور آہستہ آہستہ منہ سے پھنکار کی آوازیں نکالیں اس کا مطلب ایسا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ میں تو تمہارا خادم ہوں۔ میں اپنے مالک کو کیسے ڈس سکتا ہوں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اپنی جیب میں ڈال کر غار سے لے چلوں گا اور باہر پہاڑیوں میں جا کر چھوڑ دوں گا۔ تم تیزی سے چلے جانا۔ لیکن مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ میں جہاں بھی جاؤں گا میرے ساتھ رہو گے۔ البتہ جب کمانڈو شیر باز میرے پاس موجود ہو تو تم سامنے نہیں آؤ گے کیا تم سمجھ گئے ہو؟"

سانپ نے اسی طرح ایک بار پھر سر کو تین بار جھکایا اور منہ سے دھیمی دھیمی پھنکاروں کی آواز نکالی اور خاموش ہو گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا دوست! شب بخیر! اب میں سونے لگا ہوں۔ تم پہرہ دیتے رہنا۔ کوئی دشمن آ گیا تو مجھے جگا دینا یا اسے ختم کر دینا۔ جموں کی ساری سول اور ملٹری پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"

اس کے بعد میں وہیں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ سیر ہو کر کھانا کھایا تھا۔ اس کی خماری چڑھی تو مجھے فوراً نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو موم بتی ساری کی ساری پگھل کر بجھ چکی تھی۔ کوٹھڑی میں دروازے کے شگاف میں سے دن کی روشنی آ رہی تھی۔ میری نظریں کونے کی طرف گئیں۔ سانپ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ جنگل میں کچھ کھانے پینے کے لیے نکل گیا ہوگا۔ میری طبیعت کافی بہتر ہو گئی تھی۔ جسم کی ٹیسیں غائب ہو چکی تھیں۔ میں نے تھیلے میں سے رات کے نان اور بھنی ہوئی مچھلی نکال کر تھوڑی کھائی۔ بوتل میں سے پانی پیا اور اٹھ کر غار کے دہانے پر آ گیا۔ باہر دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی۔ میرے پاس گھڑی وغیرہ نہیں تھی۔ سامنے چھوٹا سا سنگلاخ میدان خالی پڑا تھا۔

اچانک مجھے کسی چوپائے کے آہستہ آہستہ ڈکرانے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہوگیا۔ یہ کسی بھینس یا گائے کی آواز تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی گوالا یہاں آس پاس موجود ہے جو گائے بھینسوں کو چرا رہا ہے۔ آواز آہستہ آہستہ مسلسل آ رہی تھی۔ اس آواز میں خوف اور دہشت کا ملا جلا تاثر تھا۔ میرے دل میں اچانک ایک خیال آگیا میں جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر جس طرف پہاڑی کی ڈھلان تھی آہستہ آہستہ چل کر اس طرف آ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈھلان پر ایک گائے کھڑی ہے۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور اس کے حلق سے دہشت ناک آواز نکل رہی ہے۔ میں جلدی سے اتر کر گائے کے پیچھے آ گیا۔ میرا قیاس بالکل درست نکلا۔ میرا دوست سانپ گائے کے تھن سے چمٹا ہوا اس کا دودھ پی رہا تھا۔ میں نے اسے بالکل آواز نہ دی اور وہیں سے الٹے قدم چل کر اوپر آ گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا تھا کہ سانپ اپنے دودھ کا انتظام کہاں سے کرتا تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مجھے وہاں نہ کوئی گوالا نظر آیا اور نہ کوئی دوسری گائے ہی دکھائی دی۔ یہ کوئی آوارہ گائے تھی جو چرتی چراتی اس طرف نکل آئی تھی اور سانپ اس سے چمٹ کر اس کے

دودھ سے پیٹ بھرنے لگا۔

میرا وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ کوئی بھی شخص گائے کے ڈکرانے کی آواز سن کر ادھر آ سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گائے کو ہندو لوگ اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہیں اور اس کی بڑی عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اس کی بڑی ٹہل سیوا کرتے ہیں۔ گائے کو اگر کوئی تکلیف ہو تو اپنا سب کچھ بھول کر اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ میں پہاڑی درے میں سے ہوتا ہوا واپس اپنی غار والی کمین گاہ میں آگیا۔ اب مجھے رات ہونے کا شدت سے انتظار تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد لیٹا تھا۔ دوبارہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں سوگیا۔ اس بار سو کر اٹھا تو غار کی چھت سے آنے والی روشنی غائب ہو چکی تھی۔ یعنی باہر شام کا وقت ہوگیا تھا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر جہاں ماچس رکھی ہوتی تھی وہاں سے ماچس اٹھائی اور نئی موم بتی جلائی۔ کوٹھڑی میں روشنی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ سانپ کونے میں اسی طرح جلیبی بن کر پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پیٹ بھر کے دودھ پینے کے بعد اسے بھی خماری چڑھ گئی تھی اور وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اسے نہ جگایا اور دیوار پر سے اپنی بلکہ شیرباز کی جیکٹ اتار کر پہن لی۔

کمانڈو شیرباز نے کہا تھا کہ وہ اندھیرا ہوتے ہی آ جائے گا۔ ابھی باہر رات نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی میں غار کے دہانے پر جھاڑیوں کی دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہوگیا۔ میرے حساب سے باہر رات پڑ چکی تھی۔ یہ شام کا اندھیرا نہیں تھا۔ رات کا ابتدائی اندھیرا تھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے خاکے اندھیرے میں جذب ہو رہے تھے۔ میں واپس کوٹھڑی میں آگیا۔ سانپ اسی طرح گہری نیند سو رہا تھا۔ میرا اس سے عارضی طور پر جدا ہونے کا وقت آگیا تھا۔ مجھے اس سے الگ ہونے کا کوئی غم وغیرہ بالکل نہیں تھا۔ بس یہ خیال تھا کہ یہ سانپ میرے مشن میں میرے بڑے کام آ سکتا تھا اور اب پتہ نہیں مجھ سے الگ ہو کر مجھ سے

پھر ملنا بھی ہے یا نہیں۔ اگر مجھ سے ملنا بھی چاہے تو اس کے ساتھ کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے اور وہ ہلاک ہو سکتا ہے۔

کمانڈو شیر باز کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ مجھے سانپ کو اٹھا کر جیب میں ڈالنا تھا۔ میں اس مرحلے سے بھی گزرنا چاہتا تھا۔ میں نے سانپ کو آواز دی۔

"دوست! جاگ رہے ہو یا سو رہے ہو؟"

سانپ نے اپنی گردن اٹھا لی۔ "کمال ہے۔ یہ سانپ میری آواز باقاعدہ سن رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اب ہم دونوں کا ایک دوسرے سے عارضی طور پر جدا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ میں تمہیں اٹھا کر جیب میں ڈال رہا ہوں تاکہ تمہیں غار سے باہر نکل کر پہاڑیوں میں چھوڑ دوں۔ تم مجھے ڈسنے کی کوشش تو نہیں کرو گے نا؟"

سانپ نے دوبارہ اپنے سر کو جھکا دیا۔ مجھے حوصلہ ہوا۔ میں نے آہستہ آہستہ قدم اٹھایا اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ سانپ نے کوئی حرکت نہ کی، کوئی پھنکار تک نہ ماری۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ سانپ اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ میں نے آہستہ سے اپنی انگلی اس کے سر پر رکھ دی۔ اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ میں نے اسے بڑی آہستگی سے اپنی ہتھیلی پر اٹھا لیا۔

"میرے دوست! مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ملتے رہو گے۔ جب تک زندہ ہو مجھ سے ملتے رہو گے۔ مگر کمانڈو شیر باز کی موجودگی میں مجھ سے دور رہو گے۔ ہاں اگر کوئی خطرناک حالات پیدا ہو گئے تو جس طرح تم میری مدد کرتے رہے ہو۔ اسی طرح کمانڈو شیر باز کی بھی مدد کرو گے کیونکہ ہم صرف خدا کی رضا کے لیے جہاد کر رہے ہیں۔ ہماری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔"

سانپ نے اپنی چھوٹی سی سری کو دائیں بائیں اس طرح ہلایا جیسے کہہ رہا ہو۔ "ایسا ہی کروں گا دوست! ایسا ہی کروں گا۔"

میں نے کہا۔ "اب میں تمہیں اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال رہا ہوں۔

وہاں تمہیں سردی بھی نہیں لگے گی اوکے؟"

سانپ میری ہتھیلی پر کنڈلی مارے ساکت بیٹھا تھا۔ واقعی یہ ذہین ترین سانپ بالکل بالشت بھر کا سانپ تھا۔ رنگ بھورا تھا اور سرخ آنکھیں چھوٹے نگینوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے سانپ کو اپنی ہتھیلی پر ہی بٹھائے رکھا اور کہا۔

"جب تک میرا دوست نہیں آ جاتا میں تم سے باتیں کروں گا۔ افسوس یہ ہے کہ تم میری کسی بات کا جواب نہیں دے سکتے۔ مجھے یہ تو معلوم ہوگیا ہے کہ تم صرف میری آواز ہی نہیں سنتے بلکہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سمجھتے بھی ہو۔ کاش تم بول بھی سکتے۔ یا کم از کم تم زبان میں بات کرتے ہو وہ زبان مجھے سمجھا دیتے تو بات ضرور ہو۔ تمہاری ہلکی ہلکی پھنکاریں کہہ رہی ہوتی ہیں کہ تم کوئی بات کر رہے ہو مگر صد افسوس کہ تم میری زبان میں مجھ سے بات نہیں کر سکتے۔"

اچانک سانپ نے اپنی گردن گھما کر کوٹھڑی کے شگاف کی طرف دیکھا۔ اس کے اس قسم کے اشارے اب میں سمجھنے لگا تھا۔ اس کا اس طرح اچانک ایک طرف دیکھنے کا مطلب تھا کہ اس نے کسی اجنبی کی بو سونگھ لی ہے۔ کوئی آ رہا ہے۔ اس کے فوراً بعد کوئل کے بولنے کی آواز آئی۔ یہ کمانڈو شیر باز خان کا سگنل تھا۔ سانپ سچا تھا' شیر باز آگیا تھا۔ میں نے کوٹھڑی سے باہر نکل کر کوئل کی آواز منہ سے نکال کر اس کے سگنل کا جواب دیا اور کوٹھڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے سانپ سے کہا۔

"اچھا دوست! اب میری جیب میں جا کر آرام کرو۔"

میں نے سانپ کو جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ غار میں قدموں کی آواز آئی اور پھر کمانڈو شیر باز اندر آگیا۔ کہنے لگا "آ جاؤ حیدر علی! سب ٹھیک ہے۔"

میں نے موم بتی بجھائی اور شیر باز کے ساتھ غار سے باہر آگیا۔ ہم دو

پہاڑی ٹیلوں کے درمیانی راستے سے گزر رہے تھے کہ کمانڈو شیر باز نے پوچھا۔

"وہ سانپ کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "میری جیب میں ہے۔"

"لا حول ولا قوہ"

کمانڈو شیر باز وہیں رک گیا۔

"بھائی اس کو جیب میں ڈال کر کہاں لے جا رہے ہو۔ یہیں پھینک دو اسے۔"

میں نے جیب سے سانپ نکال کر ہتھیلی پر رکھا اور اسے کہا۔

"دوست! خدا حافظ!"

اور میں نے ہتھیلی نیچے کر کے سانپ کو چھوڑ دیا۔ اندھیرے میں سانپ میری ہتھیلی سے اچھل کر نیچے گرا اور غائب ہو گیا۔ شیر باز بولا۔

"آ جاؤ' دیر نہ کرو۔ ہمارے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ ہمارے دو آدمی ٹیلے کی دوسری طرف جیپ لے کر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

ہم ایک پہاڑی کے پہلو سے ہوتے ہوئے دوسرے ٹیلے کے دامن میں آ گئے۔ اندھیرے میں ہمیں ہر شے سائے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ مجھے سانپ کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ہم سے دور رہ کر ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ جب ہم جیپ میں بیٹھ کر سفر شروع کریں گے تو سانپ بہت پیچھے رہ جائے گا لیکن میں جہاں بھی چلا جاؤں گا میرا دوست سانپ میرے جسم کی بو پا کر وہاں ایک نہ ایک دن ضرور پہنچ جائے گا۔"

ٹیلے کی دوسری جانب اندھیرے میں مجھے دو آدمی کھڑے نظر آئے۔ ان کے قریب ہی ایک گاڑی کھڑی تھی۔ قریب جا کر دیکھا کہ وہ ایک جیپ تھی جس پر ترپال کی چھت پڑی تھی۔ کمانڈو شیر باز نے وہاں پہنچتے ہی کہا۔

"او کے' رحمان بٹ چلو۔"

ہم جیپ کے پیچھے بیٹھ گئے۔ ہمارے دونوں گائیڈ جیپ کی اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ جیپ کا انجن سٹارٹ ہوا اور رات کے اندھیرے میں جموں کی نیم خشک پہاڑیوں میں ہمارا سفر شروع ہوگیا۔ ہمارے گائیڈ کو راستے کا علم تھا۔ یہ کچا پہاڑی رستہ تھا جو پہاڑیوں اور ٹیلوں کے درمیان سے اور کبھی ان کے اوپر سے ہو کر جاتا تھا۔ کبھی درختوں کے جھنڈ آ جاتے۔ ہماری جیپ ان جھنڈوں کے نیچے سے آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ کبھی بالکل سپاٹ سنگلاخ زمین آ جاتی۔ اندھیرے میں آسمان پر تارے چمکتے دکھائی دیتے۔ جیپ چھوٹے چھوٹے پتھروں پر اچھلتی ہوئی چل رہی تھی۔ جیپ کا عقبی حصہ کھلا تھا جہاں سے سرد ہوا آ رہی تھی۔ میں اور کمانڈو شیر باز ایک دوسرے کے آمنے سامنے والی نشستوں پر ہاتھ بغلوں میں دے کر بیٹھے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"راستے میں کوئی چیک پوسٹ تو نہیں آئے گی؟"

شیر باز بولا۔

"ہم پہاڑیوں کے درمیان سے ہو کر جا رہے ہیں۔ یہ راستہ لمبا ضرور ہے مگر اس طرف ایسی کوئی سڑک نہیں ہے جس پر چیکنگ پوسٹ کا خطرہ ہو۔ ویسے اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہوگئی تو میں نے پستول اپنے پاس رکھ لیا ہے۔"

"مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

شیر باز نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"میرے پاس کوئی دوسرا پستول تو اس وقت نہیں ہے یہ چاقو تم اپنے پاس رکھ لو۔"

اس نے مجھے جیب سے بڑا کمانڈو چاقو نکال کر دے دیا۔ جسے میں نے جیب میں رکھ لیا۔ جیپ میں ہمیں جو دھچکے لگ رہے تھے وہ بتا رہے تھے کہ گاڑی دشوار گزار پہاڑی علاقے سے گزر رہی ہے۔ جیپ کے اوپر ترپال کی چھت اس طرح ڈالی گئی تھی کہ صرف آگے اور پیچھے کا حصہ کھلا تھا جہاں سے سرد ہوا آ

رہی تھی۔ جیپ کبھی نشیب میں اترنے لگتی۔ کبھی چڑھائی چڑھنا شروع کر دیتی۔ کہیں میدان آ جاتا اور جیپ بالکل ہموار ہو کر چلنے لگتی۔

رات کے تین بجے تک جیپ اسی طرح پہاڑی اور میدانی علاقوں میں چلتی رہی۔ اس دوران ایک بار شیر باز خان سو گیا۔ اندھیرے میں مجھے اس کے سونے کا اس طرح پتہ چلا کہ میں نے اسے آواز دی تو وہ نہ بولا۔ دوسری بار میں بھی سو گیا۔ اگلی نشستوں پر ہمارے دونوں کشمیری گائیڈ بڑے ہوشیار ہو کر بیٹھے تھے۔ جو مجاہد جیپ چلا رہا تھا وہ بڑا ماہر ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ اسے پہاڑی رستوں سے پوری واقفیت تھی۔ ایک جگہ موڑ کاٹ کر جیپ ٹیلے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت کمانڈو شیر باز گردن ڈھلکائے سو رہا تھا۔ جیپ کے رکنے سے ہلکا سا دھچکا لگا تو وہ بولا۔

"رحمان بٹ! کیا ہوا؟"

رحمان بٹ گاڑی کا انجن بند کرتے ہوئے بولا۔

"خواجہ صاحب! ستیل واڑی پہنچ گئے ہیں۔"

میں جاگ رہا تھا۔ شیر باز نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نیچے آ جاؤ۔"

معلوم ہوا کہ یہاں سے آگے خچروں پر سفر کرنا ہو گا۔ رحمان بٹ ہمیں وہیں چھوڑ کر اندھیرے میں ٹیلوں کی طرف چلا گیا۔ شیر باز بولا۔

"اپنا ایک آدمی خچر لے کر یہاں آ گیا ہو گا۔ ہمیں اگلا سارا دن خچروں پر بیٹھ کر سفر کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "ہم اس وقت کون سے علاقے میں ہیں۔"

کمانڈو شیر باز نے مجھے علاقے کے بارے میں بتایا۔ جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ یہ مجاہدین کشمیر کا وادی سے جموں تک خفیہ پہاڑی راستہ ہے جہاں سے وہ ضرورت کے وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی اسی

راستے سے آتے جاتے تھے اور آج بھی اسی خفیہ پہاڑی راستے کو استعمال کرتے ہیں کیونکہ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ کشمیری مجاہد اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد رحمان بٹ پچھلی رات کے دھندلے اندھیرے میں نمودار ہوا۔ وہ خچر پر بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے تین خچر ایک قطار میں چلے آ رہے تھے۔ ہم خچروں پر بیٹھ گئے اور آگے چل پڑے۔ آگے آگے ہمارا گائیڈ رحمان بٹ تھا۔ اس کے پیچھے اس کے ساتھ کشمیری مجاہد تھا۔ اس کی پیچھے کمانڈو شیر باز کا خچر تھا۔ سب سے پیچھے میرا خچر چلا آ رہا تھا۔ میدانی علاقہ تقریباً ختم ہوگیا تھا اور وادیاں گھاٹیاں شروع ہوگئی تھیں۔ ہم اس طرح سفر کر رہے تھے کہ ایک پہاڑی کے گرد چکر لگا کر اوپر چڑھتے اور پھر دوسری طرف سے نیچے اتر کر دوسری پہاڑی کی چڑھائی شروع ہو جاتی۔ رستہ بڑا خطرناک تھا۔ پہاڑی پگ ڈنڈی تھی جو پہاڑی کی دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ اس کی دوسری جانب گہری گھاٹی تھی۔ خچر ان راستوں پر چلنے کے ماہر تھے۔ رات کو ہم اس لیے سفر کر رہے تھے کہ یہ حساس علاقہ تھا اور انڈین آرمی کے فوجی کانوائے ان پہاڑیوں پر سے گزرتے رہتے تھے۔

سورج نکلنے کے بعد ہم ایک وادی میں پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے دوپہر تک آرام کیا۔ کھانا وغیرہ بھی وہیں پکا کر کھایا اور خچروں پر سوار ہو کر آگے چل پڑے۔ ہم کشمیری کی وادی میں داخل ہو چکے تھے اگرچہ سری نگر وہاں سے ابھی کافی دور تھا۔ اسی طرح سفر کرتے ہم تین دن کے بعد مقبوضہ کشمیر کی جنت نظیر وادی میں آ گئے۔ یہاں سے ہمارے دونوں گائیڈ ہم سے جدا ہو گئے اور ایک نیا کشمیری مجاہد ہماری راہ نمائی کے لیے آ گیا۔ شام کے وقت ہم کشمیر کی سرد فضاؤں میں پہاڑی جنگل میں سے گزرتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں نیچے گہری کھائی تھی۔ ہم خچروں پر سوار تھے۔ ہمارا گائیڈ ہمیں ایسے راستے سے لے جا رہا تھا جہاں ڈھلان زیادہ سیدھی نہیں تھی۔ گھاٹی جہاں ختم ہو گئی وہاں ایک پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ چھوٹا سا نالہ تھا۔ سرد پانی پتھروں سے ٹکرا کر اچھل اچھل کر بہہ رہا تھا۔ ہم نے خچروں پر بیٹھے بیٹھے نالہ پار کیا۔ آگے پھر تھوڑی چڑھائی آ گئی۔ بڑے بڑے زنگ آلود پتھر اور بڑی بڑی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ اوپر اخروٹ اور بادام کے گھنے درختوں نے چھت ڈال رکھی تھی۔ یہاں ہم خچروں پر سے اتر گئے۔ ہمارا گائیڈ خچر لے کر واپس چلا گیا۔

میں اور شیر باز اکیلے رہ گئے۔ شیر باز نے کہا۔

”ہم اپنے خفیہ ٹھکانے سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی ہیں۔“

اونچی اونچی دیو پیکر چٹانوں کے درمیان سے گزرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ سامنے درختوں میں لکڑی کا ایک شکستہ سا مکان ہے جس کی ڈھلانی چھت پر

گھاس پھوس پڑا ہے۔ چھوٹے سے صحن میں ایک بوڑھا کشمیری فرن اپنے جسم کے گرد لپیٹے کانوں تک گرم اونی ٹوپی پہنے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کمانڈو شیر باز کو سلام کیا اور کشمیری میں کہا۔

"خواجہ صاحب! راستے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

میں تھوڑی تھوڑی کشمیری زبان سمجھ لیتا تھا۔ بول نہیں سکتا تھا۔ بس مطلب نکال لیتا تھا۔ شیر باز بوڑھے سے کشمیری میں باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے بوڑھے کشمیری سے میرا تعارف کروایا۔ ہم لکڑی کے مکان کے چھوٹے سے بوسیدہ کمرے میں آ گئے۔ یہاں درمیان میں انگیٹھی پڑی تھی جو بجھی ہوئی تھی۔ بوڑھے کشمیری نے جس کا نام قادر بٹ تھا اسی وقت انگیٹھی میں کوئلے جلا دیے۔ ہمارے لیے وہ کشمیری چائے سماوا میں تیار کرنے لگا۔ میری جیکٹ کی جیب میں میرا دوست سانپ خاموشی سے آرام کر رہا تھا۔ راستے میں میں اسے دیکھ لیتا تھا۔ ایک جگہ میں نے اسے جنگل میں سیر کے لیے چھوڑ بھی دیا تھا مگر اس کے قریب منہ لے جا کر اسے تاکید کر دی تھی کہ وہ جنگل میں زیادہ دور نہ جائے اور جلدی واپس آ جائے۔

سانپ واقعی جلدی واپس آ گیا تھا۔

کمانڈو شیر باز کو معلوم نہیں تھا کہ میں سانپ کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ سانپ بھی میرے ساتھ پوری دوستی نبھاہ رہا تھا سفر کے دوران اس نے ایک جگہ بھی نہ تو اپنا سر میری جیکٹ کی جیب سے باہر نکالا تھا اور نہ ہلکی سی پھنکار ہی ماری تھی۔ خدا جانے وہ کیسے سمجھ گیا تھا کہ میں اسے اپنے دوست شیر باز خان سے چھپا کر لیے جا رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے زبانی اسے کہہ دیا تھا کہ کمانڈو شیر باز پر یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ تم میری جیب میں ہو اور میرے ساتھ سفر کر رہے ہو لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ سانپ حسب معمول میری گفتگو اور الفاظ کو پوری طرح سمجھ گیا تھا اور میں حیران تھا کہ وہ یہ سب کچھ کیسے سمجھ گیا ہے۔ ہم

نے دوپہر کا کھانا اسی مکان کی کوٹھی میں کھایا' چائے پی۔ اسی دوران رات گہری ہوگئی تھی۔ کمانڈو شیر باز نے تھیلے میں سے وہ ڈبی نکال کر مجھے دکھائی جس میں سانپ کے تریاق کا سفوف تھا۔ کہنے لگا۔

"تمہاری دوائی اسی تھیلے میں پڑی ہوگی۔ تھیلا اس کوٹھڑی میں ہی ہوگا۔ اب میرے ساتھ آؤ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

مکان کے باہر کوئی لیمپ روشن نہیں تھا۔ اندھیرا بڑا گہرا تھا لیکن ہم لوگ اس اندھیرے کے عادی ہوگئے تھے اور اس اندھیرے میں بھی ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے اور راستہ تلاش کر لیتے تھے۔ اس مکان کے پیچھے ایک پگ ڈنڈی نیچے چھوٹی سی گھاٹی اترتی تھی۔ گھاٹی کی دوسری طرف ذرا اوپر کر کے درختوں کی کٹی ہوئی سوکھی شاخوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس ڈھیر کے پیچھے سے ایک تنگ اور نظر نہ آنے والا راستہ لکڑی کے ڈبہ نما چھوٹے سے کیبن میں آ جاتا تھا۔ اسی کیبن میں بھی خشک گھاس کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ گھاس کے ڈھیر کے پیچھے کھلی جگہ تھی جہاں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ لالٹین کی بتی کافی نیچی کی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہاں روشنی دھندلی اور معمولی سی تھی۔

لکڑی کے فرش پر نمدہ بچھا ہوا تھا۔ دو پرانے لحاف بھی پڑے تھے۔ ہم جوتے اتار کر لحافوں میں گھس کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیر باز بولا۔

"تم جیکٹ کیوں نہیں اتارتے؟ اسے اتار کر دیوار سے لٹکا دو۔ سردی روکنے کے لیے یہ لحاف کافی ہے۔"

میں جیکٹ اس لیے نہیں اتارتا تھا کہ اس کی جیب میں میرا دوست سانپ تھا۔ جب شیر باز نے بہت مجبور کیا تو اس خیال سے کہ اسے کوئی شک نہ پڑے میں نے جیکٹ اتاری اور دیوار پر کیل کے ساتھ لٹکا دی۔ ساتھ ہی سرگوشی میں جیب کے قریب منہ لے جا کر سانپ سے کہا۔

"دوست! اب راز کو راز ہی رکھنا باہر مت نکلنا۔"

شیر باز خان نے جلدی سے آواز دی۔ میں جلدی سے واپس مڑ کر بولا۔

"تمہارے کان بج رہے ہیں شیر باز خان میں سوائے تمہارے یہاں اور کس سے بات کر سکتا ہوں۔ اب مجھے بتاؤ وہ کون سی خاص بات ہے جو تم مجھ سے کرنا چاہتے ہو۔"

میں شیر باز کے پاس ہی اپنے لحاف کو اوپر کر کے بیٹھ گیا۔ لالٹین بڑی مدھم جل رہی تھی۔ کہنے لگا۔

"یہاں ہم موم بتی اس لیے نہیں جلاتے کہ آگ لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے لالٹین ہی رات کو جلاتے ہیں۔ مگر اسے بھی مدھم رکھتے ہیں اور باہر لے کر نہیں جاتے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو میں سمجھ گیا ہوں لیکن تم کسی خاص مسئلے پر مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو۔ میں وہ مسئلہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

کمانڈو شیر باز گہرا سانس بھر کر بولا۔

"بات یہ کہ حیدر علی کہ تمہیں تو معلوم ہی ہے بھارت نے اپنی فوج لاکھوں کی نفری میں یہاں بھیج کر کشمیر پر زبردستی قبضہ کیا ہوا ہے اور ہم کشمیری اپنی آزادی اور بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف بھارت کی سرکار کا بھی بے پناہ بجٹ کشمیر میں بھیجی ہوئی فوج پر خرچ ہو رہا ہے۔ بھارت سرکار کشمیر پر قبضہ بھی رکھنا چاہتی ہے لیکن زیادہ دیر تک اخراجات بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے اپنے ملک بھارت مین غریب عوام بھوکوں مر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کوئی ایسا طریق کار وضع کرنا چاہتی ہے کہ بھارت کا کشمیر پر زبردستی کا قبضہ بھی برقرار رہے اور یہ جنگ بھی ختم ہو جائے۔"

میں نے پوچھا۔

"اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے جو کشمیریوں کا جائز مطالبہ بھی ہے کہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دے دیا جائے۔"

کمانڈو شیر باز بولا۔
"یہی تو بھارتی حکومت نہیں چاہتی۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ کشمیری مسلمان بھارت سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ بھارت نے آرمی کی مدد سے ان کے ملک کشمیر پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔"
"تو پھر اور کیا طریقہ بھارت کی سرکار سوچ رہی ہے۔"
کمانڈو شیر باز نے سر کو آہستہ سے ہلاتے ہوئے غور و فکر کے انداز میں بولا۔
"ہمیں یہی معلوم کرنا ہے تم سمجھ لو کہ یہی ہمارا اگلا مشن ہے۔"
"وہ تم کھل کر بات کرو شیر باز خان۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔"
شیر باز خان بولا۔
"بات یہ ہے حیدر علی کہ ہمارے مخبروں نے ہمیں خبر دی ہے کہ یہاں سے ساٹھ ستر میل جنوب مشرق کی جانب جو ایک گھنا پہاڑی جنگل ہے اور جہاں ایک چھوٹی سی جھیل بھی ہے وہاں پر اسرار قسم کی فوجی سرگرمیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ رات کے اندھیرے میں فوجی ٹرک آتے ہیں اور چھوٹے بڑے لوہے اور لکڑی کے کریٹ اتار کر چلے جاتے ہیں۔ یہ کریٹ رات کے اندھیرے میں ہی کسی خفیہ جگہ پر اسی پہاڑی جنگل میں منتقل کر دیے جاتے ہیں۔ دن کے وقت یہاں چاروں طرف خاموشی چھائی رہتی ہے نہ کوئی فوجی یا دوسرا ٹرک نظر آتا ہے اور نہ کوئی فوجی جوان یا سویلین آدمی چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ دن کے وقت ہمارے آدمی گوالوں اور دیہاتیوں کے بھیس میں بکریاں وغیرہ چرانے کے بہانے اس علاقے میں کئی بار گھوم پھر آتے ہیں۔ مگر انہیں وہاں کوئی ایسا سراغ نہیں ملا جس سے یہ ظاہر ہو کہ رات کو یہاں فوجی ٹرکوں پر سے کوئی سامان اتار گیا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ جو سامان اتارا جاتا ہے وہ کس جگہ پر رکھا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ ”ہمارے کسی آدمی کو رات کے وقت وہاں چھپ کر معلوم کرنا چاہیے کہ فوجی ٹرکوں سے جو سامان اتارا جاتا ہے وہ کہاں لے جایا جاتا ہے۔“

شیر باز کہنے لگا۔

”رات کے وقت جب فوجی ٹرک ان پہاڑیوں میں آتے ہیں تو فوج کی پوری رجمنٹ اس علاقے کو گھیرے میں لے لیتی ہے۔ جگہ جگہ ایسے حساس آلات لگا دیے جاتے ہیں کہ اگر کوئی چوہا بھی رینگ کر آگے جانے کی کوشش کرے تو فوراً پتہ چل جاتا ہے اور فوج کی پٹرول پارٹیاں ٹھیک اسی جگہ کو نشانہ بنا کر مشین گن کی فائرنگ شروع کر دیتی ہے۔ ہمارے آدمی راتوں کو اس علاقے میں سراغ رسانی کرنے گئے تھے مگر انہیں حساس آلات کا چونکہ پہلے سے علم ہو چکا تھا اس لیے خطرناک لائن سے پیچھے رہ کر اندھیرے میں ماحول کا جائزہ لیتے رہے۔ کئی بار رات کے اندھیرے میں کوئی لومڑ، مرغی، گیدڑ یا کوئی دوسرا جنگلی جانور حساس آلات کی لائن پار کر کے جیسے ہی گزرا اس پر مشین گن کی بوچھاڑیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ ہمارے آدمیوں کو دن کے وقت وہاں کئی مرے ہوئے جنگلی جانوروں کی لاشیں ملی ہیں۔“

”ہو سکتا ہے پہاڑیوں میں کوئی خفیہ ایمونیشن ڈپو بنایا جا رہا ہو۔“

شیر باز نے کہا۔

”ایمونیشن ڈپو بنانے کے واسطے سیکورٹی کے اتنے سخت انتظام نہیں کیے جاتے۔ ہمارے خدشات کی اس بات سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارے ایک مجاہد نے سری نگر ملٹری پولیس کے ہیڈ کوارٹر سے ہمیں ایک ایسا کاغذ لا کر دیا ہے جو اس نے وہاں کی ٹاپ سیکرٹ فائیل سے فوٹو کاپی کر لیا تھا۔ اس کاغذ پر ایک نقشہ بنا ہوا ہے جس میں اونچے نیچے گہرے بنکرز لمبی لمبی چکی دار وادیاں اور تین سرنگیں دکھائی گئی ہیں۔ کاغذ پر انگریزی میں کچھ نمبر بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے

علاوہ اور کچھ نہیں لکھا ہوا۔ اس نقشے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انڈین آرمی یہاں پہاڑیوں کے اندر کوئی ایمونیشن ڈپو یا ایمونیشن ڈمپ نہیں بنا رہی بلکہ زیر زمین کوئی پر اسرار پراجیکٹ بنا رہی ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ انڈین آرمی کا یہ خفیہ پراجیکٹ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پراجیکٹ کا مقصد کشمیری حریت پسندوں کی سرگرمیوں کو کچلنا اور کشمیری مجاہدین پر کوئی زبردست حملہ کرنا ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انڈین آرمی ہائی کمان آزاد کشمیر پر حملے کا ناپاک منصوبہ تیار کر رہی ہو۔ بہرحال یہ سب کچھ ابھی تک ایک سربستہ راز ہی ہے۔ ہمیں اس راز کو بے نقاب کر کے معلوم کرنا ہے کہ اس پہاڑی جنگل کے زیر زمین کیا ہو رہا ہے۔"

میں بھی سوچنے لگا کہ اگر واقعی انڈین آرمی کوئی اس قسم کا خطرناک منصوبہ تیار کر رہی ہے تو یہ تو پاکستان کے لیے بھی خطرے کی علامت ہے۔ پہلا فیصلہ تو میں نے یہ کیا کہ پاکستان میں بٹ صاحب کو اس خطرناک بھارتی منصوبے سے آگاہ کر دیا جائے۔ میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ اس خطرناک زیر زمین پراجیکٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمیں خود میدان میں نکلنا ہوگا۔"

شیر باز نے کہا۔

"حیدر علی! میں نے اس پر بھی کافی غور کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی ایسا کمانڈو مشن نہیں ہے کہ جس کا ٹارگٹ ہمارے سامنے ہو اور ہم شب خون مار کر ٹارگٹ کو تباہ کر کے آ جائیں لیکن ہمیں تو ٹارگٹ نظر ہی نہیں آ رہا۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ٹارگٹ کیا ہے اور کس نوعیت کا ہے۔ یہ خاص سراغ رسانی اور جاسوسی کا مشن ہے۔ اس کے لیے ہمیں کمانڈوز کی دلیری اور جرات مندی کی بجائے جاسوسوں والی چالاکی اور عیاری کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔ ”اس کے لیے میں تیار ہوں۔ میں اتنا اچھا کمانڈو نہیں ہوں جتنا اچھا جاسوس اور سراغ رساں ہوں۔ تم صرف اپنے مخبروں سے یہ معلوم کروانے کی کوشش کرو کہ اس خفیہ فوجی پراجیکٹ کا کلیدی افسر کون ہے۔ یعنی کس فوجی افسر کی زیر قیادت اس پراجیکٹ پر کام ہو رہا ہے۔ اس فوجی افسر کا نام کیا ہے اس کی بیوی کا نام کیا ہے۔ اس کا ملنا جلنا کن لوگوں سے ہے۔ اگر اس کی تصویر مل سکے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ اس کے بعد ہی میں اپنے طریقے سے اس پراجیکٹ کا راز معلوم کرنے کی کوشش کر سکوں گا۔“

کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

”یہ میں معلوم کروا دوں گا لیکن میں تمہیں یہ ضرور کہوں گا کہ اگرچہ یہ جاسوسی کا مشن ہو گا لیکن تمہیں بے حد احتیاط سے قدم اٹھانا ہو گا کیونکہ وہ جو کوئی بھی فوجی یا سویلین افسر ہو گا وہ اس خفیہ پراجیکٹ کے بارے میں اتنی آسانی سے تمہیں کچھ نہیں بتائے گا۔“

میں نے کہا ”تم پہلے معلوم تو کرو کہ وہ فوجی افسر یا سویلین افسر کون ہے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“

ہمارا قیام اس پہاڑی چٹانوں سے گھرے ہوئے چھوٹے سے بوسیدہ گھر میں ہی تھا۔ دن کے وقت کمانڈو شیر باز چلا جاتا اور شام کو واپس آتا۔ میں زیادہ تر بوڑھے کشمیری کے لکڑی کے ایک کمرے والے مکان میں ہی رہتا شام کو چٹانوں کے پیچھے درختوں میں ٹہلنے چلا جاتا۔ یہاں کبھی کوئی نہیں آیا تھا۔ بوڑھا کشمیری بھی اکثر غائب رہتا تھا۔ یہ کمانڈو شیر باز نے اپنا خفیہ ٹھکانہ بنا رکھا تھا جو سری نگر شہر کے مغرب میں کافی فاصلے پر تھا ادھر کوئی باقاعدہ بڑی سڑک بھی قریب سے نہیں گزرتی تھی۔ کبھی کسی موٹر گاڑی یا ٹرک وغیرہ کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ دن کے وقت نیچے جو پہاڑی نالہ بہتا تھا اس کی ہلکی ہلکی آواز آتی رہتی تھی۔ رات کے وقت یہ آواز زیادہ سنائی دیتی تھی۔

رات کو یا شام کے وقت شیر باز آتا تو ہم لکڑی کے مکان سے اٹھ کر پیچھے گھاس پھوس والے چٹانی جھونپڑے میں آ کر بیٹھ جاتے اور دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ کمانڈو شیر باز نے اپنے تین آدمیوں کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ انڈین آرمی کے زیر زمین خفیہ پراجیکٹ کے سربراہ کا پتہ چلائیں کہ وہ کون ہے اس کا نام کیا ہے اور اس کے کوائف کیا ہے۔ ایک ہفتہ گزر گیا ہمیں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ آٹھویں روز کمانڈو شیر باز اپنے ساتھ ایک مجاہد کو لے کر آیا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم لکڑی کے مکان میں ہی بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیر باز نے اپنے مجاہد سے میرا تعارف کرایا۔ اس کا نام صمد بٹ تھا۔ شیر باز نے صمد بٹ سے کہا۔

"صمد! تم جو کچھ پتہ کر کے آئے ہو حیدر بھائی کو بتا دو۔"

صمد بٹ کہنے لگا۔

"پہاڑی جنگل والے اس زیر زمین پراجیکٹ کے بارے میں تو ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہاں کیا کام ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ یہ کوئی فوجی پراجیکٹ ہے جو انڈین آرمی کے ماتحت ہے۔ اس پراجیکٹ کا دفتر سری نگر کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں ہے۔ اس کا ڈائریکٹر ایک ڈوگرہ میجر ہے جس کا نام ارجن سنگھ ہے۔ اس کی عمر چالیس کے قریب ہے۔ رنگ کالا ہے' ناک تیکھی ہے' مونچھیں بڑی بڑی ہیں۔ قد پانچ فٹ سے نکلتا ہوا ہے۔ سگار پیتا ہے۔ رات کو آفیسرز میس میں بیٹھ کر شراب بھی پی لیتا ہے۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی ہے۔ اس میں سے میجر ارجن سنگھ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے دوسری شادی کر رکھی ہے۔ دوسری بیوی کا نام ورشا سنگھ ہے۔ وہ بھی جموں کالج کی بڑھی ہوئی ہے۔ گندمی رنگ کی بڑی خوش شکل لڑکی ہے۔ نوجوان ہے۔ عمر بیس بائیس سال کے قریب ہے۔ فیشن ایبل ہے مگر اپنے خاوند کی وفادار ہے۔ دوسرے فوجی افسروں کو زیادہ منہ نہیں لگاتی۔ میجر ارجن سنگھ بھی جموں کا رہنے والا ہے۔ جموں میں ان کا آبائی مکان ہے جہاں اب تالہ پڑا رہتا

ہے۔ کیونکہ میجر ارجن سنگھ کے ماں باپ مر چکے ہیں اس کا کوئی بھائی بہن بھی نہیں ہے۔"

صمد بٹ نے مجھے کافی معلومات فراہم کر دی تھیں۔ وہ ارجن سنگھ کی تصویر پیدا نہیں کر سکا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ سری نگر کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں میجر ارجن سنگھ کا دفتر کس جگہ پر ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ کی رہائش کہاں پر ہے؟"

صمد بٹ کہنے لگا۔

"سری نگر فوجی ہیڈ کوارٹر کے عقب میں آرمی افسروں کے لیے کچھ کاٹج بنے ہوئے ہیں۔ میجر ارجن سنگھ وہیں کاٹج نمبر F - 11 میں رہتا ہے۔ گھر میں ایک اردلی رہتا ہے۔ ایک عورت کام کرنے صبح آتی ہے شام کو چلی جاتی ہے۔ اس کی بیوی بھی اکثر گھر پر ہی رہتی ہے۔ شام کو کبھی کبھی خود گاڑی لے کر شاپنگ کرنے سری نگر آ جاتی ہے۔ کسی شام اپنے خاوند کے ساتھ آفیسرز میس میں بھی چلی جاتی ہے۔"

"ان کے ہاں فوجی افسروں کی دعوتیں تو اکثر ہوتی رہتی ہوں گی۔"

میرے اس سوال پر صمد بٹ نے کہا۔

"جہاں تک ایک ہفتے میں ہمیں معلوم ہوا ہے صرف ایک پارٹی میجر ارجن سنگھ کے گھر پر ہوئی ہے جس میں ایک دو کرنل اور ان کی فیملی بھی شریک تھی۔"

میں نے صمد بٹ سے پوچھا۔

"میجر ارجن سنگھ کی بیوی ورشا کس قسم کی عورت ہے۔ میرا مطلب ہے کیا مذہبی پوجا پاٹھ کی طرف زیادہ رجحان رکھتی ہے یا آزاد خیال ہے۔"

صمد بٹ نے کہا۔

"جس عورت سے ہم نے اس کے گھر کی معلومات حاصل کی تھیں۔ اس

نے بتایا تھا کہ میجر کی بیوی نے گھر کے ایک کونے میں رام اور سیتا کی مورتیاں سجا رکھی ہیں جن کی وہ صبح اٹھ کر آرتی اتارتی ہے اور ماتھا ٹیکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے یہی کافی ہے۔"

صمد بٹ چلا گیا تو کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

"کیا اتنی معلومات تمہاری جاسوسی کے لیے کافی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "بہت ہیں۔"

"تم کیا لائن آف ایکشن اختیار کرو گے؟"

کمانڈو شیر باز نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"صرف ایک لائن آف ایکشن میرے ذہن میں آئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی لائن آف ایکشن یہاں کارآمد ہوگی۔"

"مثلاً" تم سراغ رسانی کہاں سے شروع کرو گے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! ابھی میں اپنے طریق کار کو خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔ جب میں اپنا کام شروع کروں گا تو تمہیں سب سے پہلے خبر ہو جائے گی۔ اس بارے میں تم اطمینان رکھو۔ بلکہ تمہاری راہ نمائی میں میرا یہ جاسوسی کا مشن آگے بڑھے گا۔"

کشمیری مجاہد صمد بٹ جب مجھے انڈین آرمی کے پر اسرار پراجیکٹ کے سربراہ اور اس کی بیوی کے [illegible]ے میں تفصیلات بتا رہا تھا تو میرا ذہن ساتھ ساتھ کام کرنے لگا تھا اور پورے کا پورا ایکشن میرے ذہن میں آگیا تھا۔ کمانڈو شیر باز کو میں اس لیے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں اس پر مزید غور و فکر کرنا چاہتا تھا۔ پورا ایکدن میں اپنے مشن پر غور کرتا رہا۔ اس کے ہر پہلو پر غور کیا۔ اپنے طریق کار کی تمام کمزوریوں کا تجزیہ کیا۔ جب اپنی طرف سے ایکشن کے لیے [illegible] تیار ہو گیا تو میں نے کمانڈو شیر باز سے پہلے پہلے اپنے ایک اور

دوست سے مشورہ ضروری سمجھا اور میرا یہ دوسرا دوست سانپ تھا جسے میں نے مکان کے پیچھے ایک پہاڑی کھوہ میں خشک گھاس پھوس بچھا کر رکھا ہوا تھا۔ میں وقت نکال کر دن میں ایک بار اسے دودھ ضرور پلا دیتا تھا۔ چونکہ تجربے نے مجھ پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ میری بات سمجھتا ہے۔ میرے الفاظ کو سمجھتا ہے۔ اس لیے میں نے اسے کھوہ میں خشک گھاس پر بیٹھاتے ہوئے کہہ دیا تھا۔

"میرے دوست! تم یہاں میرے پاس رہو گے۔ میں بھی تمہارے پاس ہی رہوں گا۔ دن بھر جنگل میں جہاں چاہے پھرتے رہو مگر رات کو اس جگہ واپس آ جایا کرنا۔ جنگل میں بھی اس طرف مت جانا جدھر آدمیوں کی آمد و رفت زیادہ ہو کیونکہ مجھے تمہاری زندگی بڑی عزیز ہے۔"

سانپ اپنی عادت کے مطابق سر اٹھا کر بڑے غور سے میری طرف دیکھتا رہا تھا۔ جب میں نے بات ختم کی تھی تو اس نے سر کو دو تین بار نیچے جھکا دیا تھا جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ میری ہدایات کو سمجھ گیا ہے۔ رات کو جب کمانڈو شیر باز چلا گیا تو میں مکان کی کوٹھڑی سے نکل کر پیچھے ٹیلے کے کھوہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے سانپ کی سرخ آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے اندر ہاتھ ڈال کر سانپ کو پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر بٹھالیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! ایک بڑا اہم مشن میرے سامنے ہے۔ یہ کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی کامیابی اور پاکستان کی سلامتی کا مشن ہے۔ اس مشن میں تمہیں میرے ساتھ بڑا اہم کردار ادا کرنا ہے۔ وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا اور اس لیے بتاؤں گا کہ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تم میری ہر بات سمجھ لیتے ہو لو اب تم دودھ پی لو۔"

میں اپنے ساتھ نیم گرم دودھ چھوٹی بوتل میں ڈال کر لے گیا تھا۔ سانپ کے پاس میں نے ایک چھوٹی پیالی رکھ دی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ہتھیلی سے

نیچے اتار دیا۔ پیالی میں دودھ ڈالا۔ سانپ بڑے مزے سے دودھ پینے لگا۔

"اچھا دوست! اب میں بتاتا ہوں کل رات کو پھر تم سے ملاقات کرنے آؤں گا۔"

میں ہر رات اپنے دوست سانپ سے ملنے آ جاتا تھا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا ہوتا تھا کہ وہ اپنے خفیہ ٹھکانے پر موجود بھی ہے کہ نہیں۔ ایک طرح سے یہ سانپ بھی ایک کمانڈو سانپ بن گیا ہوا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ میری داڑھی نہ زیادہ بڑھی ہوئی تھی نہ چھوٹی تھی۔ داڑھی کی وضع قطع میں نے جان بوجھ کر ایسی بنائی تھی کہ خاص طور پر مسلمانوں ایسی داڑھی نہ لگے۔ جب چاہوں سادھو یا سنیاسی بن سکوں۔ کیونکہ آپ میری داستان شروع سے سن رہے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ کمانڈو ایکشن کے ساتھ ساتھ میرا کام جاسوسی اور سراغ رسانی کا بھی تھا اور جاسوسی کرنے کے لیے مجھے کسی بھی وقت کوئی بھیس بدلنا پڑتا تھا اور چونکہ میں ایک ایسے ملک میں تھا جہاں ہندوؤں کی حکومت تھی تو مجھے زیادہ تر ہندو جوگیوں یا سنیاسیوں کا بھیس بدلنا پڑتا تھا۔ اس بھیس کے لیے کھلی داڑھی بڑی موزوں تھی۔

سری نگر شہر میں، میں کئی بار گھوم پھر چکا تھا اور سری نگر کے مضافات میں جو انڈین آرمی کا ہیڈ کوارٹر تھا جہاں پر اسرار پراجیکٹ کے سربراہ کا آفس بھی تھا۔ میں نے کئی بار دور سے دیکھا تھا۔ اسی کمپلیکس میں ملٹری انٹیلی جنس کے دفاتر بھی تھے اور اسی ہیڈ کوارٹر کے پیچھے آفیسرز کے کوارٹرز یا کاٹج تھے جن میں سے ایک کاٹج میں خفیہ پراجیکٹ کا ڈائریکٹر میجر رجن سنگھ اپنی جوان سال فیشن ایبل مگر مذہبی بیوی ورشا سنگھ کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ ان کی شادی کو بقول صمد بٹ کے تین سال گزر گئے تھے مگر ان کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا تھا۔ دن کے وقت میں نے کشمیری مزدوروں والا حلیہ بنایا اور سوٹی کاندھے پر رکھ کر سری نگر شہر کی طرف چل پڑا۔ بڑی سڑک پر آ کر میں ایک بس میں سوار ہو گیا۔ موسم صاف تھا۔ سردی خوب پڑ رہی تھی۔ میں نے کشمیری مزدوروں والا لمبا گرم چولا یعنی فرن پہن رکھا تھا۔ فرن کے اوپر پرانا گرم کوٹ بھی پہنا ہوا تھا۔ چھڑی کاندھے پر رکھی ہوئی تھی اور سر پر اونی ٹوپی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں کشمیری میں بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات میرے حلئے کے خلاف جاتی تھی اور مجھے کسی بھی وقت کسی مصیبت میں پھنسا سکتی تھی۔ لیکن ایسے موقعوں پر میں گونگا بن جاتا تھا اور غوں غاں کرنی شروع کر دیتا تھا۔

میں ایک ایسے بس سٹاپ پر اتر گیا جہاں سے انڈین مقبوضہ آرمی کا ہیڈ کوارٹر زیادہ دور نہیں تھا۔ جو سڑک فوجی ہیڈ کوارٹر کو جاتی تھی میں اس سڑک سے ہٹ کر دوسری طرف چل پڑا۔ یہاں سری نگر شہر کی جدید کالونیاں تھیں میں

باہر ہی باہر سے ہوتا ہوا ہیڈ کوارٹر کے عقب میں جو نیم پہاڑی علاقہ تھا وہاں آ کر ایک جگہ بیٹھ گیا اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو اٹھ کھڑا ہوا اور ایک چھوٹے پہاڑی ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے کے بعد اس مقام پر آ کر چنار کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا جہاں نیچے پتلی سی سڑک فوجی افسروں کے کوارٹرز کے سامنے سے گزرتی تھی۔ میرے ٹارگٹ ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ کے فوجی کوارٹر کا نمبر F - 11 تھا مگر وہاں سے مجھے پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس نمبر کا کوارٹر کہاں ہے۔ ابھی مجھے نمبر معلوم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ابھی میں صرف موقع کا طائرانہ جائزہ لینے آیا تھا کہ ان کوارٹروں کا حدود اربعہ کیا ہے۔ ان کے پیچھے کس قسم کا علاقہ ہے۔ کوارٹروں کے آگے پیچھے کے لان کیسے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ جائزہ میرے مشن کے لیے بہت ضرورت تھا۔ جب میں ٹیلے کے اوپر سے فوجی کوارٹروں کا اچھی طرح سے مشاہدہ کر چکا تو ڈھلان سے دوسری طرف اتر گیا۔ یہ کوارٹر چھوٹی چھوٹی کوٹھیوں کی طرز کے بنے ہوئے تھے۔ دیواریں پتھروں کی تھیں۔ چھتیں لکڑی کی تھیں اور ڈھلواں تھیں ہر کوارٹر کے آگے پیچھے چھوٹے چھوٹے صحن تھے جہاں پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ وہاں کوئی فوجی پہرہ دیتا نظر نہیں رہا تھا۔ ان کوارٹروں کے سامنے کچھ فاصلے پر فوجی ہیڈ کوارٹر کی پختہ اونچی دیوار تھی جس کے اوپر خاردار تار لگی ہوئی تھی۔

جب میں نے ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ کے فوجی کوارٹر کے اردگرد کے ماحول کا اچھی طرح سے جائزہ ۔ لیا تو وہاں سے واپس کمانڈو شیر باز خان کی خفیہ کمیں گاہ یعنی پہاڑی چٹانوں کے درمیان بنے ہوئے بوڑھے کشمیری کے لکڑی کے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔ شیر باز خان میرے وہاں پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد پہنچا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں جائے واردات کا علاقہ اچھی طرح دیکھ آیا ہوں۔

وہ کہنے لگا۔

"مگر تمہاری لائن آف ایکشن کیا ہوگی؟"

میں نے کہا۔ "لائن آف ایکشن تو کافی لمبی ہے لیکن ابھی میں تم سے صرف ایک بات کا خواہش مند ہوں۔"

"وہ کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم سنو گے تو ضرور ہنسو گے لیکن یہ بہت ضروری ہے۔ یوں سمجھ لو کہ یہ وہ سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر مجھے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا ہے۔"

کمانڈو شیر باز مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے اسے کہا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ مجھے میجر ارجن سنگھ کی بیوی ورشا سنگھ کے جسم کا کوئی اترا ہوا کپڑا مل جائے۔ مثلاً" اس کی بنیان' بلاؤز' انگیا وغیرہ۔"

کمانڈو شیر باز میرے اس مطالبے پر ہنسنے کی بجائے اور سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو؟ ڈوگرہ میجر کی بیوی کی بنیان یا بلاؤز یا انگیا لے کر تم کیا کرو گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ بلکہ تمہیں اپنے آپ معلوم ہوتا جائے گا۔ اس وقت تم صرف میرے سوال کا جواب دو کہ کیا ڈوگرہ میجر کی بیوی کا اترا ہوا بلاوز' بنیان یا انگیا مل سکتی ہے۔"

شیر باز سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا۔

"اپنے آدمیوں سے معلوم کرنا پڑے گا کہ فوجی آفیسرز کے میلے کپڑے کہاں دھوئے جاتے ہیں اور کون دھوبی دھونے کے لیے لے جاتا ہے۔"

"بس یہ مجھے آج ہی پتہ کر دو بلکہ کوشش کرو کہ شام تک ڈوگرہ میجر کی بیوی ورشا کے بدن کا کوئی بھی اترا ہوا کپڑا مجھے مل جائے۔"

شیر باز حیرت کے عالم میں اپنا سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے شیشے کی بوتل میں ہانڈی میں سے دودھ نکال کر ڈالا اور بوتل لے کر پیچھے چٹان کی کھوہ میں اپنے دوست سانپ کے پاس آگیا۔ وہ کنڈلی مارے اپنا سر کنڈل میں چھپائے شاید سو رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ یا میری جسم کی بو پر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی پیالی میں دودھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"دوست! میں تمہیں کل یا پرسوں ایک بڑے اہم مگر بڑے نازک مشن پر بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ رہی ہوں۔ کیونکہ اس مشن کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم میری ایک ایک بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ جاؤ۔ یہ بڑا خطرناک مشن ہے۔ تمہیں بڑی عقلمندی سے کام لینا ہوگا۔ اگر تم سے ذرا بھی اونچ نیچ ہوگئی تو ہمارا اہم ترین مشن ناکام ہو جائے گا۔"

سانپ پیالی میں سے دودھ پی رہا تھا۔ مجھے اس طرح اندازہ ہوا کہ وہ میری باتوں کا مفہوم سمجھ رہا ہے۔ جب وہ دودھ پی چکا تو میں نے اسے کہا۔

"دوست! اگلی بار آؤں گا تو تمہیں وہ مشن بتا دوں گا جس کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ خدا حافظ۔"

میں واپس لکڑی کے جھونپڑے میں آگیا اور درپیش مشن کے نشیب و فراز پر غور کرنے لگا۔ کمانڈو شیر باز شام کو بھی نہ آیا۔ بوڑھا کشمیری آگیا تھا۔ اس نے چاول اور سبزی وغیرہ بنا لی تھی۔ رات ہوگئی میں نے تھوڑا بہت کھانا وغیرہ کھا لیا اور فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر گرم دھسہ اور لوئی لے کر لیٹ گیا۔ اس روز بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی اوپر پہاڑیوں پر صبح سے برفباری ہو رہی تھی اور ان پہاڑیوں کی طرف سے جو یخ بستہ ہوا آ رہی تھی وہ بدن میں تیر کی طرح لگ رہی تھی۔ کمانڈو شیر باز کافی رات گئے واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"اس دھوبن کا پتہ چل گیا ہے جو ڈوگرہ میجر کے گھر پر کپڑے دھونے کے لیے جاتی ہے۔ ایک عورت کی ہم نے ڈیوٹی لگا دی ہے۔ خدا نے چاہا تو کل کسی وقت میجر ارجن سنگھ کی بیوی درشا سنگھ کے بدن کا کوئی نہ کوئی اترا ہوا کپڑا یہاں پہنچ جائے گا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ دوسرے روز دوپہر کے وقت ایک کشمیری مجاہد آ گیا۔ کمانڈو شیر باز اسے، میرے پاس لے آیا۔

شیر باز خان نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

کشمیری مجاہد نے لمبے پرانے گرم کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس کے، ہاتھ میں سرخ رنگ کی انگیا تھی۔ کہنے لگا۔

"اس وقت ارجن سنگھ کی بیوی کی یہی ایک انگیا دھوبن کے پاس تھی جسے وہ دھونے کے لیے لائی ہوئی تھی۔ یہ انگیا کل دھوبن کو ہر حالت میں واپس مل جانی چاہیے۔"

میں نے انگیا ہاتھ میں لے کر اسے اچھی طرح سے دیکھا۔ پھر اسے چمڑے کے تھیلے میں سنبھال کر رکھ لیا اور کہا۔

"کل دوپہر کو آ کر یہ انگیا واپس لے جانا۔"

کشمیری مجاہد عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں عورت کی انگیا کو لے کر کیا کروں گا۔ جب کشمیری مجاہد چلا گیا تو میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"شیر باز خان! مجھے کچھ اور چیزوں کی ضرورت ہے۔"

وہ بولا۔ "تم بتاؤ کیا کیا چیز چاہیے۔ میں وہ تمہیں لا دوں گا۔"

میں نے ایک کاغذ پر کچھ چیزیں لکھ کر اسے کاغذ دے دیا۔ وہ کاغذ پر لکھی ہوئی چیزیں پڑھتے ہوئے مسکراتا رہا۔

"یہ تم جوگی سادھو کا بھیس بدلنے والے ہو؟ چیزیں تو ساری وہی ہیں جو جوگی سادھوؤں کے کام آتی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"بس تم مجھے یہ چیزیں لا کر دے دو۔ آگے جو اللہ کو منظور ہے وہ ہو گا اور یقین کرو کہ بہتر ہی ہو گا۔

کمانڈو شیر باز دوسری دن گیارہ بجے آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ بوڑھا کشمیری بھی اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں جو باورچی خانہ بھی تھا سو گیا تھا۔ میں نے میجر ارجن سنگھ کی بیوی کی انگیا اور دودھ کی بوتل اٹھائی اور پیچھے ٹیلے کی کھوہ میں جہاں میرا دوست سانپ رہتا تھا آ گیا۔ سانپ کھوہ میں تھا۔ اسکی خالی پیالی ایک طرف پڑی تھی۔ میں ایک طرف بیٹھ کر سانپ کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے سانپ کی ہلکی سی پھنکار سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ سانپ مجھ سے تین چار قدم کے فاصلے پر بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"دوست! آ جاؤ۔ مجھے تم سے بڑی اہم باتیں کرنی ہیں۔"

میں اب سانپ سے اس طرح باتیں کرتا تھا جیسے کسی انسان سے باتیں کی جاتی ہیں۔ سانپ نے بھی مجھے اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ وہ میری ہر بات سمجھ رہا ہے۔ تجربے سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی تھی سانپ کھوہ کے اندر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دودھ کی بوتل ایک طرف رکھ دی تھی۔ میں نے پیالی میں دودھ نہیں ڈالا تھا۔ میں نے ورشا کی انگیا نکال کر سانپ کو دکھائی اور کہا۔

"دوست! یہ ایک ایسی عورت کی انگیا ہے جس کو تم نے ڈسنا ضرور ہے مگر اس کے جسم میں صرف اتنا ہی زہر داخل کرنا ہے کہ جس سے وہ بے ہوش ہو جائے مرے نہیں۔ یہ بڑی نازک بات ہے۔ کیا تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟ میں ایک بار پھر دہراتا ہوں۔ سنو! یہ ایک ایسی عورت کے بدن کی انگیا ہے جس کو تم نے ڈسنا ضرور ہے مگر اس کے جسم میں اتنا زہر داخل کرنا ہے کہ یہ عورت

زندہ رہے مگر بے ہوش ہو جائے مرے بالکل نہیں۔ میں اسے زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم سمجھ گئے ہو؟"

سانپ میری طرف سر اٹھائے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے دوسری دفعہ اپنی بات کو دہرایا تو اس نے اپنا سر دو بار اوپر نیچے کیا۔ میرے دوست سانپ کی عادت تھی کہ جب وہ میری بات کو سمجھ جاتا تھا تو دو یا تین بار اپنے سر کو اوپر نیچے کرتا تھا۔ سانپ نے ظاہر تو یہی کیا تھا کہ وہ میری بات سمجھ گیا ہے لیکن میں دل میں ڈر رہا تھا کہ خدا کرے ایسا ہی ہو کیونکہ اگر سانپ نے میجر ارجن سنگھ کی بیوی ورشا کو اسی طرح ڈسا جس طرح وہ دوسرے دشمنوں کو ڈستا ہے تو وہ تو مر کر پتھر ہو جائے گی اور میرا مشن ادھورا رہ جائے گا۔ اس سلسلے میں میں نے ایک اہتمام ضرور کیا تھا۔ کہ جب اس نے سانپ کو دہشت گرد طوائفوں کے اترے ہوئے کپڑے سنگھائے تھے تو اس کے بعد سانپ کو دو دن تک بھوکا رکھا تھا۔ خاص طور پر اسے دودھ کا ایک قطرہ بھی پینے کو نہیں دیا تھا اور اسے ڈبے میں بند کر دیا تھا۔ میں یہ طریقہ کار ہرگز نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ میں نے ورشا کی انگیا سانپ کے آگے کر دی۔ سانپ انگیا میں گھس گیا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ دو تین منٹ تک وہ انگیا میں ادھر سے ادھر رینگتا رہا۔ اس کے بعد انگیا سے باہر نکل کر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ میں نے انگیا اٹھا کر جیب میں رکھ لی اور بوتل میں سے دودھ پیالی میں ڈال کر پیالی اس کے آگے رکھ دی۔ سانپ دودھ پینے لگا۔

اس میں ایک اہم نقطہ تھا وہ یہ کہ جب سانپ کو قادر خان دشمن کا اترا ہوا کپڑا سنگھا کر بند کر دیتا تھا اور اسے دو تین دن تک کچھ کھانے پینے کو نہیں دیتا تھا تو سانپ یہی سمجھتا تھا کہ جس آدمی کی بو اسے کپڑے میں سے آئی تھی اسی نے اسے بھوکا پیاسا بند کر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ اس کا دشمن بن جاتا تھا اور جب سانپ کو تیسرے یا چوتھے روز رہا کر کے چھوڑا جاتا تھا تو وہ اپنے دشمن کی بو پر جا کر اسے ہلاک کر آتا تھا۔ اگرچہ میرے دوست سانپ کا معاملہ تھوڑا مختلف تھا۔ یہ سانپ خدا جانے کسی کرامت کے زیر اثر میری باتیں سمجھنے لگا تھا اور میرا دوست بن گیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں نے دودھ پلانا مناسب سمجھا۔ پٹاری میں وہ پہلے ہی سے بند نہیں تھا۔ میں نے اسے آزاد رکھا ہوا تھا۔ دودھ میں نے اسی لیے اسے پلا دیا کہ جس عورت کی انگیا کی اس نے بو سونگھی ہے اسے اپنا دشمن نہ سمجھ بیٹھے۔ سانپ دودھ پیتا رہا اور میں اسی کے پاس بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ دودھ پی چکا تو میں نے اس یقین کے ساتھ وہ میری بات اور میرے الفاظ سمجھ رہا ہے کہا۔

"دوست! تم نے جس عورت کی انگیا کو سونگھا ہے اور جس کے جسم کی بو سے تم اچھی طرح واقف ہو گئے ہو اس کا نام ورشا ہے۔ میں تمہیں آج آدھی رات کے بعد اپنے ساتھ لے جا کر اس عورت کے مکان کے پاس چھوڑ دوں گا۔ تمہیں اس عورت کو جہاں بھی وہ سو رہی ہوگی جا کر ڈسنا ہے۔ مگر اس کو ہلاک نہیں کرنا۔ اس کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل کرنا ہی کہ وہ زندہ رہے مگر

تمہارے زہر کے اثر سے بے ہوش ہو جائے۔ میری باتوں کو اپنے دماغ میں اچھی طرح سے بٹھا لینا۔ میں شام کو پھر آؤں گا تمہیں دودھ پلانے۔"

جاتے ہوئے میں نے سانپ کی دودھ والی خالی پیالی میں مزید دودھ ڈال دیا۔ سمجھانے کو تو میں نے سانپ کو ایک ایک بات پوری تفصیل کے ساتھ سمجھا دی تھی مگر تذبذب میں ہی تھا کہ آخر یہ سانپ ہے کوئی انسان تو ہے نہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے دماغ میں میری بات پڑی بھی ہو یا نہ پڑی ہو۔ معاملہ بڑا نازک تھا۔ انسان کو ڈسنا بھی تھا اور ایک خاص مقدار سے زیادہ انسان کے جسم میں زہر بھی داخل نہیں کرنا تھا۔ اس قسم کا نازک کام تو آدمی کمپیوٹر کے ذریعے ناپ تول کر کر سکتا ہے۔ سانپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ جتنا زہر اس نے ورشا کے جسم میں ڈسنے کے بعد داخل کر دیا ہے اس کو بے ہوش کرنے کے لیے صرف اتنا زہر ہی کافی ہے۔ ایک ملی گرام بھی زہر جسم میں زیادہ چلا گیا تو معاملہ چوپٹ ہو جائے گا اور میجر ارجن سنگھ کی بیوی ورشا مر چکی ہوگی اور ہمارے مشن پر پانی پھر جائے گا۔ بس اللہ توکل ہی کام ہو رہا تھا۔

رات کو سونے سے پہلے میں ایک بار دوبارہ اپنے دوست سانپ کو دودھ پلا دیا تاکہ اس کے ذہن پر اس چیز کا معمولی سا اثر بھی باقی نہ رہے کہ جس عورت کے جسم کی بو اس نے سونگھی ہے وہ اس کی دشمن ہے۔ میں اپنی حکمت عملی میں کس حد تک کامیاب ہوا تھا؟ میں اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں سارا کام اللہ توکل کر رہا تھا۔ رات کو اپنے خیالوں میں الجھا سو گیا۔ دن چڑھے اٹھا۔ بارہ بجے کے قریب کمانڈ شیر باز میرے ضروری کپڑے اور دوسرا سامان لے کر آ گیا۔ میں نے ان ساری چیزوں کا معائنہ کیا اور کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"کیا تم جوگی بن کر میجر ارجن سنگھ کے گھر جاؤ گے؟"

کمانڈو شیر باز کے اس سوال پر میں نے ہنس کر کہا۔

"ارادہ تو یہی ہے آگے اللہ مالک ہے۔"

"شیر باز نے تجسس کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم جوگی بن کر اس ڈوگرہ فوجی افسر کے گھر جاؤ گے اور خفیہ پراجیکٹ کا راز معلوم کر لو گے۔"

میں نے کہا "جو کچھ ہو گا تمہارے سامنے ہی ہو گا۔ پورا یقین تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن مجھے اپنی طرف سے ایک کوشش تو کر کے دیکھ لینے دو۔ ہو سکتا ہے کامیاب ہو جائے۔"

"کب اس سراغ رسانی کی مہم پر نکلنے کا اراد ہے؟"

میں نے کہا۔

"کل نکلنے کا ارادہ ہے۔ تم یہاں نہ بھی ہوئے تو میں اپنے مشن پر نکل جاؤں گا۔"

"واپس کس وقت آؤ گے؟" کمانڈو شیر باز نے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے خدا تمہیں کامیاب کرے۔ تمہارا کامیاب ہونا ہمارے مشن کے لیے بے حد ضروری ہے۔ تمہاری کامیابی کے بعد ہی ہم آگے کچھ کر سکیں گے۔"

میں نے کہا۔

"امید تو بہت ہے۔"

دوپہر کا کھانا ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ اس کے بعد کمانڈو شیر باز چلا گیا۔ میں فوراً اپنے دوست سانپ کے پاس آ گیا۔ اسے ایک بار پھر دودھ پلایا۔ اس کے ذہن میں تمام ضروری باتیں دوبارہ ڈالیں اور لکڑی کے کمرے یا جھونپڑے میں آ کر لیٹ گیا۔

مجھے سانپ کو لے کر رات کے وقت میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر کی طرف جانا تھا لیکن اس سے پہلے اس کوارٹر کی نشان دہی ضروری تھی۔ چنانچہ تیسرے پہر میں نے دیہاتیوں والا لباس پہنا اور چھڑی کاندھے پر رکھ کر اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑا۔ اس بار میں کوارٹروں کے عقب میں جانے کی بجائے کوارٹروں کے سامنے جو چھوٹی سی کچی سڑک تھی اس پر آگیا۔ میں دوسری طرف کے ٹیلوں کی طرف سے سڑک پر آیا تھا۔ میں بالکل ان پڑھ دیہاتیوں کی طرح سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ اس طرف آفیسرز کوارٹروں کے صدر دروازے تھے۔ چھوٹے چھوٹے صحن تھے۔ گارڈینیا کی جھاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ لکڑی کے ستونوں والے برآمدے صاف نظر آ رہے تھے۔ ان برآمدوں میں کہیں کہیں پھولدار گملے بھی رکھے ہوئے تھے۔ ہر کوارٹر کے باہر چھوٹا سا محرابی دروازہ تھا جس کے نیچے سے ہو کر ایک چھوٹا سا راستہ گملوں کی قطاروں کے درمیان سے برآمدے کے زینے تک جاتا تھا۔ کوارٹروں کی کرسی اونچی بنائی گئی تھی۔ تین چار لکڑی کا زینہ چڑھ کر آدمی برآمدے میں داخل ہوتا تھا۔ ہر دروازے کے باہر کوارٹر کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ مجھے کوارٹر نمبر F - 11 کی تلاش تھی۔ آخر اس نمبر کا کوارٹر مجھے مل گیا میں اس کوارٹر کو بڑے غور سے دیکھتا ہوا آگے نکل گیا۔ دن ڈوب رہا تھا جب میں واپس پہنچا آج رات مجھے اپنے دوست سانپ کو اس کے عقل فہم والے مشن پر لے جانا تھا۔ دل میں ڈر رہا تھا کہ سانپ سے کوئی غلط نہ ہو جائے۔

رات کو کمانڈو شیر باز نہ آیا۔

یہ میرے حق میں مفید بات تھی۔ میں رازداری کے ساتھ یہ کام کرنا چاہتا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ دن کے وقت آفیسرز کوارٹروں کے آگے کوئی فوجی سنتری چلتا پھرتا نظر نہیں آتا تھا۔ رات کے وقت اس بات کا امکان تھا کہ کوئی سنتری پہرے پر موجود ہو۔ مجھے اس سے ہوشیار رہنا تھا۔ میں خفیہ کمیں گاہ سے

بھی سانپ کو اس کے مشن پر روانہ کر سکتا تھا مگر میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ سانپ کو سری نگر شہر میں سے یا اس کے قریب سے ہو کر گزرنا تھا اور شہر آخر شہر ہوتا ہے رات کے وقت بھی سڑکوں پر روشنی ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی گاڑی آتی جاتی رہتی ہے۔ خطرہ تھا کہ سانپ کہیں مارا نہ جائے۔ اس خدشے کے پیش میں نے فیصلہ کیا تھا کہ سانپ کو اپنے ساتھ لے جا کر میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر کے قریب کسی جگہ چھوڑ دوں اور وہیں چھپ کر سانپ کی واپسی کا بھی انتظار کروں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے سانپ سے کہا کہ عورت کو ڈس کر سیدھا میرے پاس واپس آ جائے تو وہ ضرور واپس آ جائے گا۔ رات کے دس بجے میں نے اپنے دوست سانپ کو دودھ پلایا اور اسے اس کے ٹھکانے سے اٹھا کر اپنے لکڑی کے جھونپڑے میں لے آیا۔ ابھی مجھے جوگی یا سادھو کا بھیس بدلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ میرے مشن کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس مرحلے پر میرا دیہاتی لباس ہی کافی تھا۔ احتیاط کے طور پر میں نے بھرا ہوا آٹو میٹک پستول اپنے پاس رکھ لیا تھا جس پر سائی لینسر کی فولادی نالی لگی ہوئی تھی۔ یہ نالی پستول کے فائر کے دھماکے کو دبا لیتی تھی۔

جب رات کے گیارہ بجے تو میں نے مزید ایک گھنٹہ انتظار کرنا ضروری خیال نہ کیا۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ سانپ کو اس وقت کوارٹر نمبر ایف گیارہ کے باہر چھوڑوں جب گھر کے دونوں فرد یعنی میجر ارجن سنگھ اور اس کی نوجوان بیوی ورشا سو چکے ہوں۔ میں نے سانپ کو ایک بار پھر اس کے مشن کو کھول کر بتایا اور کہا۔

''دوست! اب ہم ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔''

سوا گیارہ بجے میں خفیہ کمین گاہ سے نکل کر نیچے اس سڑک پر آ گیا تھا جو سری نگر جانے والی پکی سڑک کے پہلو میں چیڑھ اور دیودار کے درختوں میں سے ہوتی ہوئی سری نگر تک جاتی تھی۔ اس سڑک پر عام طور پر کشمیری گوالے اور

چرواہے اپنا مال مویشی لے کر گزرا کرتے تھے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ سانپ کو میں نے اپنے گرم چولے کی جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ اوپر میں نے پرانے دھسے کی بکل ماری ہوئی تھی۔ پستول میرے فرن یا چولے کی اندر والی جیب میں تھا جسے میں ایمرجنسی کے وقت بڑی آسانی سے ہاتھ ڈال کر نکال سکتا تھا۔ میں اس سارے علاقے کا بھیدی تھا۔ میں ان راستوں سے بچ کر غیر آباد راستوں سے ہو کر جا رہا تھا۔ جہاں رات کے وقت گشت لگانے والی پولیس اور انڈین آرمی کی پیٹرولنگ پارٹیوں کا خطرہ تھا۔ میں ایک لمبے راستے سے ہوتا ہوا اس چھوٹے ٹیلے پر آگیا جس کی دوسری جانب ڈھلان تھی اور نیچے فوجی افسروں کے کوارٹر تھے۔ میجر ارجن سنگھ کا کوارٹر بھی یہیں تھا۔ وہی کوارٹر میرا ٹارگٹ تھا۔ میں چیڑھ کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے دوست سانپ کو جیب سے نکال کر اپنی ہتھیلی پر بٹھالیا اور اس سے کہا۔

"میرے دوست! تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے الفاظ کو اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ الفاظ سمجھو چاہے نہ سمجھو مگر اتنا مجھے تجربہ ہوگیا ہے کہ میں جو کچھ تمہیں کہتا ہوں تم اس کا مفہوم سمجھ لیتے ہو۔ خواہ میں مشکل الفاظ بولوں خواہ میں آسان لفظوں میں بات کروں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

وہاں خاموشی تھی اور اندھیرا بھی تھا۔ میں نے غور سے سانپ کو دیکھا۔ میں حسب معمول حیران رہ گیا۔ سانپ نے دوبار گردن کو اثبات میں ہلایا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو میں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے آج بھی جبکہ آپ کو اپنی داستان سنا رہا ہوں' یقین ہے کہ وہ سانپ اصل میں کوئی انسان تھا جس نے کسی وجہ سے سانپ کا روپ اختیار کر رکھا تھا۔ میں مطمئن ہوگیا۔

میں نے سانپ کو نیچے فوجی کوارٹروں کی کہیں کہیں جھلملاتی روشنیاں دکھائیں اور کہا۔

"میرے دوست! ان کوارٹروں میں وہ عورت بھی موجود ہے جس کی انگیا کی بو تم نے سونگھی تھی اور جس کے بدن کی بو تمہیں اس وقت بھی آ رہی ہوگی۔ تمہیں یہاں سے اس عورت کے کوارٹر میں جاکر اسے ڈسنا ہے۔ مگر اس طرح ڈسنا ہے کہ عورت تمہارے زہر سے پتھر بن کر ہلاک نہ ہو۔ صرف بے ہوش ہو جائے مگر زندہ رہے۔ یہ کام بڑی رازداری سے کرنا ہوگا اور اپنی جان بچا کر کرنا ہوگا۔ عورت کو ڈسنے کے بعد تم واپس اسی جگہ میرے پاس آ جاؤ گے۔ میں یہاں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔ میری بات سمجھ گئے ہو نا دوست؟"

سانپ کا سر میں نے رات کے اندھیرے میں اثبات میں ہلتے ہوئے دیکھا تو میری تسلی ہوگئی۔ میں نے آہستہ سے سانپ کو ہتھیلی سے اتار کر نیچے زمین پر رکھ دیا اور کہا۔

"دوست! وہی کرنا جو کچھ میں نے کہا ہے۔ وہ عورت ہماری دشمن نہیں، دوست ہے جاؤ۔ جلدی واپس آ جانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

سانپ آہستہ سے رینگ کر ڈھلان اترنے لگا۔ وہ رات کی اندھیرے اور ڈھلان پر اگی ہوئی گھاس اور جھاڑیوں کی اوٹ میں میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ لمحات میرے لیے بڑے جان کاہ لمحات تھے۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں سانپ سمجھ دار ہے۔ جو کچھ میں نے اسے کہا ہے وہ اس پر عمل کرے گا۔ وہ میجر کی بیوی ورشا کو ڈس کر ہلاک نہیں کرے گا۔ صرف اس کے بدن میں اتنا زہر داخل کرے گا کہ جس سے وہ بے ہوش ہو جائے۔ کبھی خیال آیا کہ سانپ آخر سانپ ہے کیا معلوم جاتے ہی ورشا کو ڈس کر پورا زہر اس کے بدن میں داخل کر دے۔ سانپ جب ایک بار اپنے دانت اس کے جسم میں چبھوتا ہے تو پھر کہاں اسے اتنا خیال رہتا ہے کہ زہر تھوڑا سا داخل کرنا ہے زیادہ داخل نہیں کرنا۔ عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ اپنے آپ کو دوست سانپ کی عقل و فہم

کے حوالے کر دیا تھا۔

لیکن اس کے باوجود مجھے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ میرا دوست سانپ بالکل ویسا ہی کرے گا جیسا کہ میں چاہتا ہوں۔ اب مجھے نتیجے کا انتظار تھا اور میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

وقار عظیم
پاکستانی نیوا نٹ
ڈاٹ کام

نیچے کوارٹروں کے عقبی برآمدوں میں کہیں کہیں روشنی تھی۔ سخت سردی میں وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف ایک کوارٹر کے دو کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ باقی کوارٹروں کے کمروں میں اندھیرا تھا۔ رات آدھی ہوگئی تھی۔ کہر آلود سرد رات میں سبھی لوگ جلدی سو گئے تھے۔ میری نظر ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر پر جمی ہوئی تھی۔ اس کوارٹر کے کمروں میں بھی اندھیرا تھا۔ صرف عقبی لان کے برآمدے والا بلب جل رہا تھا۔ مجھے خیال تھا کہ ہو سکتا ہے جب سانپ میجر کی بیوی ورشا کو ڈسے تو اس کی آنکھ کھل جائے اور ڈر کر چیخ مارے۔ پھر سوچا کہ ان کے بیڈ روم میں بھی اندھیرا ہے۔ سانپ ورشا کے لحاف میں پاؤں کی طرف سے گھس کر اس کے ٹخنوں پر ڈسے گا اور ڈسنے کے فوراً بعد لحاف سے نکل کر باہر کو بھاگے گا۔ ورشا کی آنکھ کھل بھی گئی تو اندھیرے میں بالشت بھر کے سانپ کو دیکھ نہ سکے گی۔ ممکن ہے زہر کے اثر سے اس پر فوراً بے ہوشی طاری ہو جائے اور اس کے ساتھ سوئے ہوئے ڈوگرہ میجر کو خبر بھی نہ ہو کہ اسکی بیوی سانپ کے ڈسنے سے بے ہوش ہو چکی ہے۔

لیکن اس کے بالکل الٹ ہوا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر میں سے عورت کی چیخ بلند ہوئی۔ ساتھ ہی بیڈ روم میں روشنی ہوگئی۔ آدمی کی آواز بھی آنے لگی۔ نوکر بھی جاگ پڑے۔ وہاں شور مچ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ یقیناً سانپ کے ڈستے ہی ورشا کی آنکھ کھل گئی ہوگی یا وہ جاگ رہی ہوگی کہ سانپ نے اسے ڈس لیا اور اس

نے شور مچا دیا۔ اس کے بعد عورت کی آواز آنا بند ہوگئی۔ اردلی اور دوسرے نوکر ٹارچ لے کر کوارٹر کے عقبی باغیچے میں آگئے۔ ان کی آوازیں آنے لگیں۔

"ادھر گیا ہوگا' ادھر دیکھو' یہیں کہیں ہوگا۔"

ظاہر ہے وہ سانپ کو تلاش کر رہے تھے۔ میں درختوں کے نیچے چھپ کر بیٹھا سانپ کا انتظار کر رہا تھا اور دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ سانپ ان لوگوں سے بچ کر نکل آئے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ مجھے سانپ کی ہلکی سی پھنکار کی آواز آئی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ میرا دوست سانپ گردن اٹھائے میرے سامنے گھاس میں موجود تھا۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر جیب میں ڈالا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ٹیلے سے دوسری طرف اترنے لگا۔ یہ امر طے شدہ تھا کہ سانپ میجر کی بیوی ورشا سنگھ کو ڈس آیا تھا۔ اب یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ ورشا سنگھ زندہ ہے یا سانپ کے زہر سے مر گئی ہے۔ اس کا علم مجھے دوسرے دن ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ سانپ بول کر مجھے نہیں بتا سکتا تھا کہ جس عورت کو میں نے ڈسا ہے وہ مری نہیں زندہ ہے مگر بے ہوش ہے۔ جس راستے سے میں گیا تھا اسی راستے سے ہو کر چھپتا چھپاتا میں اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ لکڑی کے جھونپڑے میں آتے ہی میں نے دھسہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور جیب سے سانپ کو نکال کر پوچھا۔

"دوست! تم نے ورشا سنگھ کو مارا تو نہیں؟ وہ بے ہوش ہی ہوئی ہے ناں؟"

سانپ نے اثبات میں سر ضرور ہلایا مگر مجھے پوری طرح سے یقین نہیں آیا تھا۔ اس کا علم دوسرے روز وہاں جا کر ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے سانپ کو اپنی چارپائی کے پاس ہی نمدے پر بٹھا کر دودھ پلایا اور کہا۔

"دوست! اگر تم نے ہدایات کے مطابق عمل کیا ہے تو میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب تم آرام کرو' باقی باتیں کل ہوں گی۔"

میں نے سانپ کو جھونپڑی کے پیچھے اس کے چٹانی کھوہ میں لا کر بٹھا دیا اس کے اردگرد خشک گھاس ڈالی اور اپنے کمرے میں یا جھونپڑے میں آ کر گرم بستر میں گھس گیا۔

باقی کی رات میں بے سدھ ہو کر صبح تک سویا رہا۔ دن کے دس بج رہے تھے جب میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ بوڑھے کشمیری نے میرے لیے ناشتہ تیار کر کے رکھا ہوا تھا۔ میں نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔ کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ کمانڈو شیر باز خان آ گیا۔ کہنے لگا۔

"ابھی تم میجر ارجن سنگھ کے کوارٹروں کی طرف مت جانا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں وہاں کیا ہو گیا ہے؟"

کہنے لگا۔ "میجر ارجن سنگھ کی بیوی کو رات کوئی سانپ کاٹ گیا ہے۔ وہ بے ہوش پڑی ہے۔ میڈیکل کور کے سارے ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے ہیں مگر اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا۔"

"کیا میجر کی بیوی گھر پر ہی ہے؟"

کمانڈر شیر باز بولا۔

"نہیں اسے ملٹری ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ وہیں اس کا علاج ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ ہمارے حق میں بڑا اچھا ہوا ہے۔"

شیر باز میرا منہ تکنے لگا۔

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔"

میں نے کہا۔

"میں جوگی سادھوؤں کا لباس تم سے اسی لیے منگوایا تھا کہ میں جوگی بن کر ان کے گھر جاؤں گا اور اپنے ہندی مائتھیولوجی اور ویدوں اور سنسکرت کے تھوڑے علم کا ان پر رعب جما کر ان کو زیر اثر کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن سانپ کے کاٹنے سے میرا راستہ آسان ہو گیا ہے۔"

"تم کیا کرو گے؟" شیر باز نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "یہ بھی ایک طرح کا جہاد ہے۔ میں وہ کام کروں گا جو فوجی ہسپتال اور انڈین میڈیکل کور کا کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکتا۔"

"کیا تمہارے پاس سانپ کا مہرہ ہے جس کے ذریعے تم میجر کی بیوی کا زہر نکال سکو گے؟"

میں نے کہا۔ "تم یہی سمجھ لو کہ میرے پاس سانپ کا مہرہ ہے۔"

شیر باز بولا۔ "ہو سکتا ہے تمہارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ڈاکٹر سانپ کے زہر کا اثر ختم کر دیں اور میجر کی بیوی کو ہوش آ جائے۔"

میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔"

اس سے زیادہ میں نے کچھ نہ کہا۔ اس سے زیادہ میں ابھی کمانڈو شیر باز کو کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کمانڈو شیر باز خان کمانڈو اٹیک کا آدمی تھا۔ دشمن کے مورچوں میں گھس کر شب خون مارنے والا باعمل مجاہد تھا۔ میری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں خود چونکہ مطمئن تھا اس لیے شیر باز کو سمجھانے کی ضرورت نہیں تھا۔ یہ معلوم کر کے اپنے دوست سانپ کے بارے میں میرے اعتماد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کہ میجر کی بیوی مری نہیں تھی زندہ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سانپ نے میری ہدایت کے مطابق عمل کیا تھا اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی تھی کہ جب تک میں میجر کی بیوی کا علاج نہیں کروں گا وہ بے ہوش ہی رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ خیال بھی تھوڑا تھوڑا پریشان کر رہا تھا کہ سانپ کے کاٹے کے ایسے ایسے انجکشن تیار ہو چکے ہیں کہ اگر بر وقت مریض ڈاکٹر کے پاس پہنچ جائے تو اسے انجکشن لگا کر مرنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے جلدی جلدی اپنا بہروپ سادھوؤں جوگیوں والا بنانا شروع کر دیا۔

سارے کپڑے اور ماتھے پر لگانے والے تلک کا سرخ رنگ اور کرمنڈل وغیرہ کمانڈو شیر باز پہلے ہی وہاں لا چکا تھا۔ میں پندرہ بیس منٹ میں پورا سادھو بن کر تیار ہو گیا۔ شیر باز مجھے بے نیازی سے دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے میری لائن آف ایکشن پر اتنا زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"تم تو بالکل سادھو بن گئے ہو۔ کیا ابھی ملٹری ہسپتال جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں میں ملٹری ہسپتال نہیں جاؤں گا۔ میں میجر ارجن سنگھ کے گھر جاؤں گا۔"

"وہاں جا کر کیا کرو گے؟" شیر باز بولا۔ "میجر کی بیوی تو فوجی ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرے ایک اشارے پر وہ لوگ میجر کی بیوی کو اٹھا کر گھر لے آئیں گے۔ میرے پاس ایک زبردست طلسمی منتر ہے۔"

کمانڈو شیر باز ہنسنے لگا۔ بولا۔

"میرا خیال ہے تم کھانا میرے ساتھ کھا لو ہو سکتا ہے میجر ارجن سنگھ کے ہاں تمہیں کھانے کو بھنا ہوا گوشت نہ ملے۔"

میں نے بھی ہنس کر کہا۔ "میں جو کہوں گا وہاں آ جائے گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

میں مکان سے نکل کر پیچھے جو گھاٹی کی ڈھلان تھی اس طرف جانے لگا تو کمانڈو شیر باز کی آواز آئی۔

"اس طرف سے کیوں جا رہے ہو۔ سیدھی سڑک پر سے جاؤ۔ تمہیں اس بھیس میں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔"

مگر مجھے تو پیچھے گھاس پھوس کی جھونپڑی کے قریب چٹان کی کھوہ میں سانپ بیٹھا تھا۔ اسے ساتھ لینا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن میں احتیاط سے کام لینا چاہتا ہوں۔"

پیچھے آ کر میں نے اپنے دوست سانپ کو ہتھیلی پر رکھ لیا اور کہا۔

"میرے دوست! تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ تم نے وہی کیا جو میں نے تمہیں کہا تھا۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ جس عورت کو تم ڈس کر آئے ہو اس کے جسم کا زہر تم چوس بھی لو گے؟"

میں سانپ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سانپ نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ میجر ارجن سنگھ اور اس کی بیوی کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے میرے پاس ہی سب سے بڑا حربہ تھا۔ اس کے بعد سانپ سے ایک سوال پوچھنا بہت ضروری تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"دوست! میجر کی بیوی کے جسم سے تمہارے زہر چوسنے سے پہلے تو اس کو ہوش نہیں آ جائے گا؟"

سانپ نے دوسری مرتبہ سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا۔ حیران اس لیے کہ یہ سانپ میری باتیں کس قدر صحیح طور پر سمجھ رہا تھا اور خوشی اس بات کی ہوئی کہ میجر کی بیوی ہوش میں نہیں آئے گی جب تک کہ میں اپنی کرامت نہیں دکھاتا۔ میں نے سانپ کو اٹھا لیا اور کہا۔

"میرے دوست! تم بھی میرے ساتھ کشمیر کے جہاد میں شریک ہو۔ آزادی کشمیر اور پاکستان کی سلامتی کے مشن کے تم بھی ایک مجاہد ہو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ اس عورت کے گھر لیے جا رہا ہوں جس کو رات تم نے ڈسا تھا۔ وہاں پہنچ کر جب میں تمہیں کہوں تو تمہیں اس کے جسم میں سے اپنا سارا زہر چوس لینا ہو گا۔"

میں نے سانپ کو اس گودڑی میں ڈال لیا جو میں نے اپنے کندھے کے ساتھ لٹکائی ہوئی تھی یہ گودڑی بھی گیروے رنگ کی سادھوؤں والی تھی۔ اسی رنگ کا میرا چولا بھی تھا۔ پاؤں میں جوتی تھی اور کندھوں پر میں نے کشمیری لوئی ڈال رکھی تھی۔ جوگی لوگ تو لوئی نہیں رکھتے مگر میں اصلی جوگی نہیں تھا۔ مجھے

سردی لگ رہی تھی۔ میں ٹیلے کی اترائی اتر کر سری نگر شہر کو جانے والی سڑک پر آ گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں لوہے کی سلاخ والا ترشول تھا۔ گلے میں رِیٹھوں کی مالائیں تھیں۔ کلائیوں میں کانچ کے کڑے تھے۔ ماتھے پر شیو دیوتا کے پجاریوں والے تلک کا نشان تھا۔ اس مشن پر مجھے اپنے ساتھ کمانڈو چاقو یا پستول لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا سب سے بڑا ہتھیار میرا دوست سانپ میرے پاس تھا۔ یہ مشن جاسوسی کا مشن تھا۔ کمانڈو آپریشن کا مشن نہیں تھا۔ کمانڈو آپریشن کا مشن اس کے بعد شروع ہونے والا تھا۔ جب ہمیں یہ معلوم ہو جاتا کہ انڈین آرمی ہائی کمان سری نگر شہر سے دور جنگل کی پہاڑیوں کے زیر زمین کس قسم کا پر اسرار پراجیکٹ شروع کر رہی ہے۔

میں نے ایک بس پکڑی اور سری نگر کے ایک چوک میں جا کر اتر گیا۔ یہاں سے میں پیدل ہی فوجی ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ فوجی ہیڈ کوارٹر کے پیچھے میجر ارجن سنگھ کا آفیسر کوارٹر تھا۔ بھارت میں لوگ سپیروں کے پیچھے بھی لگ جاتے ہیں کیونکہ وہ بین بجا رہا ہوتا ہے لیکن جوگی سادھوؤں کی طرف اس وقت تک کوئی دھیان نہیں دیتا جب تک کہ ان کے ساتھ کسی کو کوئی کام نہ پڑے۔ ویسے بھی بھارت کے شہروں میں آوارہ گائے بیلوں کی طرح جوگی سادھو لوگ عام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہندو لوگ سادھوؤں کی عزت بھی کرتے ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ان کی بددعاؤں سے ڈرتے بھی بہت ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی جوگی یا سادھو ناراض ہو کر بد دعا دے دے تو اس کی بد دعا لگ کر رہتی ہے۔ اسی طرح ہندو لوگ گائے اور بیل کا بھی بے حد احترام کرتے ہیں۔ گائے کو تو وہ ماں کے برابر سمجھتے ہیں اور بیل کا اس لیے احترام کرتے ہیں کہ نندی بیل دیوتا شیوا کا پسندیدہ اور محبوب بیل تھا جس کی وہ سواری کیا کرتا تھا۔ چنانچہ شیو دیوتا کے مندروں میں نندی بیل کے بڑے بڑے بت بھی بنے ہوتے ہیں۔

مجھے کسی سی آئی ڈی کا خطرہ نہیں تھا۔ جوگی سادھوؤں سے سی آئی ڈی والے ہندو اہل کار بھی گھبراتے ہیں کہ کیا خبر جس جوگی کا وہ مفرور ملزم یا جاسوس سمجھ کر پیچھا کر رہے ہیں وہ اصلی جوگی سادھو نکل آئے اور ان کو بد دعا دے دے۔

میں بڑے اطمینان کے ساتھ سادھوؤں کی طرح چلتا آفیسرز کوارٹرز والی چھوٹی سڑک پر آگیا۔ یہاں چھ کوارٹر چھوڑ کر میجر ارجن سنگھ کا کوارٹر تھا۔ کوارٹر کے باہر ایک فوجی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے پاس ایک فوجی جوان موجود تھا۔ میں سادھوؤں کی طرح شان بے نیازی سے چلتا فوجی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ جاتے ہی میں نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

"کیا اس کوارٹر میں ایک سانپ نے کسی عورت کو کاٹا ہے؟"

فوجی جوان بھی ہندو تھا۔ سادھوؤں اور جوگیوں کا احترام کرنا اس کے خون میں شامل تھا۔ بولا۔

"ہاں مہاراج یہی وہ کوارٹر ہے"

میں نے ترشول والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے۔

اس میلا (عورت) کو ہمارے سامنے لاؤ ہم ابھی اس کو ٹھیک کرے گا۔"

فوجی جوان بولا۔ "مہاراج وہ میجر صاحب کی دھرم پتنی ہے۔ میجر صاحب اسے ہسپتال لے گئے ہیں۔"

میں نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا۔

"مورکھ وہ ہسپتال میں مر جائے گی۔ اس کا علاج ہمارے سوائے اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ اسے ہمارے پاس لاؤ۔"

میری آواز سن کر اندر سے دو عورتیں باہر نکل آئیں۔ ان میں ایک ذرا جوان تھی اور دوسری بوڑھی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میری آواز سن کر اندر سے کوئی آ جائے۔ بوڑھی عورت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مہاراج! میری چھوٹی بہن کی بچی کو سانپ نے کاٹا ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے مہاراج۔"

میں نے اپنا جملہ دہراتے ہوئے کہا۔

"مورکھ بہن! تمہاری بھانجی ہسپتال میں سورگباش ہو جائے گی۔ اگر اس کی زندگی چاہتی ہو تو اسے فوراً میرے پاس لاؤ۔ ہم اس کا علاج کر دے گا۔ ہسپتال والے کچھ نہیں کر سکتے۔"

دوسری عورت بھی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! اندر آ جائیں۔ میں ابھی ہسپتال میجر صاحب کو فون کرتی ہوں۔"

میں یہی چاہتا تھا میں اندر چلا گیا۔ انہوں نے مجھے ایک سجے سجائے خوبصورت کمرے میں صوفے پر بٹھا دیا۔ میں ادلکھ نرنجن اولکھ نرنجن کا ورد کرنے اور سر ہلانے لگا۔

"جلدی فون کرو میجر صاحب کو۔ سانپ کا زہر عورت کے جسم میں پھیل چکا ہے۔ دیر کر دی تو وہ پرلوک سدھار جائے گی۔"

جوان عورت ٹیلی فون کرنے لگی وہ گھبرائی ہوئی بھی تھی اور اضطراب کی حالت میں بھی تھی۔ پھر اس نے کسی سے کہا۔

"ہیلو! کون ارجن بھیا؟ بھیا۔"

اس نے میجر ارجن کو بتایا کہ ایک دھرم آتما سادھو آیا ہے جو ورشا کو ٹھیک کر دے گا۔ بھگوان کے لیے اسے لے کر یہاں آ جائیں۔ دوسری طرف سے فوجی ڈوگرے نے جھڑک دیا ہو گا۔ جس کے جواب میں جوان عورت اس کی منت سماجت کرنے لگی کہ ورشا بہن ہسپتال میں مر جائے گی۔ سادھو مہاراج نے کہہ دیا ہے کہ اسے فوراً یہاں لے آؤ۔ جب میں نے یہ صورت حال دیکھی تو جوان عورت سے کہا۔

"فون مجھے دو۔"

میں نے فون ہاتھ میں لیتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔

"سن ارجن سنگھ سن! تیری پتنی کو شیو مہاراج کے اگنی سانپ نے کاٹا ہے۔ ہم تیری پتنی کو ٹھیک کرنے آئے ہیں۔ اسے لے کر فوراً" ہمارے پاس آ جا۔ دیر کر دی تو تیری پتنی مرجائے گی۔"

اور میں نے فون بند کر دیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد باہر ایک گاڑی آ کر کھڑی ہوئی۔ بوڑھی عورت میرے قدموں میں بیٹھی رہی جوان عورت باہر کو دوڑی۔ دو منٹ بعد دو فوجی جوان ایک سٹریچر اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔ سٹریچر پر ایک جوان خوش شکل عورت بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا ناٹے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا مالک ایک فوجی افسر ساتھ تھا جو پریشان تھا۔ کاندھے پر میجر کا کراؤن لگا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔

"مہاراج! مجھے شما کر دیں۔"

پھر جوان عورت سے کہا۔

"بڑی دیدی! ورشا کو بیڈ روم میں لٹا دو۔"

میں نے میجر سے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا' میرا مطلب ہے تمہارا پورا نام کیا ہے؟"

"ارجن سنگھ مہاراج!"

"ہوں۔ تو بڑا دھن وان ہے ارجن سنگھ کہ ہمیں تمہاری مدد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ سارا چمتکار تیری سورگباش ماتا جی کی آتما کی پرارتھنا کا ہے۔ سورگ میں تمہاری ماتا جی کی آتما پریشان ہوگئی۔ وہ شیو دیوتا کی بھگتی تھی۔ اس نے شو دیوتا کے آگے رو رو کر فریاد کی کہ میری بہو کو بچا لو۔ شیو دیوتا کو رحم آ گیا۔ شیو جی نے ہمیں حکم دیا کہ جاؤ اور جا کر ارجن سنگھ کی پتنی کا علاج کرو۔"

ہندو ویسے ہی اس معاملے میں ضعیف الاعتقاد ہوتا ہے اور اگر آگے کوئی سادھو زیادہ رعب والا ہو اور کڑک دار آواز میں حکم دینے کے انداز میں بولے تو ہندو چاہے وہ پردھان منتری ہی کیوں نہ ہو ایک بار اپنی جگہ سے ضرور ہل جاتا ہے۔ ارجن سنگھ پہلے ہی اپنی جگہ سے ہل چکا تھا کیونکہ بعد میں پتہ چلا کہ ہسپتال کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ آدھی رات سے لے کر دن کے بارہ بجے تک وہ ورشا کا علاج کرتے رہے تھے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ ورشا کا سانس بھی اکھڑنے لگا تھا۔ ڈوگرہ میجر تو میرے پاؤں پر گر پڑا۔

"مہاراج! آپ انتریامی ہیں۔ میری پتنی کو بچا لیں۔ ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا ہے۔"

میں نے کڑک کر کہا۔

"ارجن سنگھ سن! سن ارجن سنگھ سن! سردم برہیم جگتے۔ جانتے ہو سنسکرت کے اس اشلوک کا مطلب کیا ہے؟ تم کیا سمجھو گے تم مورکھ ہو' نادان ہو' چلو اندر چلو ہم تمہاری پتنی کو دیکھیں گے۔"

ارجن سنگھ میجر مجھے بڑے ادب سے بیڈ روم میں لے آیا۔ بیڈ روم بھی بڑی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر بھارتی اور ہالی ووڈ کی ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ بڑا عیاش انڈین میجر تھا یہ۔ ورشا بیڈ پر بالکل سیدھی بے ہوش پڑی تھی۔ گردن تک قیمتی گرم کمبل پڑا تھا۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ میں نے یونہی ورشا کی نبض دیکھی اور سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"ارجن سنگھ! تم نے بڑی دیر کر دی۔ بڑی دیر کر دی تم نے ارجن سنگھ۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

ارجن سنگھ اور بوڑھی عورت تو میرے پاؤں پر گر پڑے اور التجائیں کرنے لگے کہ میں کسی طرح ورشا کو بچا لوں۔ میں پوری اداکاری کر رہا تھا۔ میں نے

ترشول اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بس بس پیچھے ہٹ جاؤ۔"

دونوں جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے کہا۔

"مجھے دھیان لگانے دو۔ شیو جی مہاراج کے چرنوں میں جا کر ان کی آگیا لینی ہوگی۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اوم نشوا اوم نشوا کے الفاظ تین بار بولے اور چپ ہوگیا۔ میں نے زور سے سانس اوپر کھینچ لیا۔ میں بہت بے معلوم انداز میں سانس لے رہا تھا وہاں بیٹھے ہوئے لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں نے دم روک لیا ہے جس طرح کہ سادھو لوگ عام طور پر حبس دم کیا کرتے ہیں۔ کوئی تین منٹ اسی حالت میں رہنے کے بعد میں نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر ارجن سنگھ کی طرف دیکھا۔

"سن ارجن سنگھ سنگ! شیو جی مہاراج نے تم پر اپنی خاص کرپا کی ہے۔ تیری پتنی اب ٹھیک ہو جائے گی۔"

میجر اور دونوں عورتیں تو خوشی سے نہال ہوگئیں۔ میجر کی بیوی ورشا کی حالت واقعی ایسی تھی کہ لگتا تھا مرنے والی ہے۔ میرے دوست سانپ کا زہر واقعی بہت مہلک تھا حالانکہ اس نے اس کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل کیا تھا کہ جس سے وہ صرف بے ہوش ہو جائے۔ میں بھی اب زیادہ دیر نہیں لگانا چاہتا تھا کہ کہیں سارے کئے کرائے پر پانی نہ پھر جائے۔ میں اٹھ کر ورشا کے قریب کرسی بچھوا کر بیٹھ گیا۔ کچھ ڈرامہ کرنا بھی بہت ضروری تھا۔ میں نے ارجن سنگھ سے کہا۔

"ارجن سنگھ! جلدی سے ایک پیالی میں اپنے ہاتھ سے دودھ ڈال کر لے آ۔"

وہ دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے سنسکرت کے جو چھ سات اشلوک مجھے

یاد تھے اونچی آواز میں پڑھنے شروع کر دیے پھر بوڑھی عورت سے کہا۔

"بالکہ! گھر میں لوبان ہو تو اسے سلگا دو۔"

بوڑھی عورت بھی دوڑ کر بیڈ روم سے باہر نکل گئی۔ اتنے میں ارجن سنگھ دودھ سے بھری ہوئی پیالی لے کر آ گیا۔ میں نے کہا۔

"وہ چھوٹی میز یہاں لے آؤ۔"

ارجن سنگھ بالکل نوکروں کی طرح کام کر رہا تھا۔ خدا کسی پر مصیبت نہ ڈالے مصیبت میں آدمی اپنی حیثیت وغیرہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس نے چھوٹی میز لا کر ورشا کے پلنگ کے پاس میرے سامنے لا کر رکھ دی۔ میں نے دودھ کی پیالی میز پر رکھ دی۔ بوڑھی عورت تھالی میں لوبان سلگا کر لے آئی۔ میں نے عورت سے کہا۔

"لوبان پلنگ کے سرہانے کی طرف نیچے رکھ دو۔"

عورت نے ایسا ہی کیا۔ لوبان کی بو سے میرا بھی ناک میں دم آنے لگا۔ میں نے خوامخواہ لوبان منگوا لیا تھا۔ مگر اب ڈرامہ پورا کرنا بڑا ضروری تھا۔

"دروازہ بند کر دو۔ کوئی اندر نہ آئے' نہ اندر سے کوئی باہر جائے۔"

ارجن سنگھ خود اٹھ کر دروازے تک گیا۔ باہر منہ نکال کر اس نے کسی سے کہا۔

"کسی کو اندر نہ آنے دینا۔"

اور دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ وہ پلنگ کی پائینتی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف جوان عورت بیٹھی تھی۔ بوڑھی عورت میری کرسی کے پاس قالین پر ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی۔

اس وقت اگر آپ مجھے دیکھتے تو آپ بھی یہی سمجھتے کہ میں کوئی بڑا پہنچا ہوا جوگی سادھو ہوں۔ اب مجھے ڈرامے کا کلائمکس سین کرنا تھا۔ میں نے کھدر کے جھولے میں ہاتھ ڈالا اور اندر سے بالشت بھر کے سانپ کو باہر نکال کر ہتھیلی پر

بٹھا لیا۔

سانپ کو دیکھ کر قالین پر بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت ڈر کر پرے ہٹ گئی۔ میجر ارجن سنگھ اور جوان عورت پلنگ کی پائینتی سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ یہ سب لوگ میری ہتھیلی پر بیٹھے ہوئے سانپ کو ڈری ڈری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

میں نے سانپ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میرے وشوامتر! اگنی سانپ کے ساتھی! شیو جی مہاراج کے حکم پر اس عورت کے جسم میں اگنی سانپ نے جتنا زہر داخل کیا ہے وہ سارے کا سارا چوس لے۔"

دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ یا اللہ پاک تو جانتا ہے کہ میں یہ سارا ڈرامہ کسی روپے پیسے کے لالچ میں نہیں کر رہا۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں دشمن کے پاکستان اور آزادی کشمیر کی جدوجہد کے خلاف جو ناپاک عزائم ہیں انہیں تباہ و برباد کرنے کے لیے کر رہا ہوں تو ہر شے پر قادر ہے۔ سانپ کو حکم دے دے کہ وہ عورت کے جسم سے سانپ کا زہر چوس لے۔ ذرا غور کریں۔ اگر اس وقت سانپ میری بات نہ مانتا اور میری ہتھیلی پر ہی بیٹھا رہتا تو مجھے کس قدر ذلت اور ندامت اٹھانی پڑتی۔ لیکن اللہ پاک نے میری عزت رکھ لی۔ سانپ میرا حکم سنتے ہی میری ہتھیلی پر سے اچھل کر بے ہوش عورت کے جسم پر کمبل کے اوپر گرا اور اس کے پاؤں کی طرف رینگنے لگا۔ عورت یعنی میجر ارجن سنگھ کی پتنی ورشا کے پاؤں کمبل کے اندر تھے۔ سانپ پاؤں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا بلکہ مجھے عقل آ گئی۔ سانپ میری طرف دیکھ رہا تھا' بلکہ کہہ رہا تھا۔

"احمق انسان! عورت کے پاؤں کمبل سے باہر نکلوا۔ میں نے کمبل کے اندر گھس کر عورت کے ٹخنوں پر منہ رکھ کر زہر چوسا تو کسی کو نظر نہیں آئے گا۔

سب یہی کہیں گے کہ یہ ہسپتال کے ڈاکٹروں کی دوائیوں کا اثر تھا کہ ورشا کو ہوش آگیا ہے۔ سانپ نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"عورت کے دونوں پاؤں کمبل سے باہر نکال لو۔ جلدی کرو۔ شیو مہاراج کا سانپ تمہارا نوکر نہیں ہے کہ انتظار کرے۔"

ارجن سنگھ نے لپک کر اپنی پتنی کے دونوں پاؤں کمبل سے باہر نکال دیئے اور سانپ سے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے سانپ سے کہا۔

"میرے بچے! میرے وشوامتر! اس ابھاگن میجر کی بیوی کے پاؤں کے بدن سے اگنی سانپ کا سارا زہر چوس لے اور اس کو پھر سے سوبھاگن بنا دے۔"

دل میں کہنے لگا۔ یا اللہ میری عزت رکھ لینا۔ سانپ نے میجر کی بیوی کے پاؤں کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ کمال ہے یہ سانپ بھی مجھے دیکھ کر ڈرامہ کرنے لگا تھا۔ حالانکہ اسے پتہ تھا کہ اس نے ورشا کو کس ٹخنے کے پاس ڈسا ہے۔ یا ہو سکتا ہے وہ کوئی اپنی رسم روایت پوری کر رہا ہو۔ ورشا کے دونوں پاؤں آدھی پنڈلیوں تک ننگے تھے۔ پاؤں بھی زرد ہو رہے تھے۔ آخر سانپ نے ورشا کے بائیں ٹخنے پر ایک جگہ اپنا منہ لگا دیا۔ بیڈ روم میں عجیب دہشت ناک قسم کی خاموشی چھا گئی۔ کسی کے سانس لینے کی بھی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سب دم بخود تھے۔ ارجن سنگھ اور جوان عورت آنکھیں پھاڑے سانپ کو ورشا کے جسم کا زہر چوستے دیکھ رہے تھے۔ بوڑھی عورت بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی خوف و دہشت کے اثرات تھے۔ کوئی ایک منٹ تک سانپ زہر چوستا رہا۔ پھر اس نے اپنے منہ سے سیاہ رقیق مادہ جو یقیناً" زہر ہی ہوگا کمبل پر اگل دیا۔ دونوں عورتوں کے حلق سے خوف زدہ آوازیں نکل گئیں۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ڈانٹ دیا کہ خبردار کوئی آواز نہ نکالو۔

سانپ زہر چوستا اور پھر کمبل پر ہی زہر اگل دیتا۔ اس طرح اس نے کوئی دس بارہ مرتبہ کیا۔ پھر آہستہ آہستہ کمبل کے اوپر سے رینگتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ میں نے اسے آہستہ سے ہتھیلی پر اٹھا کر تپائی پر بٹھا دیا اور کہا۔

"میرے بچے! میرے متر! لے اب دودھ پی لے۔"

سانپ کے ہونٹ زہر کی وجہ سے سیاہ ہو رہے تھے۔ اس نے پیالی میں سے دودھ پینا شروع کر دیا۔ اتنے میں بے ہوش ورشا نے ایک گہرا سانس لیا۔ ارجن سنگھ اور دونوں عورتوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ وہ ورشا کے سرہانے کی طرف لپکے۔ میں نے انہیں ڈانٹ دیا۔

"خبردار! ابھی اس کے قریب مت جانا۔"

تینوں جہاں تک آئے تھے وہیں رک گئے۔

"پہلے میرے بچے کو' میرے وشوامتر کو دودھ پی لینے دو۔"

ارجن سنگھ اور بوڑھی عورت نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"جے شیو شنکر کی جے۔"

وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو کر کھڑے تھے اور ورشا کو ہوش میں آتے دیکھ رہے تھے۔ میں دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ ورشا نے اپنے سر کو دو تین بار دائیں بائیں پھیرا۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ دونوں عورتیں اور ارجن سنگھ میرے حکم کے منتظر تھے کہ میں انہیں حکم دوں تو وہ ورشا کی طرف بڑھ کر اس کو مبارک باد دیں۔ اسے گلے لگائیں۔ ورشا نے مجھے بھی دیکھا۔

سانپ کو بھی دیکھا جو دودھ پی رہا تھا۔ اس پر دہشت طاری ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خشک سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہی سانپ تھا' یہی سانپ تھا۔"

وہ سچی تھی۔ اس نے جب سانپ نے اسے ڈسا تھا تو اس کو ٹیبل لیمپ جلا کر پلنگ سے اتر کر قالین پر رینگتے ہوئے دیکھ لیا تھا میں نے فوراً" کہا۔

"مورکھ عورت! یہ وہ سانپ نہیں ہے۔ وہ اگنی سانپ تھا۔ یہ سانپ شیتل سانپ ہے۔ یہ شیو دیوتا نے تجھے بچانے کے لیے بھیجا ہے۔ اس سانپ نے تجھے ہلاک کرنے کے لیے ڈسا تھا۔ اس سانپ نے تیرے بدن کا سارا زہر چوس کر تجھے پر سے زندہ کر دیا ہے۔"

ورشا آنکھیں کھول کر دودھ پیتے سانپ کو دیکھنے لگی۔

"ہاں مہاراج! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ دوسرا سانپ تھا۔ آہ! مجھے نیند آ رہی ہے۔"

میں نے اس کے خاوند ارجن سنگھ اور دونوں عورتوں سے کہا۔

"اس کو پیار کرو۔ دلاسا دو دیوتاؤں نے اس کو دوبارہ زندگی دی ہے۔"

ارجن سنگھ اور دونوں عورتیں، ورشا کے پاس جا کر اس کو حوصلہ دلاسا اور تسلیاں دینے لگے۔ ورشا کمزور آواز میں کہہ رہی تھی مجھے نیند آ رہی ہے، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

بوڑھی عورت نے کہا۔

"پترا! اسے سونے نہ دینا۔ زہر پھر اثر کرنے لگے گا۔"

میں نے اسے جھڑک دیا۔

"مائی تم کون ہوتی ہو کوئی حکم دینے والی۔"

پھر میں نے ارجن سنگھ سے کہا۔

"ارجن سنگھ! اپنی پتنی کو بے شک سو جانے دو۔ جب یہ سو کر اٹھے گی تو تر و تازہ ہوگی۔ ہاں اس کے لیے تین چوزوں کی یخنی تیار کر کے رکھ لے۔ جب سے اٹھے گی تو ہم اسے خود پلائیں گے۔ اس کے جسم کی کھوئی ہوئی طاقت واپس آ جائے گی۔"

میجر ارجن سنگھ فوراً بیڈ روم کے دروازے کی طرف دوڑ پڑا تاکہ چوزوں کی یخنی تیار کروانے کا آرڈر دے دے۔ یہ لوگ میرے مرید ہو گئے تھے۔ میں

نے چھٹکار یعنی کرامت ہی ایسی دکھائی تھی کہ انہیں مرید ہونا ہی تھا۔ آپ سب نے سانپ کو قبرستانوں میدان جنگل میں ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے یا سپیروں کے آگے بین پر جھومتے دیکھا ہوگا۔ آپ میں سے شاید یہ ایک آدھ نے سانپ کو کسی انسان کو ڈستے بھی دیکھ لیا ہو مگر آپ میں سے کسی نے آج تک سانپ کو انسان کے جسم سے زہر چوستے نہیں دیکھا ہوگا۔ یہ اللہ کے حکم سے اور میرے دوست سانپ کی مہربانی سے ہوگیا تھا اور وہ لوگ میرے مطیع ہوگئے تھے۔

میں ورشا کے پلنگ سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ سانپ کو میں نے اپنے جھولے میں واپس رکھ لیا تھا۔ ارجن سنگھ، بوڑھی اور جوان دونوں عورتیں میرے قدموں میں قالین پر بیٹھی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ انہیں جو اشلوک مجھے یاد تھے سنا سنا کر ان کا مطلب بتا رہا تھا۔ میرے آگے میز پر ملازمہ چینی کی قیمتی تھالیوں میں طرح طرح کی مٹھائیاں اور پھل رکھ گئی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے خوب سیر ہو کر پھل اور مٹھائیاں کھا لی تھیں اور اب کشمیری قہوہ پی رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کی نیند کے بعد ورشا نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بالکہ! اب طبیعت کیسی ہے؟"

ورشا اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میجر اور دونوں عورتیں بھی پلنگ پر اس کے پاس جا بیٹھیں۔ کوئی اس کے بال ٹھیک کرنے لگی۔ کوئی اس کی بلائیں لے رہی تھی۔ ارجن سنگھ اپنی بیوی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے دبا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"ورشا ڈارلنگ! گوروجی کی کرپا سے تم بالکل ٹھیک ہوگئی ہو۔ سانپ نے تیرے بدن کا سارا زہر چوس لیا ہے۔"

اس دوران ورشا کا وہ کمبل جس پر سانپ نے زہر چوس کر اگلا تھا تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ورشا نے سہم کر پوچھا۔

"کیا سانپ نے میرے جسم کا زہر نکالا تھا؟"

میں نے کہا۔ "ورشا! گھبرانے کی ضرورت نہیں سانپ نے شیو مہاراج کے حکم پر تمہارے جسم میں سے سانپ کا زہر چوس کر پھینک دیا ہے۔ اب تو پوری تندرست ہوگئی ہے۔ تیرے شریر میں ایک رتی بھر بھی سانپ کا زہر نہیں رہا۔"

میں نے ارجن سنگھ سے کہا۔

"ارجن سنگھ!"

"جی مہاراج!" وہ بڑے ادب سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"ورشا بی بی کو یخنی پلاؤ۔"

میجر ارجن نے دروازے میں کھڑی ملازمہ کو اشارہ کیا۔ ملازمہ ٹرالی لے کر اندر آگئی۔ ٹرالی پر یخنی کا پیالہ رکھا ہوا تھا۔ میجر ارجن سنگھ خود اپنی بیوی ورشا کو یخنی پلانے لگا۔ وہ یخنی نہ بھی پلاتا تو اس کی بیوی کو کچھ نہیں ہونا تھا۔ مگر اداکاری کے ساتھ یہ میناکاری بڑی ضروری تھی۔ میں اس کے فوراً بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ترشول والا ہاتھ بلند کر کے کہا۔

اب ہم جاتے ہیں۔ جس کام کے لیے بھگوان شیوا نے ہمیں یہاں بھیجا تھا وہ پورا ہوگیا۔"

میجر ارجن سنگھ اور دونوں عورتیں میرے جانے کا سن کر جیسے پریشان ہوگئیں۔

"مہاراج! ابھی کچھ دیر رک جائیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔"

یہ التجا میجر ارجن سنگھ کی تھی جس کے ساتھ مجھے بڑے کام پڑنے والے تھے۔ مگر میں اس کی عقیدت کو مزید مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں بچہ! ہمیں اس سے زیادہ دیر یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم چلتے ہیں۔"

ارجن سنگھ ہاتھ باندھ کر سامنے آگیا۔ بڑی عاجزی سے بولا۔

"مہاراج! کل رات کا کھانا ہمارے بھون پر کھایئے۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔"

میں خود اپنے مشن کو تیزی سے آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ جب اس نے کل کی دعوت دے دی تو میں نے کہا۔

"اچھا بالکے! اگر تیری اچھیا ہے تو پھر ہم کل صرف تمہاری خاطر آ جائیں گے۔"

دونوں عورتیں اور میجر ارجن سنگھ خوشی سے نہال ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ پلنگ سے ٹیک لگاکر بیٹھی ہوئی میجر کی خوبصورت بیوی ورشا بھی ہاتھ باندھے میری طرف بڑی عقیدت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے دور ہی سے ترشول والا ہاتھ اٹھا کر اسے آشیرباد دی اور کہا۔

"ورشا! فکر مت کر۔ اب تجھ پر سانپ تو کیا کسی چیونٹی کے کاٹے کا بھی اثر نہ ہوگا۔ ہم کل آئیں گے۔ جے گنگا میا! جے ماتا شیراں والی کی جے ہو۔"

اور میں بیڈ روم سے نکل گیا۔ میجر ارجن سنگھ میرے پیچھے پیچھے آیا۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ کو جہاں جانا ہے میری گاڑی آپ کو وہاں چھوڑ آئے گی۔"

میں نے کہا۔ "ارجن سنگھ ہم جوگی سنیاسی ہیں ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ ہم بھی نہیں جانتے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ جے شیو شمبھے!"

اور میں پیدل ہی واپس اس ٹیلے کی طرف چل پڑا جس ٹیلے سے اتر کر میں ان کوارٹروں میں آیا تھا۔ مجھے نہیں پتہ کہ پیچھے میجر ارجن سنگھ کب تک مجھے دیکھتا رہا؟ بہرحال جب میں ٹیلے کے پاس پہنچ کر مڑ گیا تو میں نے پلٹ کر دیکھا فوجی کوارٹر وہاں سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر اوپر چیڑھ کے درختوں میں آ گیا تو جھولے میں سے سانپ کو نکال کر کہا۔

"میرے دوست! تم نے دوستی کا حق ہی نہیں نبھایا بلکہ اسلام کے دشمنوں

کے خلاف جہاد میں اپنے طور پر حصہ ڈالا ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"
بوڑھے کشمیری والی خفیہ کمین گاہ میں آ کر میں نے سانپ کو ایک بار پھر دودھ پلایا اور اسے اس کی کھوہ میں سوکھی گھاس پر بٹھا دیا۔ سانپ نے میری طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر سر نیچے کر کے جلیبی کی طرح ہو گیا اور سر اپنی کنڈلی میں چھپا لیا۔
لکڑی کے جھونپڑے میں بوڑھا کشمیری میرے لیے کھانا لے کر بیٹھا تھا۔
"شیر باز خان ابھی تک نہیں آیا۔ میں نے تم دونوں کا کھانا تیار کر رکھا ہے۔"
میں میجر ارجن سنگھ کے ہاں سے مٹھائیاں اور پھل کھا آیا تھا۔ میں نے بوڑھے کشمیری مجاہد سے کہا۔
"بابا! آج مجھے بھوک نہیں ہے۔ شیر باز کے لیے کھانا رکھ چھوڑو۔ ہو سکتا ہے وہ رات کو کسی وقت آ جائے۔"
کشمیری مجاہد نے کوئی جواب نہ دیا اور کھانے کے برتن اٹھا کر کچن کی طرف چل دیا۔ میں رات دیر تک لحاف اوڑھے جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا طریقہ کار عمل میں لانا ہو گا۔ ڈوگرہ میجر پر اور اس کی ساری فیملی پر میں نے اپنا زبردست اثر ڈال دیا تھا۔ اب مجھے زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی کسی دوسرے انسان پر اثر ڈالنا آسان ہوتا ہے لیکن اس اثر کو اپنے خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا بڑا نازک کام ہوتا ہے۔ اس کے لیے بڑی عقل اور بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے نہ صرف دوسرے پر ڈالا ہوا اثر ختم ہو جاتا ہے بلکہ خود آدمی کی اپنی حیثیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ ایک طرح سے میرا مرید بن چکا تھا۔ یہ انڈین فوجی افسر اس پر اسرار ملٹری پراجیکٹ کا انچارج تھا جو سری نگر شہر کی نواحی پہاڑیوں کے جنگل میں زیر زمین کام کر رہا تھا۔ یا کام کرنے والا تھا۔ مجھے اس خفیہ پراجیکٹ کی پوری سراغ

رسائی کرنی تھی اور پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ ملٹری پراجیکٹ کس نوعیت کا ہے۔ اس کے بعد اگر یہ پراجیکٹ پاکستان اور آزاد کشمیر کی سلامتی اور مقبوضہ کشمیر کے حریت پسندوں کی جدوجہد آزادی کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا تھا تو اسے تباہ و برباد کرنا تھا۔

یہ ایک طرح سے ڈبل مشن تھا۔ پہلا مشن جاسوسی اور سراغ رسانی کا تھا اور دوسرا مشن پراجیکٹ کو تباہ کرنے کا تھا۔ دونوں معاملوں میں انتہائی احتیاط اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی۔ دوسرے دن کمانڈو شیر باز خان آیا تو وہ خوش بھی تھا اور حیران بھی تھا۔ کہنے لگا۔

"حیدر علی! کل میجر ارجن سنگھ کے گھر جو سادھو آیا تھا اور جس نے اسکی بیوی کو موت کے منہ سے نکال لیا تھا اگر وہ تم ہی تھے تو تم نے جو کرامت وہاں دکھائی ہے اس کا چرچا پورے شہر میں جگہ جگہ ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک سپیرے کے پاس ایسا سانپ ہے جس نے میجر کی بیوی کے جسم کا سارا زہر چوس لیا کیا واقعی یہ تم ہی تھے یا وہاں تمہاری بجائے کوئی دوسرا سادھو سپیرا آ گیا تھا؟"

پہلے تو میں نے سوچا کہ شیر باز کو اصل حالات نہ بتاؤں پھر خیال آیا کہ یہ باتیں میں کب تک اس سے چھپا کر رکھوں گا۔ وہ میرا ساتھی ہے اس کے ساتھ مل کر ہی ہمیں اس پر اسرار پراجیکٹ کا پتہ چلانا اور اسے برباد کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے کمانڈر شیر باز کو سارے واقعات بتا دیے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ یہ کارنامہ اسی سانپ کا ہے جس کو وہ پسند نہیں کرتا تھا اور کہا تھا کہ اسے جنگل میں چھوڑ دو۔ شیر باز چہرے پر حیرت کے اثرات لیے میری باتیں سنتا رہا۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو وہ بولا۔

"حیدر علی! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ ایک سانپ یہ کام کر سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ "بہرحال یہ کام اسی سانپ نے کیا ہے یہ کرشمہ اسی سانپ

نے دکھایا ہے میں نے تمہیں کہا تھا کہ یہ میرا دوست سانپ ہے۔ اب تمہیں بھی اسے اپنا دوست سمجھنا ہوگا۔ یہ ہمارا ساتھی ہے اور ہماری کمانڈو پارٹی کا رکن بن چکا ہے۔"

کمانڈو شیر باز پر پھر بھی سانپ کے بارے میں کوئی زیادہ اثر نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔ کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہے۔ میں نے کہا۔

"پہلے چائے پیتے ہیں پھر غور کریں گے۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

کشمیری مجاہد ہمارے لیے کشمیری چائے سے بھرا ہوا سماوار لے کر آ گیا۔ ہم چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک حکمت عملی سوچ لی تھی۔ ایک لائن آف ایکشن تیار کر لی تھی۔ میں نے کمانڈو شیر باز کو اس سے آگاہ کیا تو وہ خاموشی سے غور کرتا رہا۔ پھر بولا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ ٹھیک رہے گا۔"

"کیوں نہیں؟ سو فیصد ٹھیک رہے گا۔"

میں نے جب لائن آف ایکشن یعنی اپنی سراغ رسانی کی پوری تفصیلات اسے بتائیں تو وہ بہت حد تک قائل ہو گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ سراغ رسانی کا یہ مشن آج رات سے شروع ہو جائے گا۔ کیونکہ میں اسی رات میجر ارجن سنگھ کے گھر جانے والا تھا۔ کمانڈو شیر باز نے صرف اتنا کہا۔

"دوست! بے حد محتاط رہنا۔ تم جانی دشمنوں کے پاس جا رہے ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ تمہارے پیچھے خفیہ پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس والے بھی لگ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں اس سے غافل نہیں ہوں۔ تمہیں بہرحال انڈین آرمی کے خفیہ ملٹری پراجیکٹ کا سراغ لگانا ہے خواہ اس کے لیے ہمیں کچھ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

کمانڈو شیر باز شام تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ اس کے بعد وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے میجر ارجن سنگھ کے ہاں جانے کی تیاری شروع کر

دی۔ منہ ہاتھ دھو کر ماتھے پر شیو جی کا نیا تلک لگایا۔ سادھوؤں والا لباس پہنا۔ سانپ کو ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تیار ہو کر سانپ کے پاس اس کی کھوہ میں گیا اور اسے کہا۔

"دوست! میں اپنے ٹارگٹ پر جا رہا ہوں۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے طویل سفر طے کرنا ہے۔ لیکن ہم اس مشن میں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ خدا حافظ!"

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جب بھی میں سانپ کے سامنے جاتا تھا وہ ایک بار ادب سے سر ضرور جھکا دیتا تھا۔ مجھے قادر خان کے الفاظ یاد آ جاتے کہ حیدر علی! یہ سانپ اب تمہارا دوست ہی نہیں بلکہ تمہارا مطیع اور مرید بن چکا ہے۔ یہ تمہیں اپنے مہا ناگ دیوتا کا اوتار سمجھنے لگا ہے۔ یہ تمہارا ہر حکم مانے گا۔ تمہارا غلام بھی ہوگا اور تمہارا دوست بھی ہو گا۔ اس وقت بھی جب میں سانپ کو خدا حافظ کہہ کر جانے لگا تو سانپ نے سر جھکا کر مجھے الوداع کہا۔ میں پہاڑی راستوں سے ہوتا ہوا میجر ارجن سنگھ کے کوارٹروں میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ میجر ارجن سنگھ کا اردلی کوارٹر کے باہر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ کوارٹر کے برآمدے کے باہر بلب روشن تھا۔ جیسے ہی اردلی نے مجھے دیکھا۔ ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور بولا۔

"مہاراج پدھاریئے' میجر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اتنے میں ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ بھی تیز تیز فوجی قدم اٹھاتا باہر آگیا۔ آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! چیونٹی کے گھر نارائن آ گئے ہیں۔ پدھاریئے مہاراج' آیئے۔"

وہ مجھے بڑے احترام کے ساتھ کمرے میں لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ کمرے میں چھ سات دوسری عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ خوب بنی سنوری تھیں۔ کمرے میں طرح طرح کے پرفیومز کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے یہ

دوسرے فوجی افسروں کی بیویاں یا بہنیں ہی تھیں۔ میجر کی بیوی ورشا بھی نہا دھو کر نئی ساڑھی پہنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر سب عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سب نے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ مجھے ان عورتوں سے کوئی کام نہیں تھا بلکہ یہ عورتیں میرے مشن میں رکاوٹ کا باعث بن سکتی تھیں۔ میں صوفے پر نہ بیٹھا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے ترشول اٹھا کر کہا۔

"ارجن سنگھ! کمرے میں سے تمام عورتوں کو نکال دو۔ نہیں تو ہم ابھی واپس جاتے ہیں۔"

میجر گھبرا گیا مگر میرا حکم تھا۔ عورتیں بھی پریشان ہوگئیں۔ میجر نے اسی وقت سب عورتوں کو دوسرے کمرے میں جانے کے لیے کہا۔ میں نے کہا۔

"صرف اپنی پتنی ورشا کو یہاں رہنے دو۔ ہم اس کا علاج کرنے آئے ہیں۔ یہاں کوئی چمتکار دکھانے نہیں آئے۔"

جب کمرے سے تمام عورتیں چلی گئیں اور صرف میجر ارجن سنگھ اور اس کی پتنی ورشا ہی وہاں رہ گئے تو میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھنے کے بعد میجر اور اس کی پتنی بھی صوفے پر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے ترشول ایک طرف رکھ دیا اور جھولے میں سے ایک پرانی نوٹ بک نکال کر اسے کھولا۔ یہ پرانی نوٹ بک کمانڈو شیر باز نے مجھے کہیں سے لا کر دی تھی۔ اس پر میں نے اپنے ہاتھ سے ہندی میں کہیں کہیں اوم اور ہندی کے اشلوک اور تلسی داس کے دوہے لکھ رکھے تھے۔ ایک کاغذ پر میں نے ہندی میں جے شیوا لکھا تھا۔ میں نے وہ کاغذ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ کوئی ایک منٹ تک میں کاغذ کو غور سے تکتا رہا۔ کسی کسی وقت بیچ میں سر کو نفی میں ہلاتا رہا۔ یہ سب اداکاری تھی اور میرے مشن کے لیے انتہائی ضروری تھی۔ پھر میں نے کاپی بند کر دی اور میجر کی پتنی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ورشا رانی! اب تم کیسی ہو؟"

ورشا بڑی عقیدت کے ساتھ بولی۔

"مہاراج آپ کی کرپا سے بالکل ٹھیک ہوں۔ ذرا سی کمزوری باقی ہے۔"

میں نے کہا۔ "بھگوان نے چاہا تو کل تک وہ بھی جاتی رہے گی۔"

میں نے گہرا سانس بھرا اور صوفے سے ٹیک لگا دی۔ ورشا کی طرف گہری نظر سے دیکھا۔ پھر میجر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ارجن سنگھ! تم بڑے خوش قسمت ہو' بڑے بھاگوان ہو۔ تمہاری بیوی کو جس اگنی سانپ نے کاٹا تھا اس کا کاٹا آج تک زندہ نہیں بچا۔ اگر تم ایک دن اور ورشا رانی کو ہسپتال میں رکھتے تو اس کے سارے بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ اگنی سانپ جس کسی کو کاٹتا ہے وہ پہلے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ زہر جسم میں اندر ہی اندر کام کرتا رہتا ہے۔ ایک دن گزر جانے کے بعد آدمی کے خون کے ذرے جلنے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر ایک دم جسم میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔"

ورشا کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ میجر بولا۔

"مہاراج! ہسپتال کے ایک ڈاکٹر نے مجھے پہلے روز ہی بتا دیا تھا کہ آپ کی پتنی کے زندہ بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ زہر اس کے دماغ تک پہنچ چکا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس نے تمہیں ٹھیک کہا تھا ارجن سنگھ۔ ہم عین وقت پر آ گئے اس لیے کہ ہمیں دیوتاؤں کی طرف سے آرڈر ملا تھا۔"

نوکرانی پھل فروٹ رکھ کر چلی گئی۔ ورشا مجھے سیب چھیل چھیل کر دینے لگی۔ یہ عورت واقعی بڑی خوش شکل تھی۔ مگر مجھے اس کی خوبصورتی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اب میں نے وہ بات شروع کی جو میری حکمت عملی اور لائن آف ایکشن کا پہلا قدم تھا۔ میں نے کہا۔

"میجر ارجن سنگھ! اس وقت تمہاری پتنی بھی یہاں موجود ہے۔ میں اس کے سامنے تمہیں ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر ورشا رانی اور میجر کے چہرے لٹک سے گئے۔

"مہاراج! کیا کوئی غلطی ہو گئی ہے ہم سے؟"

میں نے میجر سے کہا۔

"ارے نہیں بالکے! ایسی بات نہیں ہے۔ غلطی تمہاری پتنی سے ہوئی ہے۔"

دونوں حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے ورشا سے کہا۔

"ورشا رانی! جس رات تمہیں اگنی سانپ نے کاٹا تھا اس کی شام کو تم جب اپنے مکان کے باغیچے میں ٹہل رہی تھیں تو تمہارا پاؤں گھاس پر اس جگہ پڑ گیا تھا جس کے نیچے اگنی سانپ کے دو چھوٹے چھوٹے بچے سوئے ہوئے تھے۔ تمہارے پاؤں کے نیچے آ کر اگنی سانپ کا ایک بچہ مر گیا تھا۔ بس اگنی سانپ نے اپنے اس بچے کا انتقام لینے کے لیے رات کو تمہیں آ کر ڈس لیا۔"

میجر ارجن کہنے لگا۔

"مہاراج! اگنی سانپ نے میری پتنی سے اپنے مرے ہوئے بچے کا بدلہ لے لیا۔ اب کس بات کا خطرہ ہے مہاراج؟"

میں نے فوراً کہا۔

"مگر تمہاری پتنی زندہ ہے۔ وہ مری نہیں۔ میں نے اسے بچا لیا ہے۔ اگنی سانپ اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ پھر تمہاری پتنی پر حملہ کرے گا۔"

میرا اتنا کہنا تھا کہ ورشا رونے لگی۔ میجر کا بھی رنگ اڑ گیا۔ اس نے میرے گھٹنے پکڑ لیے اور عاجزی سے بولا۔

"مہاراج! میری پتنی کو بچا لیجئے۔ ورشا کو اگنی سانپ سے بچا لیجئے۔ میں جنم جنم آپ کا داس رہوں گا۔"

یہ میرا پہلا تیر تھا جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگا تھا۔ میں نے کہا۔

"مورکھ! ہماری وجہ سے ہی ابھی تک اگنی سانپ کو تمہاری پتنی کے پاس

آنے کی ہمت نہیں ہوئی' اس لیے کہ ورشا رانی کے بدن کو ہم نے اپنے ہاتھ سے چھوا تھا۔ ہمارے ہاتھ کی خوشبو ورشا رانی کے جسم میں سمو گئی ہے۔ اس خوشبو کی وجہ سے اگنی سانپ اس کے قریب نہیں آتا ورنہ وہ تو تمہارے کوارٹر کے اردگرد رات کوئی چکر لگا چکا ہے۔"

ورشا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"مہاراج اگر یہ بات ہے تو پھر اگنی سانپ میرے پاس کبھی نہیں آ سکے گا۔"

میں نے کہا۔

"مورکھ لڑکی! میرے ہاتھ کی خوشبو زیادہ دیر تک تمہارے جسم میں قائم نہیں رہ سکتی زیادہ سے زیادہ ایک دن اور رہے گی۔ اس کے بعد جیسے ہی میرے ہاتھ کی خوشبو غائب ہوئی اگنی سانپ آ کر تمہیں ڈس لے گا اور پھر شاید تمہیں میں بھی نہیں بچا سکوں گا۔ کیونکہ اگنی سانپ تمہیں ڈس کر بے ہوش نہیں کرے گا۔ وہ اپنے زہر سے اسی وقت تمہارے جسم میں آگ بھڑکا دے گا۔"

ورشا کا چہرہ خوف کے مارے زرد پڑ گیا۔ میجر ارجن سنگھ بھی پریشان ہو گیا۔ کچھ دیر کے لیے ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا۔ میں بھی جان بوجھ کر خاموش رہا۔ میں چاہتا تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی پوچھے کہ اس کا کوئی علاج یا توڑ بھی ہے۔ آخر میجر ارجن نے پوچھ لیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ اس کا کچھ اپائے کریں۔ آپ دیوتا سمان ہیں۔ آپ چاہیں تو میری پتنی کو اس بپتا سے مکتی مل سکتی ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دو تین لمبے لمبے سانس لیے۔ پھر آنکھیں کھول کر کہا۔

"اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اگنی سانپ کو ڈھونڈھ کر ہلاک کر دیا جائے۔"

میجر جلدی سے بولا۔ "مہاراج مجھے بتائیں اگنی سانپ کہاں مل سکتا ہے۔ میں اپنی فوج کی پوری یونٹ بھیج کر اس کے ٹکڑے اڑا دوں گا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم نادان ہو' ارجن سنگھ! تمہاری یونٹ دشمن کی فوج کا تو مقابلہ کر سکتی ہے مگر اگنی سانپ کو نہیں مار سکتی۔ اگنی سانپ تمہاری پوری یونٹ کو جلا کر راکھ کر سکتا ہے۔ تمہارے فوجیوں کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ اگنی سانپ کہاں پر ہے اور سانپ اندھیرے میں چھپ کر تمہارے ایک ایک فوجی کو آگ لگاتا جائے گا۔"

میجر خاموش آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"مہاراج! اگنی سانپ کا کوئی ٹھکانہ تو ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "وہ اگنی دیوی کا سانپ ہے دنیا کی کوئی طاقت اس کے ٹھکانے کا پتہ نہیں لگا سکتی اس کو ہر جگہ زمین جگہ دے دیتی ہے۔ وہ نظر آتے آتے غائب ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر....."

میں جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو گیا۔ ورشا اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ میجر ارجن نے سہمی ہوئی مگر پر امید آواز میں پوچھا۔

"فرمایئے مہاراج اگر کیا؟"

میں نے کہا۔ "اگر میں اگنی دیوی کا یگیہ کروں یعنی چلہ کاٹوں تو میں سانپ کا سراغ لگا کر اسے ہلاک کر سکتا ہوں پھر وہ غائب ہو کر بھی مجھے نظر آ جائے گا۔"

میجر ارجن نے میرے پاؤں چھو کر کہا۔

"مہاراج! ہم پر کرپا کریں۔ آپ یہاں میرے گھر میں یگیہ کریں آپ جو کہیں گے میں لا دوں گا جتنا گھی کہیں گے' جتنا دودھ' چینی کہیں گے لا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "اس یگیہ کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ہمیں صرف ایک خالی کمرہ چاہیے اور ایک موم بتی چاہیے۔ باقی ہمیں اگنی دیوی کے اشلوک پانچ ہزار بار دل میں پڑھنے پڑیں گے۔"

میجر ارجن سنگھ میری منت سماجت کرنے لگ گیا۔ ورشا رانی نے بھی مجھ سے چلہ کرنے کی التجا کی۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آج کی رات اسی جگہ بیٹھ کر چلہ کروں گا۔"

اس کے بعد ہم نے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بڑا پر تکلف کھانا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے ورشا سے کہا۔

"بالکہ! تمہارے بدن میں سے میرے ہاتھ کی خوشبو مدھم نہ ہو جائے اور اگنی سانپ تم پر حملہ نہ کر دے اس لیے میرے پاس آؤ۔ میں تمہارے جسم پر ہاتھ پھیر دوں تاکہ تین دن تک تم اگنی سانپ سے محفوظ ہو جاؤ۔"

ورشا جلدی اٹھ کر میرے قدموں میں آکر بیٹھ گئی۔ میں نے یونہی اس کی پیٹھ پر گردن سے لے کر نیچے تک دو تین بار ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"جا بالکہ! تین دن تک اگنی سانپ تیرے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔"

ورشا میرے چرن چھو کر واپس صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

میں نے رات کے ٹھیک بارہ بجے جعلی چلہ شروع کیا۔ موم بتی روشن کر کے سامنے پلیٹ میں رکھ لی اور اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ پندرہ بیس منٹ بیٹھنے کے بعد میں تھک گیا۔ پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ پندرہ بیس منٹ اس پہلو پر بھی بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے موم بتی بجھا دی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ وہاں مجھے دیکھنے والا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ اگر کسی نے مجھے چلہ کرتے ہوئے نگاہ ڈال کر دیکھ لیا تو میرا چلہ ضائع ہو جائے گا اور پھر ورشا کو اگنی سانپ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ خوب مرغن کھانا کھایا ہوا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی۔ میں وہیں صوفے پر لیٹ گیا۔ مجھے نیند آ گئی۔ اچانک آنکھ کھلی تو باہر سے پرندوں کے بولنے کی آواز آ

رہی تھی۔ کھڑکی بند تھی۔ روشندان پر صبح کی روشنی ہو رہی تھی۔ دن چڑھ گیا تھا۔

میں زور زور سے اشلوک پڑھنے لگا۔ میری آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ کوئی دس منٹ تک میں اشلوک پڑھتا رہا۔ پھر اٹھ کر دروازہ کھول دیا باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے آواز دی۔

"ارجن سنگھ اندر آجا تیرا کام ہوگیا ہے۔"

میں صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میری آواز پر فوراً ارجن سنگھ اندر آگیا وہ فل وردی میں تھا۔ میرے چرن چھو کر ادب سے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

"میں نے یگیہ کر لیا ہے۔ رات کے پچھلے سمے آکاش کا ایک گندھرو میرے پاس آگیا۔ اس کے آنے سے روشنی ہوگئی۔ میں نے موم بتی بجھا دی۔ گندھرو نے کہا مہاراج کا یگیہ آکاش کے دیوتاؤں نے سوئیکار کر لیا ہے۔ آپ میں وہ شکتی آگئی ہے کہ جس کی مدد سے آپ اگنی سانپ کو زمین کی تہوں میں بھی دیکھ لیں گے اور اسے مار سکیں گے۔"

ورشا رانی بھی اندر آگئی تھی۔ میجر نے اپنی پتنی کو خوش خبری سنائی کہ مہاراج نے یعنی میں نے کامیابی سے چلہ کر لیا ہے اور اب میں اس کے دشمن کو زمین کی گہرائیوں میں بھی دیکھ سکوں گا۔ میں نے کہا۔

"ارجن سنگھ! تمہیں ایک دن چھٹی کر کے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ مجھے اگنی سانپ کی ہلکی ہلکی بو آنے لگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سانپ سری نگر شہر کے آس پاس کی پہاڑیوں میں کسی جگہ چھپا ہوا ہے۔ فکر نہ کرو۔ ہم اسے تلاش کر لیں گے۔ تمہیں اپنے ساتھ پستول کی بجائے چاقو ضرور رکھنا ہوگا۔ ویسے تو میں اسے اپنے ترشول سے ہلاک کر ڈالوں گا۔ پھر بھی تم چاقو ضرور رکھ لینا۔"

میجر ارجن سنگھ بولا۔

"مہاراج! آپ جیسا کہیں گے میں ویسے ہی کروں گا۔ آپ کس وقت اگنی سانپ کی تلاش میں نکلنا چاہتے ہیں؟"

مجھے معلوم تھا کہ اتوار چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ اتوار کے دن زیر زمین فوجی پراجیکٹ پر کام بند ہوگا۔ وہاں اگر کچھ لوگ کام کر رہے ہوں گے تو وہ بھی اتوار کی چھٹی پر ہوں گے اور میجر ارجن سنگھ آسانی سے مجھے وہاں لے جا سکے گا۔ کیونکہ میرا ٹارگٹ وہی تھا۔ میں نے کہا۔

"یگیہ کے حساب سے شبھ گھڑی کا لگن اتوار کو بیٹھتا ہے۔ ہم اتوار کے دن یہاں سے نکلیں گے۔"

میجر ارجن سنگھ بولا۔

"مہاراج اتوار کون سی دور ہے۔ پرسوں اتوار ہے۔ بیچ میں ایک ہی دن باقی ہے۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ آپ اتوار کے دن تک ہمارے ہاں ہی رہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہم جوگی سنیاسی لوگ ہیں بابا۔ ہم اتنے دن کسی کے ہاں نہیں ٹھہرتے۔ ہم آج چلے جائیں گے اتوار کی صبح کو آ جائیں گے۔ تم سپیشل جیپ تیار رکھنا۔ ہمیں سری نگر کے آس پاس کی ساری پہاڑیاں اور جنگل دیکھنے ہوں گے۔ اگنی سانپ وہیں چھپا ہوا ہے۔"

میجر ارجن سنگھ نے کہا۔

"جو حکم مہاراج!"

اس کے بعد میں وہاں سے اپنی کیمں گاہ میں واپس آ گیا۔ کمانڈو شیر باز خان بے چینی سے میری راہ دیکھ رہا تھا۔

"خیریت تو تھی؟ تم ساری رات غائب رہے میں تو پریشان ہو گیا تھا۔"

میں نے اسے ساری روداد سنا ڈالی اور کہا۔

"انڈین ملٹری کے خفیہ پراجیکٹ کی سراغ رسانی کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔

اتوار کو میں اپنے اصلی مشن پر روانہ ہوں گا اور کیسی دلچسپ بات ہے کہ دشمن اپنا خفیہ پراجیکٹ خود مجھے دکھائے گا۔"

شیر باز بولا۔ "ہوشیار رہنا۔ کہیں میجر کو شک نہ پڑ جائے۔"

میں نے کہا۔ "میجر ارجن سنگھ میرا اس قدر مطیع اور مرید ہو چکا ہے کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں محتاط رہوں گا۔ تم بے فکر رہو۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

اتوار کے دن میں صبح ۹ بجے ہی ناشتے کے بعد جوگی کے بھیس میں ترشول ہاتھ میں لیے میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر میں پہنچ گیا۔ وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی پتنی ورشا کے جسم پر ہاتھ پھیرے آج تیسرا دن ہے۔ چنانچہ میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی ورشا رانی کو اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا اور کہا۔

"بالکہ! تو شاید بھول گئی ہو مگر ہمیں یاد ہے کہ تمہارے جسم پر اپنا ہاتھ پھیرے آج تیسرا دن ہے۔ کل تمہارے جسم میں سے ہمارے ہاتھ کی خوشبو مدھم پڑنے لگے گی اور سانپ حملہ کر سکتا ہے۔ آؤ ہم تمہارے جسم پر ہاتھ پھیر کر تمہیں اور تین دنوں کے لیے سانپ کے زہر سے محفوظ کر دیں۔"

ورشا رانی بڑے ادب سے سر جھکا کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے یونہی اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"جاؤ اب اگنی سانپ تم سے ایک ایک فرلانگ تک دور رہے گا۔"

پھر میجر سے پوچھا۔

"ارجن سنگھ! کیا تم تیار ہو؟"

وہ بولا۔ "بالکل تیار ہوں مہاراج!"

"تو پھر چلو۔ وقت کم ہے بہت سارا علاقہ دیکھنا ہے۔"

ہم باہر کھڑی جیپ میں آ کر بیٹھ گئے۔ میجر ارجن سنگھ فوجی وردی میں نہیں تھا۔ اس نے عام گرم پتلون سویٹر اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے جیپ میں

بیٹھنے کے بعد کہا۔
"ابھی جیپ سٹارٹ نہ کرنا۔ مجھے دیکھ لینے دو کہ سانپ کی بو کس طرف سے آ رہی ہے۔"
میں نے سانس اوپر کو کھینچا۔ پھر آہستہ آہستہ سانس باہر نکالتے ہوئے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔
"سانپ کی بو ان پہاڑیوں کی طرف سے آ رہی ہے ان پہاڑیوں کی طرف چلو۔"
میجر نے اسی طرف جیپ کو ڈال دیا۔ آسمان اس روز ابر آلود تھا۔ سری نگر شہر دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ہم بڑی جلدی شہر سے باہر آ گئے۔ وہ علاقہ میری نگاہ میں تھا جس طرف مجھے میجر ارجن سنگھ کو لے کر جانا تھا۔ میں نے اک جگہ جیپ کو ٹھہرایا۔ نیچے اتر کر چاروں طرف منہ کر کے یونہی سونگھنے کی اداکاری کی اور ان ٹیلوں کی طرف ہاتھ بڑھایا جن کے درمیان وہ چھوٹی سی سنگلاخ اور ویران وادی تھی ' جہاں فوجی سرگرمیاں دیکھنے میں آئی تھیں اور جس کے نیچے ہماری اطلاع کے مطابق کسی خطرناک پراجیکٹ پر کام ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔
"ارجن سنگھ! سانپ کی بو ان ٹیلوں کے درمیان سے آ رہی ہے۔ تمہاری پتنی کی جان کا دشمن سانپ ان ٹیلوں کے درمیان کسی جگہ چھپا ہوا ہے۔"
میں نے محسوس کیا کہ ڈوگرہ میجر اس وادی کی طرف جاتے ہوئے تھوڑا ہچکچایا۔ کہنے لگا۔
"مہاراج! ہو سکتا ہے سانپ ان ٹیلوں کی دوسری طرف ہو۔"
میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے ٹیلوں کے درمیان والی وادی میں نہیں لے جانا چاہتا جو فوجی اعتبار سے حساس علاقہ تھا۔ میں نے کہا۔
"ارجن سنگھ! اگر یہ بات ہے تو پھر ہم جاتے ہیں۔ تم خود جا کر سانپ کو تلاش کر لو۔"

اور میں وہیں سے پیدل واپس چل پڑا۔ میجر ارجن سنگھ دوڑ کر میرے آگے آگیا۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! میرا مطلب یہ نہیں تھا بھگوان کے لیے آپ نہ جائیں۔ آپ جس طرف کہتے ہیں میں ادھر ہی آپ کو لیے چلتا ہوں۔ پلیز! آ جائیں۔"

میں نے اسے رعب سے کہا۔

"خبردار! آئندہ میرے کام میں دخل نہ دینا نہیں تو اپنی پتنی کی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اگنی سانپ تمہاری پتنی کے بعد تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"شما کر دیں مہاراج۔"

میں جیپ میں بیٹھ گیا اور جیپ ٹیلوں کے درمیان حساس علاقے کی طرف چلنے لگا۔ یہاں کوئی سڑک وغیرہ نہیں تھی۔ جیپ چھوٹے چھوٹے پتھروں پر اچھلتی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ہم ٹیلوں کے درمیان والی وادی میں داخل ہوگئے۔ اچانک ایک طرف سے دو مسلح فوجی درختوں میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے جیپ کو رکنے کے لئے کہا۔ میجر سویلین لباس میں تھا۔ اس نے جیپ روک لی۔ دونوں فوجی لمبے لمبے قدم اٹھاتے قریب آئے۔ میجر ارجن سنگھ نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔ فوجیوں نے باری باری شناختی کارڈ دیکھا۔ پھر میجر کی طرف دیکھا۔ یہ ملٹری انٹیلی جینس کے آدمی لگتے تھے۔ ایک فوجی نے کہا۔

"سر! ٹھیک ہے اوکے۔"

وہ آگے سے ہٹ گئے۔ جیپ آگے کو چل پڑی۔ میں نے میجر سے پوچھا۔

"یہاں یہ فوجی کس لیے پہرہ دے رہے ہیں؟ یہاں تو کوئی لڑائی نہیں ہو رہی۔"

میجر بولا۔ "مہاراج! اس علاقے میں کبھی کبھی فوجی مشقیں ہوتی ہیں۔ اس

لیے سویلین کو یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں سویلین کپڑوں میں تھا۔ اس لیے انہوں نے مجھے روک لیا۔ فوجی وردی میں ہوتا تو کوئی نہ روکتا۔"

میں بڑی گہری نظروں سے اردگرد کے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ بظاہر وہاں کوئی خاص بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک جگہ دیودار کے درختوں کے نیچے مجھے تین فوجی ٹرک کھڑے نظر آئے جن کے اوپر پتوں والا جال ڈال کر انہیں کیمو فلاج کیا گیا تھا۔ ان ٹرکوں سے تھوڑی دور ٹیلے کی نشیبی دیوار میں مجھے دو فوجی سروں پر کریٹ اٹھائے جاتے نظر آئے۔ دیوار کے پاس آکر انہوں نے کریٹ زمین پر رکھ دیے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ زیر زمین ملٹری پراجیکٹ کا راستہ یہیں سے نیچے جاتا ہو گا۔"

میں نے دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور ٹیلے کی اسی دیوار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ارجن سنگھ! تو خوش قسمت ہے۔ اگنی سانپ کے ہم بڑے قریب آ گئے ہیں۔ اس کی بو تیز ہونے لگی ہے۔"

میجر ارجن سنگھ نے ٹیلے کی دیوار کی جانب دیکھا اور ایک بار پھر اس کے چہرے پر ایسے اثرات ابھر آئے جیسے وہ اس طرف نہیں جانا چاہتا۔ لیکن یہ اس کی بیوی کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ جیپ سے اتر کر بولا۔

"مہاراج! آگے ہم پیدل ہی جائیں تو اچھا ہے۔ وہاں جیپ گاڑیوں کا راستہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے مگر جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اگنی سانپ ہوشیار ہو جائے اور یہاں سے فرار ہو جائے۔ اگر وہ نکل گیا تو پھر قابو میں نہیں آئے گا۔"

میں بھی جیپ سے اتر پڑا۔ ہم جھاڑیوں' خشک گھاس اور پتھروں کے درمیان پیدل چلنے لگے۔ میجر ارجن سنگھ آگے آگے چل رہا تھا۔ ٹیلے کی دیوار

کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ کہنے لگا۔ "مہاراج! اب دیکھیں سانپ کی بو کس طرف سے آ رہی ہے۔"

وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح میں ٹیلے کی دیوار کے قریب نہ جاؤں اور میں اسی طرف جانا چاہتا تھا۔ یہی میرا مشن تھا میں نے سانس لے کر کہا۔

"سانپ کی بو سامنے والے ٹیلے کی طرف سے آ رہی ہے ادھر چلو۔"

ڈوگرہ میجر مجبور ہوگیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں مجھے ساتھ لے کر ٹیلے کی طرف بڑھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس طرف سیکورٹی کا انتظام انتہائی سخت ہے اور کوئی بڑے سے بڑا فوجی افسر بھی پیشگی اجازت کے بغیر اس طرف نہیں آ سکتا تھا۔ جھاڑیوں کے پاس چنار کا درخت تھا۔ ڈوگرہ میجر وہاں رک گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! یہاں ہماری ایک پلٹن فوجی مشقوں کے لیے ٹھہری ہوئی ہے۔ آپ یہاں تھوڑی دیر کے لیے رکیں میں ان سے بات کرتا ہوں۔"

وہ ٹیلے کی دیوار کی طرف چلا گیا۔ جہاں مجھے انڈین آرمی کے دو تین جوان کسی کام میں لگے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ ان کی وردیاں ہرے رنگ کی تھیں اور سروں پر ہلمٹ تھے جن میں درختوں کی ٹہنیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دور سے دیکھا کہ میجر ارجن سنگھ ان کے پاس کھڑا باتیں کر رہا ہے۔ ایک ڈیڑھ منٹ تک وہ ان سے باتیں کرتا رہا۔ وہ اس سارے پراجیکٹ کا انچارج تھا۔ شاید وہ میرے ساتھ علاقے میں دورہ کرنے کو ملٹری پولیس اور انٹیلی جینس سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ واپس آ کر کہنے لگا۔

"آ جائیں مہاراج! آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہاں کشمیری کمانڈوز نے ہماری آرمی کو سخت مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ روز دھماکے ہوتے ہیں ہمارے فوجی روز مارے جا رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔"

میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم کشمیر کے سارے مسلمانوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے بموں سے کیوں

نہیں اڑا دیتے؟؟"

ڈوگرہ میجر ذرا سا مسکرا کر بولا۔

"مہاراج! کشمیر میں مسلمانوں کی بڑی بھاری اکثریت آباد ہے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

ہم سامنے ٹیلے کی دیوار میں ایک محراب دار دروازہ بنا ہوا تھا۔ دروازہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اس کے کواڑ بھی نہیں تھے۔ دروازے کا آدھا حصہ درختوں کی شاخوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہاں پہلے جو تین فوجی جوان نظر آئے تھے اب ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر ڈوگرہ میجر رک گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! سانپ اس طرف نہیں آ سکتا۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھے دروازے کے پاس نہیں لے جانا چاہتا تھا اور مجھے دروازے کے پاس ہی نہیں بلکہ اس کے اندر جانا تھا۔ میں نے سانس کھینچ کر چھوڑا اور جلالی آواز میں کہا۔

"ارجن سنگھ! اگنی سانپ کی بو اس دروازے کے اندر سے آ رہی ہے۔ جلدی سے اندر چلو۔ نہیں تو سانپ فرار ہو جائے گا۔ لگتا ہے اسے میرے آنے کی خبر ہو گئی ہے۔"

ڈوگرہ میجر آگے بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ اسے انتہائی مجبوری کے عالم میں وہ کچھ کرنا پڑ رہا تھا جو وہ کسی حالت میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ مجبور تھا۔ میں اس کے آگے آگے ٹیلے والے دروازے کی طرف بڑھا اور ترشول آگے کر کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ میجر دوڑ کر میرے ساتھ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اندر ایک غار سا ہے۔ پہلے تو اندھیرا سا تھا۔ میں رک رک کر قدم اٹھانے لگا اور ساتھ ہی لمبے لمبے سانس لے کر سانپ کی بو سونگھنے کی اداکاری کرتا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بول بھی رہا تھا۔

"اگنی سانپ! میں شیو دیوتا کا بھگت ہوں۔ میں نے تجھے کیل کر لیا ہے۔ میں نے تجھے اپنے منتروں میں جکڑ لیا ہے۔ بھاگنے کی کوشش کی تو تجھے منتر پھونک کر بھسم کر دوں گا۔"

چھ سات قدم چلنے کے بعد غار کی ڈھلان آگئی۔ چھوٹی سی ڈھلان تھی۔ ڈھلان اترتے ہی غار کا نقشہ ہی بدل گیا۔ چھت اونچی ہوگئی جگہ جگہ غار کی دیواروں پر بجلی کے بلب روشن تھے۔ میں غار میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ترشول کو کبھی دیوار سے ٹکراتا کبھی فرش کی طرف جھکاتا اس طرح چل رہا تھا جس طرح بارودی سرنگوں کو تلاش کرنے والے فوجی ڈی ٹیکٹر راڈ لے کر چلتے ہیں۔ ساتھ ساتھ میں شیو دیوتا کی تعریف کے اشلوک بھی بولتا جا رہا تھا۔ میجر ارجن سنگھ میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج یہاں سانپ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں تو پکے فرش ہیں۔"

میں نے پلٹ کر غضبناک آنکھوں سے ڈوگرہ میجر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اب اگر تو نے ایسی بات کی تو میں اسی جگہ سے واپس چلا جاؤں گا پھر اپنی پتنی کو بچا لینا اگر بچا سکتے ہو تو' مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں تمہاری خاطر اپنی جان مصیبت میں ڈالوں؟ اگنی سانپ مجھ پر بھی حملہ کر سکتا ہے۔"

ڈوگرہ میجر نے میرے گھٹنے چھو کر کہا۔

"مہاراج شما کر دیں اب ایسی غلطی نہیں کروں گا۔"

میں نے دوبارہ سانپ کی تلاش شروع کر دی۔ میں قدم قدم غار میں آگے بڑھ رہا تھا اور ترشول کو بار بار غار کی دیوار اور فرش کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ ساتھ ہی میں بڑی گہری نظر سے غار کی دیواروں اور چھت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ غار آگے جا کر بائیں طرف مڑ گیا۔ یہاں مجھے آمنے سامنے بنے ہوئے کوٹھڑیوں کے دروازے نظر آئے۔ میں نے میجر سے بالکل نہ پوچھا کہ یہ کوٹھڑیاں یہاں کس لیے بنائی گئی ہیں۔ میں ایک کوٹھڑی کے قریب سے گزرا تو مجھے اندر سے

کسی عورت کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ چیخ بڑی درد ناک تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی عورت سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ میں نے میجر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ارجن سنگھ! اندر کیا ہو رہا ہے؟"

ڈوگرہ میجر بولا۔ "مہاراج! کبھی کبھی ہم یہاں ان کشمیری کمانڈوز کو پوچھ گچھ کے لئے لے آتے ہیں جو ہمارے فوجی جوانوں کو گھات لگا کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ ان میں کشمیری عورتیں بھی ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بہت اچھا کرتے ہو۔ ان ملیچھ کشمیری مسلمانوں کو ہرگز زندہ نہ چھوڑنا۔"

میں ترشول دیوار کے ساتھ لگاتا اشلوک پڑھتا آگے گزر گیا۔ ذرا آگے گیا تو ایک دو کوٹھڑیوں میں سے تین چار آدمیوں کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے میجر سے کچھ نہ پوچھا۔ اسی طرح اشلوک پڑھتا اور کسی کسی وقت اگنی سانپ کو مخاطب کر کے اس کو خبردار کرتا چلا گیا۔ آگے ایک کافی بڑا دروازہ آ گیا۔ جہاں دو مسلح فوجی دونوں طرف کھڑے تھے۔ میجر ارجن سنگھ کو دیکھ کر انہوں نے سیلوٹ تو نہ کیا مگر ایڑیاں بجا کر اٹن شن ہوگئے۔ اگر فوجی افسر وردی میں نہ ہو تو دوسرا فوجی عہدے دار اسے سیلوٹ نہیں کرتا۔ صرف ایڑیاں بجا کر تعظیم بجا لاتا ہے۔ میں ترشول کو جھکائے اس دروازے میں داخل ہوگیا۔

ڈوگرہ میجر نے دونوں فوجیوں سے کوئی بات کی اور میرے پیچھے ہوگیا۔ غار کے اندر یہ ایک ہال نما کمرہ بنا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے لکڑی کے کریٹ ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ میں ایک دم سے ایک جگہ رک گیا اور ڈگرہ میجر سے پوچھا۔

"ارجن سنگھ کیا یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟"

میجر نے جلدی سے کہا۔

"ہاں مہاراج! آگے بائیں جانب ایک راستہ ہے۔"

میں نے ترشول والا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔

"جے شیو جی مہاراج کی۔ ارجن سنگھ سانپ اسی طرف گیا ہے۔ چلو اس طرف۔"

ہال کمرے کے کونے میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اس دروازے کے بھی کواڑ نہیں تھے۔ میجر اب میرے آگے ہو گیا تھا۔ دروازے کی دوسری جانب تنگ غار شروع ہوتا تھا۔ اسی غار سے باہر کی تازہ ہوا آ رہی تھی۔ یہاں صرف ایک بلب روشن تھا۔ غار کی دیواریں پکی تھیں مگر چھت اور فرش کچے ہی تھے۔ میں نے کہا۔

"ارجن سنگھ میرے پیچھے آ جاؤ۔ ہم سانپ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ کہیں وہ تم پر حملہ نہ کر دے۔"

ڈوگرہ میجر جلدی سے میرے پیچھے ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! یہ غار ٹیلے کی دوسری طرف نکل جاتا ہے۔"

میں نے سانس بھر کر کہا۔

"مجھے سانپ کی بو اسی ٹیلے کی طرف سے آ رہی ہے۔ آ جاؤ میرے پیچھے پیچھے۔ چاقو نکال کر ہاتھ میں لے لو۔"

میجر نے چاقو جیب سے نکال کر کھولا اور اسے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں اشلوک پڑھتا ترشول کو بار بار زمین اور دیواروں کی طرف جھکاتا اس جگہ پر آ گیا جہاں غار ختم ہو جاتا تھا اور غار کے دہانے پر سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں دوڑ کر غار سے باہر آ گیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہ ٹیلے کا پچھلا علاقہ تھا۔ یہاں بھی غار کے دہانے کو درختوں کی شاخوں سے ڈھانپ کر کیموفلاج کیا ہوا تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی دو فوجی اچانک کسی طرف سے نکل کر میری طرف دوڑے اور مجھے وہیں دبوچ لیا۔ اتنے میں ڈوگرہ میجر غار کے دہانے سے باہر آ گیا تھا۔ اس نے وہیں سے آواز دی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے جوان۔"

دونوں فوجی سنتریوں نے سویلین کپڑوں میں اپنے کمانڈنگ آفیسر کو پہچان لیا۔ مجھے فوراً چھوڑ کر وہ پرے ہٹ گئے اور ایڑیاں جوڑ کر بولے۔

"ٹھیک ہے سر!"

میجر ارجن سنگھ نے فوجی جوانوں کو بھیج دیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"مہاراج! سانپ کا کچھ پتہ چلا؟"

میں نے وہیں ایک لمبا سانس لیا اور سخت غصے میں کہا۔

"تمہارے ان فوجی جوانوں نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے ارجن سنگھ۔ سانپ کی بو یہاں بڑی تیز تھی۔ وہ اس جھاڑی میں تھا مگر تمہارے جوان جھاڑی میں سے دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔ سانپ کی بو ایک دم مدھم پڑ گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں سے ڈر کر بھاگ گیا ہے۔"

میں بو سونگھتا ترشول کو ادھر ادھر پھراتا دوسرے ٹیلے کی طرف چل پڑا۔ میجر مایوسی کے عالم میں میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں اسے کہتا جا رہا تھا۔

"یہ کم بخت کہاں سے نکل آئے تھے۔ ان کے پاؤں کی دھمک سے سانپ فرار ہو گیا۔ اگر یہ نہ آتے تو میں نے سانپ کو پکڑ لیا تھا۔ کوئی بات نہیں تم گھبراؤ نہیں وہ مجھ سے بچ نہیں سکے گا۔ مگر اس کی بو بڑی دور ہو رہی ہے۔ لگتا ہے وہ اس علاقے سے دور ہوتا جا رہا ہے۔"

میرا کام پورا ہو گیا تھا۔ مجھے زیر زمین جو سراغ رسانی کرنی تھی وہ میں نے کر لی تھی۔ سنگلاخ وادی کے نیچے انڈین آرمی کے خفیہ پراجیکٹ کے بارے میں ابتدائی معلومات اور زمین دوز پراجیکٹ کے اندر جانے اور باہر نکلنے کا راستہ مجھے معلوم ہو گیا تھا لیکن میں ڈوگرہ میجر کو ابھی اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی چھانے لگی تھی۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میجر بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! اب کیا ہوگا۔ سانپ اگر بہت دور آزاد کشمیر کی طرف نکل گیا تو ہم اسے کیسے ہلاک کریں گے۔ یہ تلوار تو میری پتنی کے سر پر لٹکتی رہے گی کہ سانپ کسی بھی وقت کسی بھی روز آکر اسے ڈس دے گا۔"

میں نے کہا۔ "میجر ارجن سنگھ! تم کویں غم کرتے ہو؟ کیا میں تمہارے پاس نہیں ہوں۔ جب تک میں تمہارے اور تمہاری پتنی کے ساتھ ہوں سانپ تمہارے کوارٹر کے قریب بلکہ ورشا رانی کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ میں ہر تیسرے دن اس کے جسم پر اپنا ہاتھ پھیر کر اپنے جسم کی خوشبو اس کے جسم میں داخل کر دیا کروں گا۔ تم نے خود دیکھ لیا ہے کہ میری بو سے اگنی سانپ ڈرتا ہے ورنہ اب تک اس نے تمہاری پتنی کا کام تمام کر دیا ہوتا۔"

ڈوگرہ میجر کو تھوڑا سا حوصلہ ہوا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! اب کیا پروگرام ہے۔"

میں نے کہا۔ "پروگرام یہ ہے کہ تمہارے ہاں چل کر تھوڑا آرام کروں گا۔ ورشا رانی کو بھی تسلی دوں گا اس کے بعد جنگل میں رام رام کی مالا جپنے اور پتپا کرنے نکل جاؤں گا۔ چلو تمہاری جیپ کس طرف ہے؟ مجھے تو کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ ہم کس طرف آ گئے ہیں یہ کون سی جگہ ہے ارجن سنگھ؟"

میں جان بوجھ کر نادان بن رہا تھا۔ ڈوگرہ میجر بولا۔

"مہاراج جس ٹیلے سے ہم غار میں داخل ہوئے تھے یہ اس ٹیلے کا پچھلا علاقہ ہے۔ ہماری جیپ دوسری طرف کھڑی ہے۔ آجائیے مہاراج۔"

ہم ٹیلے کے نشیب میں سے جھاڑیوں درختوں میں سے گزرتے واپس اسی جگہ آ گئے جہاں چیڑھ اور چنار کے درختوں میں ہماری جیپ کھڑی تھی۔ ہم جیپ میں بیٹھ کر واپس چل پڑے۔

میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر میں اس کی پتنی اور دونوں عورتیں بے تابی سے ہماری راہ دیکھ رہی تھیں۔ جب انہیں پتہ چلا کہ اگنی سانپ پکڑا نہیں گیا تو وہ

پریشان ہوگئیں۔ ورشا رانی تو صوفے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ جوگی اور سادھو ہندو گھرانوں میں بڑے تکلف ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی اسی قسم کا مظاہرہ کیا اور ورشا رانی کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بالکا! تو کیوں پریشان ہوتی ہے؟ جب تک ہم تمہارے پاس ہیں سانپ اس طرف آنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ ہم کل پھر اس کی تلاش میں جائیں گے۔ ہم جب تک اپنے ترشول سے اس کے ٹکڑے نہیں کر لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

ورشا رانی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ہاتھ باندھ کر بولی۔ "مہاراج کی کرپا ہے۔"

دوپہر کا کھانا میں نے وہیں میجر ارجن سنگھ اور ورشا رانی کے ساتھ کھایا۔ اس کی دونوں رشتے دار عورتوں کو میں نے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ دوپہر کے بعد میں اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے ڈوگرہ میجر کے کوارٹر سے نکل کر اپنی خفیہ کمین گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ چھوٹا سا جنگلاتی علاقہ تھا۔ میں درختوں' جھاڑیوں میں سے گزرتا اسی راستے سے سری نگر شہر کے بڑے چوک کی طرف واپس جا رہا تھا جہاں سے مجھے بس پکڑنی تھی اور شہر سے دور اپنی خفیہ کمین گاہ والی سڑک پر جا کر اترنا تھا۔ میں ابھی ان درختوں میں ہی تھا کہ میری چھٹی حس نے بیدار ہو کر مجھے خبردار کر دیا کہ تمہارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔

ایک آدمی کو میں نے اپنے برابر کچھ فاصلے پر درختوں میں جاتے دیکھا تھا۔ کچھ دور تک وہ آدمی میرے متوازی درختوں میں چلتا رہا۔ پھر اچانک غائب ہوگیا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ میں سادھوؤں کی طرح بڑے لا ابالی انداز میں آرام آرام سے چل رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے اسی آدمی کو دوبارہ دیکھا۔ اب وہ ایک درخت کی اوٹ میں مجھ سے کچھ فاصلے پر ذرا بلندی پر کھڑا

سگریٹ پی رہا تھا اور پیچھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ شک ہوا۔ جب میں اس کے برابر سے ہو کر گزرا تو میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے غور سے مجھے تک رہا تھا۔ اس وقت مجھے یقین ہوگیا کہ یہ ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی ہے اور میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اصولی طور پر اسے میرا پیچھا کرنا چاہیے تھا میں ایک ڈوگرہ میجر کے ساتھ انڈین آرمی کے سیکرٹ پراجیکٹ کے علاقے سے ہی نہیں گزرا تھا بلکہ اس پراجیکٹ کے اندر سے گھوم پھر کر آیا تھا۔ ملٹری انٹیلی جینس کو تو میرا پیچھا کرنا ہی تھا کہ میں کون ہوں اور میجر کے ساتھ خفیہ پراجیکٹ میں کیا کرنے گیا تھا۔ وہ سارا علاقہ حساس علاقہ تھا۔ حریت پسند مجاہدین ہر محاذ پر مقبوضہ انڈین آرمی کا بے جگری سے مقابلہ کر رہے تھے اور ان کا ظلم و بربریت کا منہ توڑ جواب دے رہے تھے۔ یقینی طور پر ڈوگرہ میجر سے بھی ملٹری انٹیلی جینس کی طرف سے پوچھ گچھ ہونے والی تھی کہ وہ ایک سادھو کو لے کر خفیہ پراجیکٹ میں کیا کرنے گیا تھا۔ ظاہر ہے میجر اس حقیقت سے باخبر تھا اور اس نے اس کے لیے کوئی نہ کوئی وضاحت ذہن میں تیار کر رکھی ہوگی لیکن یہ جو ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی میرے پیچھے لگ گیا تھا یہ میرے لیے بلکہ ہمارے سارے مشن کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں وہیں محتاط ہوگیا۔

سری نگر شہر کے بس سٹاپ پر آکر میں وہاں بالکل نہیں رکا بلکہ بس سٹاپ سے آگے نکل گیا۔ سامنے ایک چائے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ میں دکان میں گھس گیا۔ باہر کافی سردی تھی۔ دکان میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی۔ تین چار بزرگ ٹائپ کے کشمیری بیٹھے چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر وہ چپ ہوگئے۔ یہ بات بڑی عام تھی کہ سری نگر پولیس کی سی آئی ڈی کے آدمی سادھوؤں کا بھیس بدل کر شہر میں اور دیہات میں پھرتے رہتے ہیں اور حریت پرست مجاہدوں کا کھوج لگا کر انہیں گرفتار کروا دیتے ہیں جو کشمیری حریت پرستوں کی طرف داری بھی کر رہے ہوں ان کی بھی مخبری کر کے

پکڑوا دیتے ہیں۔ میں دکان کے کونے میں بنچ پر بیٹھ گیا اور دکاندار سے کہا۔

"میاں جی! ایک پیالی چائے بنا دیں اور سادھو سنت سے دعا لیں۔"

میری نظریں برابر باہر بازار کی طرف لگی تھیں۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ وہی آدمی دکان کے آگے سے سگریٹ پیتے ہوئے گزرا جو میجر کے کوارٹر سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دکان کے آگے سے گزرتے ہوئے اس نے نگاہ اندر ڈال کر دیکھا تھا۔ ضرور اسے میں دکان میں بیٹھا ہوا نظر آگیا ہوں گا بلکہ اس نے تو مجھے چائے کی دکان میں داخل ہوتے بھی دیکھ لیا ہوگا۔

اب میں سوچنے لگا کہ اس آدمی سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے۔ اس کو ساتھ لے کر میں اپنی خفیہ کمین گاہ پر نہیں جا سکتا تھا۔ پہلے سوچا کہ اس کو اپنے پیچھے لگا کر اوپر لے جاتا ہوں۔ وہاں اس کو اپنے دوست سانپ سے ڈسوا کر اس کا کام تمام کر دوں گا۔ پھر خیال آیا کہ یہ لوگ اور خاص طور پر ملٹری انٹیلی جینس کے لوگ جب کسی مشکوک شخص کا تعاقب کرتے ہیں تو اکیلے نہیں ہوتے کم از کم دو آدمی ہوتے ہیں اور دونوں مسلح ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ہیڈ کوارٹر کو خبر کر دیتے ہیں کہ ہم مشتبہ آدمی کا پیچھا کرتے ہوئے فلاں علاقے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہتا تھا۔ کچھ دیر تک میں دکان میں بیٹھا چائے پیتا رہا۔ وہاں شاید سبھی مسلمان کشمیری تھے۔ کسی نے مجھ سے کوئی بات نہ کی میں زیادہ دیر وہاں بیٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے واپس خفیہ ٹھکانے پر جا کر دن بھر کی ساری رپورٹ کمانڈو شیر باز کو دینی تھی جو وہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں زیادہ دیر تک ادھر ادھر بھی نہیں پھر سکتا تھا اس طرح سے انٹیلی جینس کے آدمی کا شک یقین میں بدل جاتا کہ میں واقعی کشمیری کمانڈو ہوں۔

ایک ہی طریقہ باقی تھا کہ میں کسی طرح سے آدمی کو دھوکا دے کر نکل جاؤں۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ یہ ایک آدمی نہیں ہے اس کے ساتھ دوسرا آدمی بھی ہے جو دوسری جانب سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔ کافی دیر تک دکان میں بیٹھا

یہی کچھ سوچتا رہا۔ چائے کی دو پیالیاں پی گیا۔ آخر دکان سے نکل کر سرد کہرے میں ڈوبی ہوئی سڑک پر ایک طرف چل پڑا۔ آسمان پر بادل گھرے ہوگئے تھے۔ کہر بالکل بادلوں کی طرح سڑک پر چھایا ہوا تھا۔ یہ کہر میری مدد کر سکتا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا مجھے سوائے کہرے کی دھند کے کچھ نظر نہ آیا۔ میں تیز تیز چلنے لگا کہرے کا بادل ختم ہوگیا۔ سڑک میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں ایک دکان کے آگے کھڑا ہوگیا اور شوکیس میں لگی ہوئی چیزیں دیکھنے لگا۔ وہاں سے چلتے وقت بڑی چالاکی سے گردن موڑ دیکھا تو وہی آدمی مجھ سے تھوڑی دور ایک دکان کے باہر موجود تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

کم بخت یہ تو جان نہیں چھوڑے گا۔ میں نے سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس علاقے میں وشنو جی کا ایک مندر بھی ہے۔ میں اس مندر کی طرف چل پڑا۔ دو تین بازار اور ایک گھاٹی اترنے کے بعد سامنے مندر کے کلس پر لہراتا بھورے رنگ کا جھنڈا دکھائی دیا۔ میں مندر میں گھس گیا۔ مندر میں یہ کوئی پوجا پاٹھ کا وقت نہیں تھا پھر بھی پجاری لوگ آ جا رہے تھے ان میں عورتیں بھی تھیں یہ بڑا چھوٹا سا مندر تھا۔

مندر کے پیچھے ایک چبوترے پر دو سادھو آگ کا الاؤ جلا کر بیٹھے ہوئے تھے میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے سادھوؤں سے باتیں کرنے کا تجربہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں ادھر ادھر دیکھ لیتا تھا۔ ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی ابھی تک کہیں دکھائی نہیں دیا تھا کچھ وقت گزارنے کے بعد میں اٹھ کر مندر کے دروازے کی طرف آ گیا۔ دیکھا تو انٹیلی جینس کا آدمی مندر کے دروازے کے باہر ایک طرف بنچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کا حلیہ ہندو کشمیریوں والا تھا۔ اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا میں سمجھ گیا کہ یہ میرے باہر نکلنے کے انتظار میں ہے۔ کیونکہ مندر کا کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا۔ دوسری

طرف اونچی دیوار تھی۔ میں واپس سادھوؤں کے پاس چلا گیا۔ سوچنے لگا کہ یہ موقع اچھا ہے اگر میں کسی طریقے سے دیوار پھاند کر نکل جاؤں تو اس آدمی سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ میں نے چبوترے پر بیٹھے سادھوؤں سے باتیں کرتے ہوئے سامنے مندر کی عقبی دیوار کی طرف دیکھا۔ دیوار کچھ نہیں تو دس فٹ کے قریب بلند تھی۔ اس کے قریب کوئی درخت بھی نہیں تھا۔ دیوار کے آخری سرے کی طرف میری نظر گئی تو وہاں مجھے ایک کوٹھڑی دکھائی دی۔ اس کوٹھڑی کی چھت مندر کی دیوار سے ملی ہوئی تھی۔ اگر میں کسی طرح اس کوٹھڑی کی چھت پر چڑھ جاؤں تو دیوار پھاند کر دوسری طرف جا سکتا ہوں۔

میں کوٹھڑی تک جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اس وقت یہی ایک موقع اور یہی ایک راستہ تھا۔ میں اولکھ نرنجن کا ہلکا سا نعرہ لگا کر اٹھا اور چبوترے سے اتر کر کوٹھڑی کی طرف آ گیا۔ کوٹھڑی بند تھی۔ باہر ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں کوٹھڑی کی دوسری طرف آیا تو وہاں بھی لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا دیکھا۔ میں لکڑیوں کے ڈھیر پر پاؤں رکھ کر کوٹھڑی کی چھت پر چڑھ گیا سردی اور کہرے کی وجہ سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دیوار کی دوسری جانب جھانک کر دیکھا۔ نیچے ایک نالہ بہہ رہا تھا مگر دیوار کے ساتھ پیدل چلنے کے واسطے راستہ بنا ہوا تھا۔ وہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں دیوار کی منڈیر کو پکڑ کر دوسری طرف لٹک گیا اور پھر ہاتھ چھوڑ دیے۔ میں الٹ کر نالے میں گرتا گرتا بچا۔ پگ ڈنڈی پر گرتے ہی میں نے بڑی جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک طرف جتنی تیز چل سکتا تھا چلنے لگا۔

نالے میں پانی بے معلوم انداز میں بہہ رہا تھا۔ اس میں کوڑا کرکٹ بھی بہہ رہا تھا۔ میں چلتا چلا گیا۔ آگے جا کر لکڑی کا پل آ گیا میں پل پر سے ہو کر دوسری طرف سڑک پر نکل آیا۔ یہاں مجھے ایک موٹر رکشا مل گیا۔ میں اس میں گھس گیا اور اس سے کہا۔

"نشاط باغ کی طرف چلو۔"

جس سڑک پر مجھے جانا تھا وہ نشاط باغ سے آگے تھی۔ رکشا روانہ ہو گیا میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انٹیلی جینس کے آدمی کو دھوکا دے کر نکل آیا ہوں۔ نشاط باغ پیچھے رہ گیا۔ جب میں سری نگر شہر سے باہر جانے والی سڑک پر کافی

آگے نکل آیا تو ایک جگہ میں نے رکشہ رکوا کر اتر گیا۔ رکشے والے کو کرایہ دیا اور سڑک کے ساتھ جو پہاڑی راستہ اوپر جاتا تھا اس طرف کا رخ کیا۔ یونہی میں نے پیچھے ایک نگاہ سڑک پر ڈالی تو کچھ فاصلے پر ایک موٹر رکشا کھڑا تھا میں ٹھٹھک سا گیا۔ پھر خیال آیا کہ یہ موٹر رکشا ویسے ہی کھڑا ہوگا۔ اس میں کوئی سواری ہوتی تو باہر نکل آئی ہوتی۔ میں درختوں میں سے گزرنے لگا۔ میں اپنی کمیں گاہ کی طرف سیدھے راستے سے جانے کی بجائے پیچ دار اور دشوار گزار راستوں سے گزر رہا تھا۔ تاکہ اگر کوئی میرا پیچھا کر بھی رہا ہے تو وہ پہاڑی راستوں کی بھول بھلیوں میں پھنس جائے۔ کبھی گھاٹی آ جاتی، کبھی درختوں کے جھنڈ آ جاتے اور کبھی کوئی چٹان سامنے آ جاتی تھی۔ میں کافی چکر لگا کر آخر اس پگ ڈنڈی پر آ گیا جو ایک گھاٹی اور نالے میں سے ہوتی ہوئی ہماری خفیہ کمین گاہ کی طرف جاتی تھی۔

میں اس پہاری پگ ڈنڈی پر بھی احتیاط کے طور پر بالکل سیدھا نہ گیا بلکہ پگڈنڈی سے اتر کر جھاڑیوں اور درختوں کے پیچھے سے ہو کر چڑھائی چڑھنے لگا۔ آگے گھاٹی آ گئی۔ گھاٹی اتر گیا۔ سامنے نالہ بہہ رہا تھا یہ پہاڑی نالہ تھا سامنے ذرا بلندی پر ہمارے کشمیری مجاہد کی لکڑی کی جھونپڑی تھی جو ہماری خفیہ کمیں گاہ بھی تھی یہاں میں رک گیا۔ بادل اونچے ہوگئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی جس کی وجہ سے دھند اور کہر غائب ہوگیا تھا۔ میں نالے کے ساتھ ساتھ چل کر اوپر لکڑی کی جھونپڑی کے پیچھے نکل آیا۔ جھونپڑی کے سامنے کی جانب آیا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوٹھڑی کو تالا نہیں لگا تھا مگر وہ خالی پڑی تھی نہ کمانڈو شیر باز ابھی تک پہنچا تھا نہ اپنا کشمیری مجاہد ہی نظر آ رہا تھا۔ کچن والی جھونپڑی بھی خالی پڑی تھی۔ تعجب ہوا کہ کمانڈو شیر باز ابھی تک کیوں نہیں پہنچا۔ اسے تو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ میں پیچھے چٹان والی گھاس پھوس کی جھونپڑی کی طرف آ گیا۔ یہاں میرے دوست سانپ کی آرام گاہ تھی میں نے جھک کر دیکھا۔ سانپ

نے میرے خیر مقدم کے طور پر ہلکی سی پھنکار ماری۔ وہ بیدار تھا اور گردن اٹھائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے دو بار گردن کو آگے کی طرف جھکایا جیسے میری تعظیم بجا لا رہا ہو۔ میں نے کہا۔

"دوست! میں جس مشن پر گیا تھا وہ کامیاب رہا ہے اب آگے ہمیں تمہاری ضرور پڑے گی۔ تم ہماری مدد کے لیے تیار ہو نا؟

سانپ نے سر کو دوبار جھکا دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "میں تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کمانڈو شیرباز کہاں ہے؟ وہ ابھی تک نہیں آیا۔ اسے آجانا چاہیے تھا۔"

سانپ خاموش بیٹھا میری طرف تکتا رہا۔ وہ بول کر مجھے کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس وقت میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ سانپ بول بھی سکتا۔ میں نے اسے کہا۔

"کیا تم بات نہیں کر سکتے؟"

سانپ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے اپنے سوال پر خود ہی ہنسی آگئی۔ وہ بول کہاں سکتا تھا۔ ویسے اگر وہ میری اردو پنجابی زبان کو سمجھ لیتا تھا تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ کسی روز اردو یا پنجابی میں مجھ سے باتیں بھی کرنے لگے۔ میں نے سانپ سے کہا۔

"دوست! کیا تم دنیا کی ساری زبانیں جانتے ہو یا صرف اردو اور پنجابی ہی سمجھتے ہو۔ کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے میں تم سے زیادہ تر ان دو زبانوں میں ہی بات کرتا ہوں اور تم سمجھ بھی لیتے ہو۔"

سانپ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں میجر ارجن سنگھ کے گھر سے آ رہا ہوں۔

"میں نے سارا زیر زمین پراجیکٹ دیکھ لیا ہے اور میجر کی پتنی بھی تندرست ہوگئی ہے اب ہمیں کمانڈو ایکشن کی تیاریاں کرنی ہیں تم میرے پاس رہتے ہوئے

بور تو نہیں ہوگئے؟ میرا مطلب ہے تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے الگ ہو کر جنگلوں میں نکل جاؤ اور اپنی مرضی سے پہاڑوں' جنگلوں میں سیر کرتے پھرو؟"

میں بڑے غور سے سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس دفعہ سانپ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے بے اختیار ہو کر سانپ کے سر پر انگلی سے پیار کیا اور کہا۔

"دوست! تم واقعی بوے وفادار ساتھی ہو مجھے تمہاری دوستی پر بڑا ناز ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کبھی اپنے سے الگ نہیں کروں گا۔ خدا نے چاہا تو ہم دونوں ایک ساتھ جہاد کشمیر کے لیے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ زندہ رہے تو ایک ساتھ زندہ رہیں گے مرگئے تو خدا کرے کہ ایک ساتھ مریں مگر دشمن کو زبردست نقصان پہنچا کر مریں۔ یونہی مرجانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

سانپ کے منہ سے ہلکی سی پھنکار نکلی۔ میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک' تم یہی کہنا چاہتے ہو ناں؟"

سانپ نے ایک بار پھر ہلکی سی پھنکار کی آواز نکالی۔ وہ کچھ بے چین سا نظر آنے لگا تھا۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ مجھے ایک زبردست خطرے سے آگاہ کر رہا تھا اور میں بالکل نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے سانپ کے سر پر انگلی رکھی اور کہا۔

"اچھا دوست! میں کوٹھڑی میں چل کر بیٹھتا ہوں مجھے کمانڈو شیر باز کا انتظار ہے۔ شام تک وہ ضرور آ جائے گا۔"

آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی بارش ابھی شروع نہیں ہوئی تھی میں نے سانپ کے کھوہ کے آگے درخت کی ٹہنیوں کی آڑ سی بنا دی تھی تاکہ سرد ہوا سے تھوڑا بچاؤ ہو جائے۔ اٹھ کر گھاٹی کی معمولی سی ڈھلان اتر کر لکڑی کی جھونپڑی کے صحن میں آ گیا۔ صحن اسی طرح خالی پڑا تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی کا مجھے احساس ہوا۔ اسی خاموشی میں مجھے

خطرے کی بے معلوم سی بو محسوس ہوئی مگر میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ مجھے خیال کرنا چاہیے تھا لیکن مجھ سے بھول ہوگئی دشمن کے گھر میں بیٹھ کر آدمی کو ہر لمحے چوکس رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی غفلت اور بے خیالی اسے موت کے منہ میں لے جا سکتی ہے۔

لکڑی کی جھونپڑی نما کوٹھڑی کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ باہر سردی تھی۔ میں اندر جا کر بیٹھ گیا۔ دروازہ میں نے بند کر دیا تھا۔ سوچنے لگا کمانڈو شیر باز ابھی تک کیوں نہیں، آیا۔ اسے آ جانا چاہیے تھا کہیں کسی مشکل میں نہ پھنس گیا ہو۔ باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ اپنا بوڑھا کشمیری مجاہد ٹوکری میں سبز ترکاری لیے چلا آ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھول لیا۔

"شیر باز خان ابھی تک کیوں نہیں آیا؟"

میں نے کشمیری مجاہد سے پوچھا۔ اس نے کہا۔

"معلوم نہیں رات کہہ کر گیا تھا کہ صبح دس گیارہ بجے تک آ جاؤں گا۔ میں صمد بٹ کے ہاں جا کر پتہ کرتا ہوں کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔"

کشمیری مجاہد نے سبزی والا تھیلا کچن کی کوٹھڑی میں رکھا اور واپس چلا گیا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ شیر باز کو ساتھ ہی لے کر آئے کشمیری مجاہد کو گئے پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے۔ میں کوٹھڑی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ کوٹھڑی کی فضا میں سردی کا احساس بہت کم تھا۔ بوڑھے کشمیری کی کانگڑی وہاں پڑی تھی جس کی راکھ میں ابھی تک کچھ راکھ آلود انگاروں میں حرارت باقی تھی میں نے کانگڑی اپنے قریب کر لی تھی۔ صحن میں دوبارہ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں سوچنے لگا کہ کشمیری مجاہد اتنی جلدی کیسی واپس آ گیا ہے۔ صمد بٹ کا ٹھکانہ وہاں سے کم از کم تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ انسانی قدموں کی آواز دروازے کی طرف آ رہی تھی میں نے اندر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

"بابا! اتنی جلدی واپس آ گئے؟"

اس کے ساتھ دروازہ دھڑاک سے کھل گیا اور دو اونچے لمبے آدمی اندر گھس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ دونوں سویلین لباس میں تھے۔ ایک دروازے کے پاس ہی ریوالور کا رخ میری طرف کیے کھڑا ہوگیا۔ دوسرے نے ریوالور کی نالی میری گردن کے ساتھ لگائی اور کہا۔ "چپکے سے ہمارے ساتھ آ جاؤ۔"

میں ابھی تک جوگی سادھو کے بھیس میں ہی تھا۔ میں نے اشلوک وغیرہ بول کر ان پر رعب جمانے کی اور ان کے ضعیف عقیدے پر اثر ڈالنے کی کوشش کی مگر ان پر میرے اشلوکوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ دونوں ملٹری انٹیلی جینس کے آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا تھا یہ وہی آدمی تھا جو میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"بابا! ہم جوگی لوگ ہیں۔ ہمیں کیوں پریشان کرتے ہو۔"

اس آدمی نے مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"تم پاکھنڈی ہو، تم جوگی نہیں ہو۔ تم پاکستانی کمانڈو ہو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ اگر بھاگنے کی کوشش کی تو ہمارے ریوالوروں سے نکلی ہوئی گولیاں تمہیں یہیں ڈھیر کر دیں گی۔"

میں نے کہا۔ "بابا اگر تم یہی چاہتے ہو تو چلو ہم تمہارے ساتھ چلے چلتے ہیں لیکن یاد رکھو۔ تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے گا۔"

اب دوسرا آدمی سخت لہجے میں بولا۔

"بک بک بند کرو اور سیدھی طرح چلو۔"

میں نے کہا۔

"ایک جگہ میں نے اپنا منڈل رکھا ہے میں وہ لے آوں۔ بے شک تم لوگ میرے ساتھ چلو۔"

دوسرے آدمی نے دو تین سیکنڈ کے اندر اندر رسی سے میرے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے۔ اب میرے لیے بھاگنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت میری ساری توجہ اپنے دوست سانپ کی طرف تھی۔ وہ میری مدد کر سکتا تھا۔ میں کرمنڈل کے بہانے ان انٹیلی جینس والوں کو سانپ کی کھوہ کی طرف لے جانا چاہتا تھا۔ مگر انہوں نے مجھے اس کی اجازت نہ دی اور مجھے دھکیلتے ہوئے ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگے۔ ریوالور ان کے ہاتھوں میں تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اکیلے نہیں آئے۔ نیچے سڑک پر ان کی جیپ کھڑی ہوگی اور جیپ میں سیکرٹ سروس اور ملٹری انٹیلی جینس کے تین چار مسلح افراد ضرور ہوں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ فوجی جوان بھی ہوں۔ ایک طرح سے میں مصیبت میں پھنس چکا تھا۔

یہی وہ خطرہ تھا جس کی بو میں نے فضا کی خاموشی میں محسوس کی تھی اور یہی وہ اجنبی لوگ تھے جن کی بو میرے دوست سانپ نے محسوس کر لی تھی اور اس نے پھنکارتے ہوئے ایک طرف گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت میں سانپ سے دور تھا اور مزید دور ہوتا جا رہا تھا۔

پہاڑی کے نشیب سے اترنے کے بعد جب ہم برساتی نالے پر پہنچے تو مجھے سانپ کی ہلکی سی پھنکار سنائی دی۔ اس آواز کو انٹیلی جینس والوں نے بھی سنا مگر انہوں نے کوئی خیال نہ کیا اور مجھے کھینچتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ مگر میں نے اپنے دوست سانپ کی آواز کو پہچان لیا تھا۔

جیسے ہی ہم نالے پر جو لکڑی کا چھوٹا سا پل تھا وہاں پہنچے تو میرا دوست سانپ ایک جھاڑی میں سے نکلا اور میری طرف گردن اٹھا کر دیکھنے لگا۔ میرے سوا سانپ کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ملٹری انٹیلی جینس کی قید میں جانے کا مجھ پر خوف سوار تھا میں نے چلا کر کہا۔

"دوست میری مدد کرو۔"

دونوں آدمیوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "کیا بک بک کرتا ہے'

خاموش رہ کر چلتا چل"۔

میں نے سانپ کی طرف دیکھا۔ سانپ بالکل چپ چاپ ساکت ہو کر بیٹھا تھا۔ جیسے اس نے میری مدد کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ ہم سانپ سے آگے نکل گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دہشت ناک آواز فضا میں گونج اٹھی۔

اس کے بعد کے سنسنی خیز واقعات

اس داستان کی اگلی کتاب نمبر ۱۳ میں

ملاحظہ فرمائیں۔

Pakistanipoint
Waqar
Azeem
Hissam 9/26/10